Pdf by Roadsign
ذلیل
ایم۔الیاس

ایک اچھوتی کہانی

ایم۔ الیاس

مکتبہ القریش ۔ سرکلر روڈ، اُردو بازار، لاہور۲

کنول کے دیوانوں میں ایک دیوانہ میں بھی شامل تھا۔ میں اس پری چہرہ کنول کو دیکھے بغیر ہی اس پر دل و جان سے کچھ ایسا فدا ہو گیا تھا کہ گزرتے ہوئے ایک ایک دن کا لمحہ' اسے قریب سے دیکھنے ہی کے لیے ترس ترس کر رہ جاتا تھا' لیکن منزل تھی کہ قریب ہی نہیں آتی تھی۔ مجھے ایسی ہی بے چینی میں ابھی جانے کتنے اور دن کاٹنے تھے۔ میرے دل پر تو وہ لوگ ستم توڑتے تھے جنھوں نے کنول کو دور یا نزدیک سے ایک بار نہیں کئی بار دیکھا تھا۔ ان کی نظروں کی سیرابی پھر بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ ان میں جوان' ادھیڑ عمر اور بوڑھے بھی شامل تھے۔ وہ لوگ کنول کی تعریف میں مبالغے سے کام لیتے ہوں یا نہیں لیکن کسی بخل کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ جب وہ اپنے بس میں نہیں رہتے تو اس چندرما کے تصور میں ڈوب کر کھو سے جاتے۔ میرے دفتر میں روز بہ روز اس کے فن کا چرچا اس قدر عام سا ہونے لگا کہ میں اندر ہی اندر اسے دیکھنے کے لیے تڑپنے لگا تھا۔ آخر میں بھی ایک جوان شخص تھا۔ حسن کا پرستار' لڑکپن ہی سے حسن میری بہت بڑی کمزوری رہی ہے۔ میں ان تعریفوں کے پلوں پر چلنے سے باز کیسے رہ سکتا تھا۔ میں اس گھڑی کے ایک ایک دن گنتا جا رہا تھا۔ جب میں کنول کو دیکھ سکوں۔

کنول اسٹیج ڈراموں کی ایک نئی دریافت تھی۔ اس نے اپنے پہلے ہی ڈرامے میں ہیروئن کا کردار ادا کر کے نہ صرف تماشائیوں کا دل لوٹ لیا تھا بلکہ اسٹیج کی دنیا میں ایک کھلبلی سی مچا کر رکھ دی تھی۔ اس کی اداکاری میں گو پختگی نہیں تھی' لیکن اس کا حسن کامیابی کا زینہ بن گیا۔ اداکاری کا عیب اس کی لپیٹ میں ایسا آیا کہ تماشائی اسے دیکھنے' سننے اور ہر منظر میں اس کی موجودگی کے تمنائی رہتے تھے۔ وہ نوخیز حسن و جوانی کا ایک نادر مجموعہ تھی۔ بور سے بور ڈراما بھی کنول کے نام سے ہٹ ہو جاتا تھا۔ جس روز کنول کا کوئی

ڈراما اسٹیج ہوتا تو دوسرے اسٹیج ڈراموں کے ہالوں میں الو بولا کرتے تھے۔

میرا اذیت ناک انتظار ختم ہوا۔

ایک روزنامے میں کنول کے ایک نئے ڈرامے کا اشتہار شائع ہوا تھا۔ جب میں ٹکٹ خریدنے کی غرض سے پہنچا تو وہاں میں نے اس قدر بھیڑ بھاڑ دیکھی کہ ٹکٹ حاصل کرنے کے لیے اپنی طاقت اور بازوؤں کو آزمانے کی ضرورت تھی لیکن مجھے اس کی ضرورت نہیں تھی۔ میں جس محکمے سے تعلق رکھتا تھا' اس کے ذریعے مفت میں بھی ٹکٹ حاصل کر سکتا تھا۔ میں اپنی اسکوٹر پارک کر کے کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ میرے عقب میں آکر کسی نے میرے شانے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو فخرو بھائی کھڑے ہوئے مسکرا رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں انجانی مسکراہٹ' شرارت کے انداز میں ناچ رہی تھی۔

"آپ بھی کنول کے جمال میں پھنس گئے؟"

"جی ہاں!" میں نے بڑے فراخ دلی سے اعتراف کیا' فخرو بھائی سے کوئی بات چھپانا فضول ہی تھا۔ ان سے میرا کوئی راز کبھی پوشیدہ نہیں رہا۔ فخرو بھائی میرے لئے بڑے بڑے کارنامے انجام دے چکے تھے۔ مجھے اس سے پہلے جانے ان کا دھیان کیوں نہیں آیا' ورنہ مجھے کنول کو دیکھنے کیلئے اس قدر کرب ناک انتظار کرنا نہیں پڑتا' وہ ہر فن مولا تھے۔ "آج آپ کی مدد کی ضرورت آن پڑی ہے۔ کنول سے ایک بار ملا دو۔ اس کو دیکھا نہیں' لیکن اس کی تعریف بہت سنی ہے۔"

فخرو بھائی نے جواب دینے سے پہلے گردن گھما کر اپنے آس پاس کا جائزہ لیا۔ چند ایک لوگوں کو ذرا سا فاصلے پر کھڑے ہوئے پایا تو وہ میرا بازو پکڑ کے ایک تنہا گوشے میں لے آئے' اور کسی قدر سنجیدگی سے بولے۔ "کہو تو اسے تمہارے قدموں میں لا ڈالوں۔"

"سچ!" میں اپنی جگہ سے اچھل پڑا۔ "کیا ایسا ممکن ہے؟"

"جیب بھری ہو تو سب کچھ ممکن ہو جاتا ہے۔" فخرو بھائی کا سینہ غرور سے تن گیا۔ "کہو تو تمہاری شادی کرا دوں۔"

"فخرو بھائی!" میں مارے خوشی کے ان سے لپٹ گیا۔ "کیا وہ شادی کیلئے تیار ہو جائے گی؟"

"فرید بھائی! تم پیسے کی طاقت جانتے ہو اور پھر بھی ایسی بے تکی باتیں کرتے ہو۔" فخرو بھائی نے میرے اور قریب ہو کر کہا۔ "لیکن کنول سے جو شادی ہو گی وہ مشروط ہو گی۔"

"وہ کس لئے؟"

"ایسی لڑکیاں وقت اور پیسے سے فائدہ اٹھاتی ہیں۔"

میرا خوشی سے بلیوں اچھلتا ہوا دل بے اختیار سینے میں دھڑکنے لگا۔ "شرائط کیا ہو گی؟"

"میں کنول کی آنٹی ہی سے پوچھ کر بتا سکوں گا۔"

فخرو بھائی کی آنکھیں چمکنے لگیں۔" اگر آنٹی تیار ہو گئیں تو تم بڑے خوش نصیب کہلاؤ گے۔"

"وہ کیسے؟" میرا لہجہ خوشی سے مرتعش ہو رہا تھا۔

"کنول کی زندگی میں تم پہلے مرد ہو گے" فخرو بھائی زیر لب مسکرائے۔ "آنٹی! کنول کی شہرت اور اس کی مقبولیت سے بہت پریشان ہو گئی ہیں۔ رات دن اس کے گھر کی دہلیز پر قدم رکھتا ہوا ہر عمر کا آدمی کنول سے اپنی غرض پوری کرنے کے لئے بڑی سے بڑی قیمت ادا کرنے کو تیار نظر آتا ہے۔ آنٹی انہیں دھتکار اور سمجھا سمجھا کر تنگ آ گئی ہیں کہ کنول ایک شریف گھرانے کی پڑھی لکھی لڑکی ہے اداکاری کا شوق اسے اسٹیج کی دنیا میں لے آیا ہے۔ لیکن بوالہوس مردوں کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی ہے۔ آخرکار آنٹی نے تنگ آکر' ایک ہفتے پہلے مکان بدل لیا ہے۔ انہوں نے کل ہی یہ فیصلہ بھی کیا ہے کہ کوئی مناسب شخص مل گیا تو کنول سے اس کی شادی کر دیں گی لیکن یہ شادی مشروط طور پر ہو گی۔ میں نے ان سے ان کی شرطیں نہیں پوچھیں۔ اس لئے کہ میرے ذہن میں اس وقت کوئی بھی شخص موجود نہیں تھا۔ اب تمہیں دیکھتے ہی خیال آیا کہ تم کنول کے لئے موزوں ہو۔"

"کنول سے کب اور کس دن ملا رہے ہیں آپ؟" میں نے اپنی جیب سے سو روپے کا ایک کڑکڑاتا ہوا نوٹ نکال کر ان کی جانب بڑھا دیا۔

فخرو بھائی میرے ہاتھ میں سو روپے کا نوٹ دیکھ کر خوشی سے کھل اٹھے' میرے ہاتھ

سے نوٹ لے کر اپنی پتلون کی اندرونی جیب میں بڑی حفاظت سے رکھ لیا۔ وہ ہنسے اور اپنی ہنسی روکے بغیر بولے۔ "کنول سے ملنے کے لیے بے تاب دکھائی دے رہے ہو؟"

"آپ تو جانتے ہیں کہ میں ہمیشہ سے ایسی چیزوں کا قدر دان رہا ہوں۔" میں بھی بے اختیار ہنس دیا۔ "مجھ میں انتظار کی تاب نہیں رہتی ہے۔"

"میں تمہاری کمزوریوں سے خوب واقف ہوں فخرو بھائی کہنے لگے۔" کنول کو دیکھنے کیلئے تم کس لیے بے چین ہو میں خوب سمجھتا ہوں۔ اس میں تمہارا کوئی قصور بھی نہیں ہے۔ اس لئے کہ درحقیقت وہ چیز ہی ایسی ہے کہ راتوں کی نیند اڑا دے۔ تمہیں آج ہی اس وقت ملوا دوں گا جب ڈراما ختم ہو گا۔ میں تمہیں اپنے ساتھ ڈریسنگ روم میں لے جا کر کنول اور آنٹی سے بھی متعارف کرا دوں گا۔ ایک طرح سے یہ اچھا بھی ہو گا کہ ایک دوسرے سے مل لو' اس طرح میرا کام بھی سہل ہو جائے گا۔ کل جب میں کسی وقت آنٹی سے مل کر تمہارے رشتے کے بارے میں بات کروں گا تو انہیں فیصلہ کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔ کل شام تک تمہارے امتحان کا نتیجہ نکل آئے گا۔" فخرو بھائی نے بڑی بے تکلفی سے میرے شانے پر ایک ہلکی سی دھپ جمائی۔ "میں تمہاری کامیابی کی خوشی میں منہ مانگا انعام لوں گا۔"

"میں نے گزشتہ پانچ سال کے عرصے میں کبھی آپ کو شکایت کا موقع دیا ہے؟" میں نے شکایتی لہجے میں پوچھا۔

"نہیں میرے یار!" وہ بڑی فیاضی سے مسکرائے۔ "تم میرے ملنے والوں میں واحد شخص ہو جس کے لئے میں ہمیشہ نادر قسم کے تراشیدہ پتھروں کی تلاش میں سرگرداں رہا۔ اور تمہیں پیش کیا۔ کیا تمہیں میرے اس خلوص سے انکار ہے؟"

"بالکل نہیں!" میں نے اپنی گردن ہلا کر قرار کیا۔

"کنول ایک نایاب ہیرا ہے جسے میں نے دریافت کیا اور اسے اسٹیج کی دنیا پر متعارف کرایا۔" فخرو بھائی کا چہرہ جانے کس خیال کے زیر اثر دمک اٹھا۔ "اسی لئے ڈائریکٹر' پروڈیوسر اور آنٹی میری کوئی بات نہیں ٹالتے ہیں۔ تمہیں بھی خوش ہونا چاہئے کہ میں اس ہیرے کو تمہاری زندگی کے تاج کی زینت بنانا چاہتا ہوں۔"

"جب ہی میں نے آپ کے علاوہ کسی اور شخص کو کبھی منہ نہیں لگایا!" میں نے

جواب دیا۔

ہال میں سب سے آگے تیسری قطار میں' میں اور فخرو بھائی' ساتھ ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ فخرو بھائی کے باعث اگلی قطار میں مجھے جگہ مل گئی تھی' ورنہ آج کا ٹکٹ ملنا بھی ناممکن تھا۔ ہال تماشائیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا' بلکہ بہت سارے تماشائیوں نے کھڑے ہو کر ڈراما دیکھنا گوارا کر لیا تھا۔ عجیب طوفان بدتمیزی کا مظاہرہ ہو رہا تھا۔ یہ سارے کے سارے کنول پر لٹو تھے۔ وہ اپنی پیاسی آنکھوں کو کنول کے حسن کے سمندر سے سیراب کرنے آئے ہوئے تھے۔ انہی دیوانوں میں' ایک دیوانہ میں بھی تھا۔

مجھے اسی وقت کنول کی شہرت اور مقبولیت کا اس قدر شدید احساس ہوا تو میں دل ہی دل میں بڑا حیران ہو رہا تھا۔ کنول کو دیکھنے کی خواہش' ہر لمحہ اس قدرت شدت اختیار کرتی جا رہی تھی کہ ہر ساعت پر محشر کی گھڑی کا گمان ہو رہا تھا۔ میری بے چینی کی وجہ ان تماشائیوں سے یکسر مختلف تھی۔ فخرو بھائی نے کنول سے میری شادی کرا دینے کا وعدہ کیا کیا کہ میرے دل میں ایک آگ سی بھڑک اٹھی تھی۔ میں اس کنول کو دیکھنا چاہتا تھا جو جانے کتنے دلوں پر راج کرتی چلی آ رہی تھی۔ ایک ایسا دن جلد ہی آنے والا تھا۔ میں نے اس سے پہلے کبھی صبر و ضبط کا دامن نہیں تھاما تھا لیکن آج مجھے اپنے سینے پر یہ وزنی سل رکھنا پڑی تھی۔ تماشائی جو بے قابو ہو رہے تھے ان کے شور و غل سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ میں بار بار پیچھے کی جانب پلٹ کر دیکھ لیتا تھا۔ فخرو بھائی نے ہنستے ہوئے مجھے مخاطب کیا۔ "تم دیکھ لینا جیسے ہی پردہ اٹھے گا' سب کو سانپ سونگھ جائے گا۔ ایسے محسوس ہو گا کہ کوئی ہال میں بیٹھا ہی نہیں ہے۔"

فخرو بھائی نے جو کچھ کہا تھا وہ سچ ہی ثابت ہوا' جیسے ہی اسٹیج پر یہ اعلان ہوا کہ ڈراما شروع ہونے والا ہے' شور و غل نے دم توڑنا شروع کر دیا' لوگ دم بہ خود ہوئے جا رہے تھے۔ چاروں اطراف ایک گہرا سناٹا طاری ہونے لگا۔ ہر ایک کی نگاہ اسٹیج کی طرف اٹھی اور لگی ہوئی تھی' ڈراما شروع ہو گیا لیکن ابتدا میں شاید کنول کا کردار نہیں تھا۔ جب ہی وہ دکھائی نہیں دی' ہر کوئی بے تابانہ اس کا منتظر دکھائی دے رہا تھا۔

میرے سینے میں دل بے حس و حرکت دھڑکنا بھول گیا تھا۔ میں اپنے منتشر حواس کو باوجود کوشش کے اپنے قابو میں نہیں کر سکا۔ فخرو بھائی میری اضطراری کیفیت کو دیکھ دیکھ کر

لطف اندوز ہو رہے تھے۔ انہوں نے میرے کان کے پاس اپنا منہ لا کر سرگوشی کی۔ "فرید بھائی! تمہاری حالت بتا رہی ہے کہ تم کنول کو دیکھتے ہی بے ہوش ہو جاؤ گے۔"

دفعتاً" اسٹیج پر قوس و قزح بکھر گئی' کنول اسٹیج پر سبک خرامی سے چلتی ہوئی نمودار ہوئی تو سارا ہال تالیوں کے خراج سے گونج اٹھا' جو کنول کے حسن میں نذرانہ تھا' اس کے دیوانوں کا۔ وہ گنگناتی اور اپنا دل کش سراپا لپکائی ہوئی آئی تھی۔ جب وہ ہیرو سے مخاطب ہوئی تو ہال میں ایک گہرا سناٹا طاری ہو گیا۔ کہیں کہیں سے ایک بھن بھناہٹ ہو رہی تھی۔

میں نے اپنی ساکت نظروں سے اس نوخیز جوانی اور حسن کے رنگین گل دستے کو دیکھا تو دیکھتا رہا گیا۔ فخرو بھائی نے سچ ہی کہا تھا کہ وہ ایک نادر تراشیدہ پتھر کی مانند ہے' ایک بار میری نگاہ اس کے سراپا پر کیا پڑی کہ میں رعب حسن سے گنگ ہو گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے اطراف میں موجود لوگوں کے دل بھی دھڑکنا بھول چکے ہیں۔

ڈراما کیا تھا؟ اس کی کہانی کیا تھی؟ مجھے کچھ خبر نہیں رہی اور نہ ہی میں نے اس میں کوئی دلچسپی لی' میں ڈراما دیکھنے نہیں' صرف کنول کو دیکھنے آیا ہوا تھا۔ میں نے ہر لمحے اپنی نگاہیں اس بت طناز پر مرکوز کر رکھی تھیں' اپنی پلکیں تک نہیں جھپکائیں۔ اس کی آواز رگ و پے میں سرایت کر رہی تھیں۔ میں اسے اپنے دل کے تمام گوشوں میں بسا کر انجانے خوابوں میں ڈوب ڈوب کر ابھرنے لگا۔ میں نے اپنے دل کو ٹٹولا تو اسے پانے کے لئے اتنی دور نکل گیا تھا کہ واپسی ناممکن دکھائی دے رہی تھی۔

ڈرامے کے اختتام پر مجھے فخرو بھائی اپنے ساتھ لے کر بہ وقت تمام ڈریسنگ روم میں پہنچ پائے' عاشقان دید کے ہجوم کو پولیس کی مدد سے ہٹایا جا سکا۔ ڈریسنگ روم میں کنول آئی اور دیگر چند مردوں اور لڑکیوں کے نرغے میں گھری ہوئی' ان سے اپنی اداکاری کے مظاہرے کی داد وصول کر رہی تھی۔ جب فخرو بھائی نے آنٹی اور کنول سے میرا تعارف کرایا تو میں نے کنول کی اداکاری کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیئے۔ تعریف ہر ایک کی کمزوری ہے' لیکن عورتیں اور لڑکیاں تو اپنی تعریف سن کر ضرورت سے زیادہ خوش ہوتی ہیں۔ کنول نے نظر بھر کے میری طرف دزدیدہ نگاہوں سے دیکھا' میں نے محسوس کیا کہ وہ میرے منہ سے تعریفی کلمات سن کر اندر ہی اندر خوشی سے پھولے نہیں سما رہی ہے۔ اس

کا چہرہ دمکنے لگا تھا۔ وہ مجھ سے اپنی رسیلی آواز میں مخاطب ہوئی۔ "آپ کی تعریف اور حوصلہ افزائی کا بہت بہت شکریہ۔ لیکن ہمیں آپ کے محکمے اور اخبار والوں سے بہت ڈر لگتا ہے۔ آپ دونوں اداروں کی تلواریں ہمارے سروں پر ہر وقت لٹکتی رہتی ہیں' ہماری نیندیں اچاٹ ہو گئی ہیں۔"

چاروں اطراف سے قہقہے ابل پڑے۔ ان میں کنول کی مترنم ہنسی کی کھنک سب سے نمایاں تھی۔

میں اس شوخ و شنگ کے برجستہ حملے پر اپنی مسکراہٹ کو نہ روک سکا' میں اس کے روبہ رو کھڑا ہو کر اسے اس قدر قریب سے دیکھ رہا تھا کہ اپنی خوبی قسمت پر ناز ہونے لگا۔ میری خوش بختی میں اس وقت اور اضافہ ہو جاتا' جب کنول کے سمن زار میں قدم رکھنے والا پہلا شخص میں ہوتا' یہ خوش نصیبی جلد ہی میری ذات کا جزو بننے والی تھی۔ میں نے کبھی سنجیدگی سے شادی کے لئے نہیں سوچا تھا اور نہ ہی ایسا کوئی ارادہ تھا۔ کنول جو میرا آئیڈیل بن گئی تھی' اسے بھلا کیوں نہ میں اپنی زندگی کی زینت بناتا۔"

کنول سے ملاقات بڑی مختصر مگر پر کیف رہی' وہ بے حد تھکی ہوئی تھی اور رات کا ایک بج رہا تھا۔ وہ آنٹی اور اپنے دوسرے لوگوں کے ساتھ رخصت ہو گئی۔

○

میں اگلے دن سہ پہر سے اپنے اس فلیٹ میں فخرو بھائی کا انتظار کر رہا تھا جو گلشن اقبال کے ایک ویرانے میں بنی ہوئی عمارت کی پہلی منزل پر واقع تھا۔ اس فلیٹ کے بارے میں گھر والوں کو بھی علم نہیں تھا۔ میں اس فلیٹ میں اپنی نجی شوق اور خواہشات کو پورا کرتا تھا۔ اس عمارت میں چند ایک مکین رہتے تھے اور چوکیدار تھا۔ کوئی میری مصروفیات میں دخیل نہیں ہوتا تھا اور نہ ہی کسی کو ہوا لگتی تھی کیونکہ چوکیدار میرا ہمراز تھا۔ میں ہر ماہ اسے اتنی رقم دیتا چلا آ رہا تھا کہ اس کی زبان پر ایک ایسی مہر لگ گئی تھی جسے وہ کبھی توڑ نہیں سکتا تھا۔ میں نے کنول سے شادی کر کے اسے اسی فلیٹ میں رکھنے کا فیصلہ کیا ہوا تھا۔ جیسا کہ اس سے پیشتر میں نے دو شادیاں یکے بعد دیگرے کر کے اس فلیٹ میں اپنی بیویوں کو رکھا ہوا تھا لیکن ان عورتوں سے زیادہ عرصہ نباہ نہیں ہو سکا۔ میں چاہتا بھی نہیں تھا کہ

یکسانیت کا شکار رہوں' ان سے نجات پا کر میں خوش ہی رہا تھا۔ وہ بھی ایک طرح سے مجھ سے اکتا گئی تھیں۔

فخرو بھائی نے مجھ سے کہہ دیا تھا کہ میں شام کے وقت تیار رہوں' انہیں اپنی کامیابی کی ننانوے فیصد امید تھی' آج اتوار کی چھٹی کے باعث ڈراما بھی نہیں کھیلا جا رہا تھا۔ میں نے فخرو بھائی کا انتظار کرنے کی بجائے ایک دولہا کی طرح اپنی تیاری شروع کر دی۔ سب سے پہلے میں نے تین چار مرتبہ شیو کیا' نئے کپڑے پہنے' یہ ہشکوٹ سوٹ تھا جو بے حد قیمتی تھا۔ جب میں نے اسے پہن کر آئینے میں اپنے آپ کو دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا' مجھ پر جوانی ٹوٹ کر برس رہی تھی۔ اس میں ذرہ برابر مبالغہ نہیں تھا اور نہ ہی آئینہ جھوٹ بول رہا تھا کہ میں ایک وجیہہ جوان دکھائی دے رہا تھا۔ میں بلند قامت تھا۔ اس قامت کے باعث میری مردانہ وجاہت میں اور اضافہ ہو گیا۔ میرا مضبوط کسرتی بدن اور سرخ و سپید رنگ کسی بھی دوشیزہ کی نیندیں اڑانے کیلئے کافی تھا۔ میری جامہ زیبی کا ایسا نفیس ذوق میرے دفتر' دوستوں اور رشتے داروں میں بڑی شہرت اور مقبولیت رکھتا تھا۔ کنول جیسی لڑکیاں مجھے ایک نظر دیکھ کر برف کی مانند پگھل سکتی تھیں۔ مجھے اپنی خوبیوں کا پورا پورا اندازہ تھا۔ جب کبھی میں نے ان کا فائدہ اٹھانا چاہا' کوئی گھاٹا نہیں ہوا۔

فخرو بھائی دن ڈھلنے کے بعد آئے۔ جب انہوں نے مجھے سرتاپا دیکھا تو مسکراتے ہوئے بولے۔ "کنول نے ایک ہی دن میں تمہاری ذات کو اور نکھار کے رکھ دیا ہے۔ وہ غریب تمہیں دیکھے گی تو اس کی نیندیں حرام ہو کر رہ جائیں گی۔"

"آپ کیا خبر لائے میرے لئے؟" میں نے بے تابی سے پوچھا۔

"وہ راضی ہیں' سو فیصد تیار ہیں' لیکن ان کی چند ایک شرائط ہیں۔" فخرو بھائی نے جواب دیا۔

"وہ کیا؟"

"مہر پچیس ہزار روپے ہو گا!" فخرو بھائی ذہن پر زور دے کر سوچتے ہوئے جواب دینے لگے۔ "کنول' آنٹی کے ہاں رہے گی۔ اسے ہر ماہ جیب خرچ کے لئے تین ہزار روپے دینے ہوں گے جو اس کی شاپنگ کی رقم کے علاوہ ہو گی۔"

"مجھے منظور ہے۔" میں نے فخرو بھائی کی بات کاٹی۔ "ایک اور کڑی شرط ہے۔"

"کیا شرطوں کی قطار لگی ہوئی ہے؟" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"یہ آخری لیکن سب سے کڑی شرط ہے۔" فخرو بھائی کی بجھی ہوئی آواز محسوس کر کے مجھے اس شرط کی سنگینی کا احساس ہوا۔ شاید انہیں یہ خدشہ لاحق ہو گیا تھا کہ میں شادی سے انکار نہ کر دوں۔ "کنول تم سے جب چاہے طلاق لے سکتی ہے۔ تم اسے طلاق دینے میں کوئی چوں چرا نہیں کرو گے۔"

آخری شرط واقعی کسی حد تک ناقابل قبول تھی۔ آنٹی جیسی بدقماش عورتوں کی لڑکیوں سے شادی کرنے میں یہی قیامت تھی کہ وہ اپنی من مانی شرطیں پیش کرتی تھیں کیونکہ کنول جیسی لڑکیاں سونے کی چڑیاں ہوتی ہیں' ایسی عورتیں اپنی لڑکیوں سے ان کی جوانی کے ایام میں کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی کوشش میں بہت دور نکل جاتی ہیں۔ نکاح سے قبل مہر کی رقم ہتھیا لی جاتی تھی۔ اگر ان کی بیٹی کے ناز نخرے برداشت کرنے کی شوہر میں استطاعت نہ رہے یا وہ کسی بخل سے کام لے تو اس سے جبراً طلاق حاصل کر کے دھتکار دیا جاتے ہیں۔۔۔۔ ایسی ہی ایک شادی میں پہلے بھی زبردست ٹھوکر کھا چکا تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنی جان بچائی تھی۔ آنٹی بھی کنول کی شادی مجھ سے کر کے ناجائز فائدہ اٹھانا چاہتی تھی۔ یہ سوچتے ہی مجھے غصہ آ گیا اور میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہو گئی۔ میں نے تیز و تند لہجے میں فخرو بھائی سے کہا۔ "کیا میں کاٹھ کا الو نظر آتا ہوں۔"

"دل چھوٹا مت کرو فرید بھائی۔" فخرو بھائی نے خوشامدانہ لہجے میں مجھے تسلی دی۔" تم ان جیسے لوگوں کو مجھ سے کہیں زیادہ قریب سے دیکھ اور پرکھ چکے ہو' آنٹی نے اندھیرے میں تیر چلایا ہے۔ ہم نے بھی کوئی کچی گولیاں نہیں کھیلی ہیں' بس تم میرے ساتھ ابھی اور اسی وقت چلے چلو' تم دیکھنا میں کتنی آسانی سے تمہارے لئے پالا مارتا ہوں۔"

فخرو بھائی اور کہہ بھی کیا سکتے تھے' انہیں ایسا ہی کرنا چاہیے تھا۔ لہٰذا انہوں نے مجھے جھوٹی تسلی دلا دی۔ انہیں اپنی کمیشن سے غرض تھی جو دونوں طرف سے ملنے والا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ وہ اپنے کاروبار کو چمکانے کی غرض سے کسی نہ کسی صورت سے فریقین کے درمیان لچک دار شرطیں طے کرا دیں گے۔ جب میں فخرو بھائی کی بات سن کر کسی قدر ٹھنڈا ہوا اور اپنے جوتوں کے لیس باندھنے لگا تو فخرو بھائی نے اطمینان کا ایک گہرا سانس لیا۔ ان

کا سپاٹ چہرہ یکبارگی دکنے لگا۔ وہ کسی قدر چہکتے ہوئے بولے۔ "فرید بھائی تمہیں ایک بہت بڑی' اچھی اور پیاری پیاری خبر سناؤں؟"

میں نے زیرِ لب مسکرا کے پوچھا۔ "کیا یہ خبر بھی کسی شرط پر مشتمل ہے؟"

انہوں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "یہ خبر شرطیہ ہے۔ یعنی۔۔۔ یعنی۔۔۔ وہ کنول ہے نا؟ وہ تم پر پوری طرح فدا ہو چکی ہے۔"

"ایسی لڑکیاں صرف جیب پر مر سکتی ہیں اور مرتی رہتی ہیں۔" میں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ آخر آج آپ مجھے' بے وقوف بنانے پر کیوں تلے ہوئے ہیں؟"

"ایمان سے سچ کہہ رہا ہوں۔" فخرو بھائی نے فخر سے سینہ تان لیا۔ "جب میں نے اس کی موجودگی میں آنٹی کو تمہاری شادی کا پیغام دیا تو وہ پھول کی طرح کھل اٹھی۔ جانتے ہو اس نے کیا کہا؟"

"ہاں!" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "کنول نے یہ کہا ہو گا کہ آپ نے میرے لئے ایک ایسے گدھے کا انتخاب کیا ہے کہ میں زندگی بھر عیش کرتی رہوں گی۔"

"فرید بھائی۔" فخرو بھائی نے احتجاج کے انداز میں کہا اور برا سا منہ بنایا۔ "تم آج دل جلی باتیں کیوں کر رہے ہو۔ تم چل کر دیکھ لینا کہ کنول تمہارے انتظار میں کس قدر بے قرار ہو رہی ہو گی۔"

"کنول نے کیا کہا تھا آپ سے۔" میں نے انہیں چھیڑا۔ "آپ کو میری قسم' آپ جس وقت تک نہیں بتائیں گے اس وقت تک آپ کے ساتھ نہیں چلوں گا۔"

"فخرو بھائی مجھ سے نظریں ملا کر بولے۔ "اس نے کہا تھا یہ آپ کا میری زندگی پر بڑا احسان ہے۔"

زیب النساء اسٹریٹ کی ایک دکان سے میں نے کنول کے لئے ایک گہرے اودے رنگ کی بے حد قیمتی بنارسی ساڑھی خریدی تاکہ وہ دربار حسن میں پہلی ہی بار تہی دامن نہ جاؤں۔ ساڑھی سے زیادہ رنگ فخرو بھائی کو پسند آیا۔ وہ ترنگ میں آ کر بولے۔ اس اودے رنگ میں کنول کا گورا گورا رنگ اور نکھر جائے گا۔"

جب ہم دونوں آنٹی کے ہاں پہنچے تو ان کی انتظار گاہ میں تین چار مرد بیٹھے ہوئے نظر آئے۔ ان میں ایک شخص جو پھولے ہوئے جسم اور پست قامت کا تھا' اس شہر کے بڑے

جوہریوں میں شمار ہوتا تھا۔ بہت بڑا اسمگلر تھا۔ اس نے اپنی چندھی چندھی آنکھوں سے دیکھا تو ان میں حقارت بھری ہوئی تھی۔ دوسرے مرد جوان لڑکے تھے' کسی بڑے گھرانے کے بگڑے ہوئے شہزادے' آنٹی نے ان سب کو جانے کب سے انتظار گاہ میں بیٹھا رکھا تھا۔ مجھے اس کمرے کے بارے میں فخرو بھائی نے بتایا کہ جب کسی کو ٹہلا دینا ہوتا ہے تو آنٹی اسے اس انتظار گاہ میں گھنٹوں بٹھا کر ٹرخا دیتی ہیں۔

فخرو بھائی نے مجھے ایک دوسرے کمرے میں لے جا کر بٹھایا جو کسی قدر آراستہ پیراستہ تھا۔ وہ میرا تحفہ لے کر اندر چلے گئے تاکہ کنول اسے پہن کر میرے سامنے آئے۔ چند لمحوں بعد وہ واپس لوٹے تو ان کے ہمراہ آنٹی تھیں۔ مجھے دیکھ کر وہ خوشی سے اس طرح پھول گئیں جیسے میں واقعی اس گھر کا داماد ہوں۔ بڑے اخلاق اور تپاک سے ملیں رسمی باتوں کا سلسلہ چل نکلا۔

آنٹی خود ہی اصل موضوع کی جانب آئیں' پہلے تو انہوں نے اپنی ایک لمبی چوڑی تقریر میں اپنی خاندانی شرافت' وضع داری اور نیک نامی کا ڈھنڈورا پیٹا' جب کنول کا ذکر آیا تو وہ کہنے لگیں۔ "کنول میری ایک ہی بیٹی ہے' میں نے اسے بڑے نازو نعم میں پالا ہے۔ اسے اداکاری اور فنون لطیفہ کا شوق ضرورت سے زیادہ ہی ہے۔ اداکاری کے اس شوق کے باعث اس نے انٹر آرٹس سے زیادہ تعلیم حاصل نہیں کی ہے۔ اسے اپنے گھر کی آرائش کا بھی بہت شوق ہے۔ چائنیز کھانے تو اتنے اچھے پکاتی ہے کہ لوگ انگلیاں چاٹتے رہ جاتے ہیں۔ اس نے یہ کورس انتھک محنت سے پاس کیا ہے۔ آج آپ اس کے ہاتھ کے پکے ہوئے کھانے کھا کر دیکھیں گے تو اس کی صلاحیتوں کا پورا پورا اندازہ ہو جائے گا۔"

"فرید صاحب کو آپ کی آخری شرط پر کچھ اعتراض ہے۔" فخرو بھائی نے فوراً دخل دے کر آنٹی کی آنکھوں میں جھانکا۔

"کیا اعتراض ہے؟" آنٹی نے خوش گوار لہجے میں پوچھا۔

"فرید صاحب کا کہنا ہے کہ آپ کی ایک شرط بہت کڑی ہے۔" فخرو بھائی میری وکالت کرنے لگے۔ "وہ چاہتے ہیں کہ اس شرط کو کچھ نرم کیا جائے' وہ اس شرط کو سنتے ہی آنے کیلئے تیار نہیں تھے' میں انہیں سمجھا بجھا کر لایا ہوں کہ ہماری آنٹی ایسی سنگ دل نہیں ہیں کہ آپ کے ارمانوں کا خون ہی کر دیں' وہ بڑے نرم مزاج کی ہیں۔ کیوں آنٹی؟ میں

نے فرید صاحب سے آپ کے بارے میں جو کچھ کہا ہے وہ سچ ہے نا؟" فخرو بھائی نے انہیں مکھن لگانے کے بعد مجھے فاتحانہ نظروں سے دیکھا۔

"ارے بیٹا! تم ان شرطوں پر نہ جاؤ!" وہ میری جانب سرک کر اپنائیت سے بولیں۔ "میاں بیوی راضی تو۔۔۔ کیا کرے گی آنٹی۔ اور ہاں۔"

آنٹی کا آخری فقرہ نامکمل رہ گیا کیوں کہ دفعتاً" کمرے کی دہلیز کا پردہ ہلا اور کنول میری لائی ہوئی ساڑھی پہن کر کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ دہلیز کے پاس رکی اور سر جھکا کر بڑی دل نواز ادا کے ساتھ مجھے سلام کیا' اپنی گھنیری پلکیں' حسن کے جلوے بکھیرتی' لجاتی' شرماتی اور لہراتی ہوئی میرے سامنے والی کرسی پر میری نظروں کے نشانے پر بیٹھ گئی۔ میری نگاہ اسی پر جم کر رہ گئی۔ فخرو بھائی نے سچ ہی کہا تھا' ساڑھی کے گہرے اودھے رنگ میں اس کا گورا گورا رنگ نکھر کے بڑی آب و تاب دکھا رہا تھا۔ میں اس کے حسین سراپے کو دیکھ کر دل میں سوچ رہا تھا کہ آنٹی کی کوئی شرط کڑی نہیں ہے۔

جب میں رات گئے کنول کے طلسم خانہ اسیری سے رہائی پا کر نکلا تو ایسا محسوس ہوا کہ میں نے اپنی ذات پر کبھی ایسا سفاکانہ ظلم نہیں کیا تھا۔ میرا دل' میرے بس میں نہیں رہا تھا۔ مجھے کسی پل قرار نہیں تھا۔ میں نے دل پر صبر و ضبط کی ایک بہت بڑی وزنی سل' کس قدر بے رحمی سے رکھ دی۔ کنول بھی نہیں چاہتی تھی کہ جدائی کی گھڑی اس پر بھاری ہو کر رہ جائے لیکن میں کسی وجہ سے مجبور تھا' ورنہ میں دستر خوان سے کیوں اٹھتا۔

میں آج کی طرح شاید ہی اپنی زندگی میں کبھی ایسے بے پایاں مسرتوں سے ہم کنار ہوا تھا۔ میری رگ رگ سے جو خوشی پھوٹ رہی تھی' وہ بڑی سے بڑی دولت پانے سے بھی ممکن نہ ہوئی۔ اس کے اظہار کے لئے الفاظ کا سہارا نہیں لیا جا سکتا تھا۔ یہ صرف وہی شخص محسوس کر سکتا ہے جس کے دل میں ایک انجانہ جذبہ پیدا ہو جائے۔ میں حیران ہوا تھا اور ہو رہا تھا کہ کنول اس آسانی سے میری جھولی میں کیسے آگئی۔ اس بڑے شہر میں میری کیا حیثیت ہے؟ اس کا ایک سے ایک شیدائی ایسا ہے کہ وہ کنول کی بڑی سے بڑی قیمت ادا کر سکتا ہے۔ میں ان کا عشر عشیر بھی نہیں ہوں مجھے اب کسی فکر' تردد اور پریشانی کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ کنول کے دروازے میرے لئے کھل چکے تھے۔ راہ میں جو رکاوٹیں تھیں' وہ بڑی خوش اسلوبی سے دور ہو چکی تھیں۔

یہ طے کیا گیا کہ میں تین دن کے بعد پچیس ہزار روپے کی رقم لاکر آنٹی کے ہاتھ میں رکھ دوں تو کنول سے میرا نکاح پڑھا دیا جائے گا۔ میں جلد سے جلد دفتر سے چھٹی لے کر ہنی مون منانے مری چلا جاؤں گا۔ آنٹی نے ایک ہفتے کی مہلت مانگتے ہوئے کہا تھا۔ "کنول نے نئے ڈرامے کے کنٹریکٹ پر دستخط کر رکھے ہیں' وہ ان کی شرائط پوری کرنے کیلئے مجبور ہے۔" میں نے اجازت دے دی اور آئندہ ڈراموں میں کنول کے کام کرنے پر مجھے کوئی اعتراض بھی نہیں تھا۔

کنول کے ہاں ساری رات گزارنے میں میرے لئے سب سے بڑی مجبوری یہ حائل تھی کہ میں اپنے گھر میں یہ اطلاع نہیں دے سکا تھا کہ رات کو نہیں لوٹوں گا۔ اگر میں رات کے ایک دو بجے تک گھر نہیں پہنچتا تو گھر والے میری تلاش میں نکل پڑتے' ہسپتال کے وارڈ اور مردہ خانوں میں جا کر لاشیں دیکھتے' تھانوں کے چکر لگا کر تھک جاتے۔ کیوں کہ میرے پاس اسکوٹر تھا اور میں اسکوٹر خطرناک حد تک تیز چلانے کا عادی تھا۔ گھر والوں کی پریشانی کا اصل سبب یہ تھا کہ میں اپنے کنبے کی کفالت بھی کر رہا تھا۔ میری ماں' دو جوان بہنیں اور اکلوتا بھائی' اس وقت تک میری آمد کا بے چینی سے انتظار کرتے رہتے جب تک میں گھر نہیں پہنچ جاتا۔ میرا بھائی اور بہنیں سو جائیں تو ماں میرے انتظار میں جاگ رہی ہوتی۔ اس لیے میرا گھر پہنچنا بے حد ضروری تھا۔

جب میں اپنی اسکوٹر پر گھر کی جانب تیزی سے رواں دواں ہوا تو میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں فضاؤں میں اڑتا' لہراتا اور رقص کرتا ہوا گھر پہنچ جاؤں' اگر کوئی اسکوٹر ہیلی کاپٹر کی طرح ایجاد ہو گئی ہوتی جو فضا میں اڑتی اور تیرتی ہوئی چلی جا سکتی تو میں اسے آج ہی کے دن کیلئے خرید لیتا' سائنس دانوں کو شاید ابھی مجھ جیسے دیوانوں کی ضرورتوں کا خیال نہیں آیا تھا ورنہ اب تک ایسی اسکوٹر وجود میں آ جاتی۔ میں اپنے ہوش میں نہیں رہا تھا۔ اسکوٹر کی رفتار اپنے عروج پر تھی۔

کنول میرے تصور میں تھی۔ مسکراتی' ہنستی' بولتی اور لجاتی ہوئی' میں اس کے علاوہ کچھ اور سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ مجھ پر بس ایک ہی دھن سوار تھی اور میں چلا جا رہا تھا لیکن ایک بڑے چوراہے پر میری اسکوٹر کا ایک تیز رفتار کار سے سنگین نوعیت کا حادثہ ہوتے ہوتے رہ گیا۔ میں موت کے منہ میں جانے سے بال بال بچ گیا تھا۔ گویا مجھے نئی

زندگی ملی تھی۔ میری عقل ٹھکانے آگئی لہٰذا میں نے چونک کر اور کسی قدر محتاط ہو کے رفتار کو اپنے قابو میں کر کے کار والے کی شان میں ایک چھوٹا سا قصیدہ پڑھ دیا۔ اگر میرے وجود پر کنول کے حسن کا نشہ چھایا ہوا نہ ہوتا تو میں کار والے کا تعاقب کر کے اسے ہر صورت میں جالیتا۔ میں کئی کار والوں کو سبق دے چکا تھا۔ شاید قدرت نے مجھے انہی لوگوں کو سدھارنے کے لئے مضبوط جسم کا مالک بنایا تھا۔ میں کسی قدر محتاط ہو کر سڑک پر سے گزرنے لگا۔

مجھے کنول کو پانے کے لئے تین راتیں ہجر جھیلنا تھا۔ جو میرے لئے کسی عذاب سے کم نہیں تھا۔ دن تو جیسے تیسے گزر جاتا لیکن یہ راتیں اور اس کے گزرتے ہوئے لمحات رک جاتے ہیں۔ تنہائی اور خاموشی اکساتی' بھڑکاتی اور بے چین کئے رکھتی ہے۔ کنول نے جیسے بھس میں چنگاری ڈال دی تھی' ایکا ایکی ایک آگ سی بھڑک اٹھی تھی اور میں شعلوں میں گھر چکا تھا۔ فخرو بھائی نے مجھ سے رازدارانہ طور پر کہا تھا۔ "تم چوتھے دن کنول کے ہاں دولہا بن کر پہنچو گے۔ اتنی بے تابی اچھی نہیں ہو گی کہ دوسرے دن ہی پھر آدھمکو۔ یوں وہ بھی ان تین راتوں میں ڈرامے کے باعث مصروف اور بے حد تھکی ہوئی ہو گی۔ شاید وہ تم پر پوری طرح توجہ نہ دے سکے اور تم تشنگی محسوس کرو۔"

فخرو بھائی اگر مجھے تاکید نہیں کرتے تو میں دوسری رات گزارنے بھی کنول کے ہاں پہنچ جاتا۔ ایک رات میں نے اپنے آپ کو نائلہ کے ہاں مصروف رکھا' وہ کنول کے آگے اس قدر ہیچ نظر آئی کہ میں جلد ہی گھر لوٹ گیا' بستر پر لیٹ کر کنول کے تصور میں کھو جانا کہیں زیادہ بہتر تھا۔

دوسرے دن میں خود پر قابو نہیں پا سکا۔ کنول کے دیدار سے اپنی آنکھوں کی پیاس بجھانے کے لیے میں تھیٹر پہنچ گیا۔ میرے ذہن میں جی بہلانے کی یہی عارضی صورت تھی۔

میں دانستہ تماشائیوں کے بیچوں بیچ اور اسٹیج سے کسی قدر دور ہٹ کر بیٹھ گیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ کنول کی نگاہ تماشائیوں کی جانب اٹھے تو مجھ پر پڑے' میں کسی وجہ سے اس پر اپنی موجودگی ظاہر ہونے دینا نہیں چاہتا تھا۔ میں اس جگہ بیٹھ کر بڑے اطمینان سے اور خوب جی بھر کے اپنی تمناؤں کی دنیا میں ڈوب سکتا تھا۔ ڈراما شروع ہونے میں کچھ دیر باقی تھی۔ میں اپنی نشست پر جم کر ہال میں بیٹھے اور سرگوشیاں کرتے ہوئے تماشائیوں کا جائزہ

لینے لگا۔ میری نگاہ میرے سامنے والی قطار میں اور بالکل روبہ رو بیٹھے ہوئے ایک شخص پر پڑی۔ اس کی پشت میری جانب تھی۔ جب اس نے اپنا رخ بیرونی دروازے کی جانب کیا تو میں اپنی جگہ سے اچھل پڑا۔ میرے منہ سے بے ساختہ اس کا نام نکلتے نکلتے رہ گیا تھا۔

"بیگ!"

میں اس شخص کو ہی نہیں اس کی رگ رگ سے بھی واقف تھا۔ برسوں پہلے اس سے ایک بار میرا واسطہ پڑ چکا تھا۔ وہ مجھے بھول گیا ہو گا۔ اس لیے کہ جب اس سے میری نظریں چار ہوئیں تو اس کے چہرے پر کوئی ردعمل نہیں تھا۔ اگر میں اس کے ذہن کے کسی گوشے میں ہوتا تو وہ یقیناً چونک اٹھتا۔ میں چاہتا بھی نہیں تھا کہ وہ مجھے پہچان لے اور ہم دونوں میں رسمی سلام علیک ہو' وہ ایک نمبری چھٹا ہوا بدمعاش تھا۔ اس کی سفاکی اور درندگی کی کہانیاں میں نے سن رکھی تھیں۔ جانے کیوں اس کی موجودگی سے مجھ پر ایک انجانا سا خوف طاری ہونے لگا۔ میرے ذہن میں بہت سے اندیشے سرسرانے لگے۔ میں نے سوچا کہ ایک ایسا شخص جسے شراب' عورت اور روپے کے علاوہ دنیا میں کسی اور چیز سے دلچسپی ہی نہیں ہے' وہ ڈراما کس لیے دیکھنے آگیا؟ شاید وہ لوگوں کی جیبیں کاٹنے یا ان میں سے کسی کو سنسان سڑک پر روک کر لوٹ لے' آج بھی وہ غنڈہ ٹیکس وصول کیا کرتا تھا۔ معاً" مجھے خیال آیا کہ عورت اس کی بہت بڑی کمزوری ہے لہٰذا وہ بھی کنول کے عاشقوں میں شامل ہو گیا ہے لیکن اس کی حالت بڑی پراسرار اور مشتبہ سی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ بڑی بے چینی سے بار بار بیرونی دروازے کی جانب دیکھتا تھا۔ جیسے اسے اپنے کسی ساتھی کا بے تابی سے انتظار ہو۔ اس کے برابر والی خالی کرسی میرے اندازے کی نشاندہی کر رہی تھی۔ میری ساری توجہ اس پر مرکوز ہو کر رہ گئی' میری چھٹی حس نے مجھے پوری طرح ہوشیار اور چوکنا کر دیا تھا۔ میں نے کسی بھی گڑبڑ کے لیے اپنے آپ کو آمادہ کر لیا تھا۔ وہ یقیناً اپنے اس ساتھی کا انتظار کر رہا تھا جو اس پروگرام کی ایک کڑی ہو گا۔

بیرونی دروازے سے ایک چہرہ نمودار ہوا۔ وہ سب سے یک سر مختلف اور اپنے چہرے پر دنیا بھر کی خباثت لیے ہوئے تھا۔ اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی میرے اندر نفرت ابلنے لگی۔ "دلاور!" میں زیر لب بڑبڑایا۔

دلاور۔۔۔ کالے ناگ کے پرانے اور بے حد قریبی ساتھیوں میں سے ایک تھا۔ جب

وہ بیگ کے برابر والی خالی کرسی پر آ کر بیٹھا تو میرا ماتھا ٹھنکا۔ میری رگوں میں خون کی گردش بڑھتی گئی' ان بدمعاشوں کی جوڑی ضرور رنگ میں بھنگ ڈالنے کے لیے یہاں موجود تھی۔ ان سے کچھ بھی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ وہ کسی سے کسی بات پر اگر الجھے تو اپنی بدمعاشی کا سفاکانہ مظاہرہ کریں گے۔

وہ دونوں مل کر کیا ہنگامہ کریں گے' میری سمجھ سے بالا تھا۔ میں اپنی جگہ سے اٹھنے کی سوچ ہی رہا تھا کہ ہال کی بتیاں ایک ایک کر کے بجھتی چلی گئیں اور اسٹیج پر سے پردہ اوپر اٹھنے لگا۔ تماشائیوں کی توجہ اور نگاہیں اسٹیج کی جانب مرکوز ہو گئی تھیں۔ لیکن میری نگاہیں دونوں بدمعاشوں کو اپنی گرفت میں لیے ہوئے تھیں۔ دلاور نے فوراً ہی اپنے کپڑوں میں سے ایک بوتل نکال کر بیگ کی طرف بڑھا دی جسے بیگ نے جلدی سے اپنے ہاتھ میں لے کر اپنی شلوار کے نیفے میں اڑس لیا۔ وہ دونوں آپس میں سرگوشی کرنے کے لیے ایک دوسرے کے قریب ہوئے تو میں نے اپنی اسکوٹر کی چابی فوراً ہی فرش پر گرا دی۔ اسے اٹھانے کے بہانے جھکا۔ بیگ دلاور کے کان میں کچھ کہہ رہا تھا۔ میں صرف یہ جملہ سن سکا۔ "کل سے کوئی کنول کو اسٹیج پر نہیں دیکھ سکے گا۔" بیگ نے اپنی بات ختم کر کے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا اور دلاور سے پوچھا۔ "بوتل بھری ہوئی ہے۔"

دلاور نے اثبات میں اپنا سر ہلا دیا۔ "دی اینڈ پر۔۔۔ تم اپنا دی اینڈ دکھانا؟" دلاور کے لبوں پر معنی خیز مسکراہٹ ابھری تو' بیگ نے اس کی ران پر ایک دھپ جمائی۔

میں چشم زدن میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔ میرے ذہن میں ایک کھلبلی سی مچ گئی۔ میں نے ہراساں ہو کر ان کا جملہ اپنے دل میں دہرایا۔ "کل سے کوئی کنول کو اسٹیج پر نہیں دیکھ سکے گا۔" آخر اس کا مطلب کیا ہے؟ دلاور نے کیا شراب کی بوتل اس کے حوالے کی ہے؟ میرے ذہن میں بجلی کی طرح اچانک یہ خیال آیا۔ "کہیں اس بوتل میں تیزاب تو نہیں ہے؟"

تیزاب کا خیال آتے ہی میرے دماغ میں ان دونوں کا منصوبہ آ گیا۔ وہ کسی فریق کے اشارے پر کنول کے حسین چہرے اور اس کے دہکتے بدن پر تیزاب پھینکنے آئے ہوئے تھے۔ یہ تیزاب شاید اس وقت کنول پر پھینکا جائے گا جب ڈرامے کے اختتام پر وہ اپنے ساتھی فن کاروں کے ساتھ اسٹیج پر آئے گی' یہ ساری بدمعاشی اور سازش محض اس لیے کی

جانے والی تھی کہ کنول نے دوسرے تھیٹر والوں اور ہیروئنوں کا کاروبار چوپٹ کر کے رکھ دیا تھا۔ وہ لوگ کنول کو اپنے راستے سے ہٹانا چاہتے تھے تاکہ ان کے لیے راہیں کھل جائیں' غالباً اسی لیے' ان دونوں بدمعاشوں کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔

میرے اندر لہو ابلنے لگا۔ "نہیں' نہیں۔۔۔۔" میں ہیجان انگیز انداز میں بڑبڑایا۔ "میں کبھی ایسا ہونے نہیں دوں گا۔" میں نے اپنی دونوں مٹھیاں بھینچ لیں۔ میں سوچتا رہا۔ میرے دل و دماغ بے قابو ہونے لگے تھے۔ اگر بیگ نے وہ بوتل یوں چھپائی ہوئی نہیں ہوتی تو میں اس کے ہاتھ سے بوتل چھین کر اس کے سر پر انڈیل دیتا۔

اتنے میں کنول اسٹیج پر اپنی حشر سامانیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوئی' ہال کی فضا گرم ہو گئی۔ بیگ نے دلاور کو اپنی کہنی سے ٹھوکا دیا۔ "یار اس کبوتری کو دیکھنا نیچے سے اوپر تک کیسی لال ہو رہی ہے؟"

"بڑی بدنصیب ہے بے چاری!"

دلاور نے معنی خیز لہجے میں کہا اور وہ دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

مجھے اپنی کرسی پر بیٹھنا محال ہو رہا تھا۔ میں جیسے انگاروں پر بیٹھا ہوا تھا۔ میں ان سوروں کی آرزو پوری ہونے دینا نہیں چاہتا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ ان دونوں بدمعاشوں کی سازش سے کس طرح کنول یا آنٹی کو خبر کروں' اگر میں انٹرویل میں جا کر کنول کو اس دہشت ناک منصوبے سے باخبر کرتا ہوں تو اس بات کا خوف تھا کہ وہ اس منصوبے کی بو پاتے ہی بوکھلا کر رہ جائے گی اور اگر ایسا ہوا تو وہ اداکاری بھول جائے گی اور پھر ہال کی کسی کرسی' لائٹ اور اسٹیج کی خبر نہیں ہو گی۔ ایک ہنگامہ برپا ہو جائے گا۔

میں ایک خیال کے زیر اثر اٹھا۔ اکثر تماشائیوں نے مجھے تعجب سے دیکھا اور چند ایک نے پھبتی بھی کسی' اس وقت کنول ہوش ربا انداز میں رقص کر رہی تھی۔ بدن کا حسن اجاگر ہوا جا رہا تھا۔ یہ توقع تو نہیں تھی کہ رقص نظر انداز کر دیا جائے لیکن مجھے اس رقص سے کہیں زیادہ اس کے حسین چہرے اور جسم کی فکر تھی جسے داغ دار اور مسخ کرنے کے لیے وہ کتے تاک میں بیٹھے ہوئے تھے۔

میں اپنی ذات اور شخصیت کو آنٹی یا کنول کے علم میں لانا نہیں چاہتا تھا۔ ایک خوف یہ بھی دل میں دامن گیر ہو گیا کہ میرے سامنے آنے سے یہ دونوں بدمعاش میری سلامتی

کے درپے نہ ہو جائیں۔ میں نے ایک قریبی پبلک ٹیلی فون بوتھ سے آنٹی کو ٹیلی فون کر کے انہیں پیش آنے والے خطرے سے آگاہ کیا۔

جب میں واپس ہال کی طرف لوٹا تو باہر ہی کھڑے ہو کر انٹرویل ہونے کا انتظار کیا۔ انٹرویل کے وقت میں ہال میں داخل ہو کر اپنی نشست پر جا بیٹھا۔ ان دونوں کمینوں کی کرسیاں خالی پڑی ہوئی تھیں۔ وہ دونوں شاید چائے پینے یا اپنے منصوبے کا جائزہ لینے گئے ہوئے تھے۔

کھیل دوبارہ شروع ہونے سے پہلے' وہ دونوں اپنی جگہوں پر آ کر بیٹھ گئے۔ میں نے اپنے ٹیلی فون کی اطلاع کا ردعمل دیکھا۔ ڈراما شروع ہونے سے چند لمحے قبل چار بدمعاش قسم کے آدمی اسٹیج کے دونوں طرف کسی قدر ہٹ کر چوکنے انداز میں ڈرامے کے اختتام تک کھڑے رہے' جب ڈراما ختم ہوا تو وہ دونوں اپنی اپنی جگہ سے نکل کر درمیانی راہ داری پر آ گئے جو اسٹیج کی جانب جاتی تھی۔ ابھی فن کار اسٹیج پر تماشائیوں کو سلام کرنے حاضر نہیں ہوئے تھے۔

میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ ہزاروں تماشائیوں کے سامنے ایک نیا ڈراما کھیلا جانے والا تھا۔ میں دل ہی دل میں دعا کر رہا تھا کہ کنول اسٹیج پر آنے کی حماقت نہ کرے' ان دونوں چھٹے ہوئے بدمعاشوں کے مقابلے میں' ان چار آدمیوں کی پہرہ داری ناکافی تھی۔ دفعتاً" اسٹیج سے پردہ اٹھنا شروع ہوا۔ ایکا ایکی بیگ اور دلاور نے اسٹیج کی جانب دوڑ لگائی' بھاگتے بھاگتے دونوں آپس میں ٹکرائے' وہ اپنا توازن قائم نہیں رکھ سکے اور فرش پر گرے' اسٹیج کی جانب ڈھلان تھی۔ وہ دونوں اسٹیج کی جانب لڑھکتے چلے گئے۔ اسی وقت اسٹیج سے اعلان ہونے لگا۔

"خواتین و حضرات' ہم مس کنول کی جانب سے معذرت خواہ ہیں کہ وہ اچانک ناسازی طبیعت کے باعث گھر چلی گئی ہیں اور۔" میں نے دیکھا واقعی اسٹیج پر کنول نہیں تھی۔ اسی لمحے فضا میں ان دونوں بدمعاشوں کی دل خراش چیخیں گونجنے لگیں۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا کہ تیزاب کی بوتل یکایک کھل گئی اور وہ دونوں جانے کس طرح اس تیزاب کی زد میں آ گئے یا تو آنٹی کے بدمعاش ساتھیوں نے تیزاب کی بوتل لڑھکتی ہوئی پا کر اسے اٹھا لیا اور ان دونوں بدمعاشوں پر عرق گلاب کی طرح چھڑک دیا تھا۔ جتنے منہ اتنی ہی باتیں

تھیں، وہ خود اپنے ہی جال میں پھنس گئے تھے۔

میں اپنے تئیں بے حد خوش تھا کہ وہ دونوں بدمعاش کیفر کردار کو پہنچ گئے تھے۔ ان کا کیا حشر ہوا میں نے یہ جاننے کی کوشش بھی نہیں کی اور کسی فاتح جرنیل کی طرح اپنے گھر کی جانب روانہ ہوا۔ میں کسی قدر محتاط، لمبی، سنسان اور ویران سڑک پر سے گزرتے ہوئے چودھویں کے چاند اور بھیگی بھیگی رات کا لطف لیتا رہا۔ جب میں ناگن چورنگی سے گزر کر سلیم سینٹر سے فرلانگ بھر فاصلہ طے کر کے آگے بڑھا تو اپنی اسکوٹر کی رفتار اچانک دھیمی کرنا پڑی، کیوں کہ سڑک ناہموار تھی۔ قدم قدم پر کھدائی کے باعث سڑک کا ستیا ناس ہوا پڑا تھا۔ میں جب بڑے سے چوراہے کے قریب پہنچا تو میرے کانوں میں ایکا ایکی کسی مرد کی دل خراش آواز لرزتی ہوئی گونجی۔

"مجھے چھوڑ دو۔۔۔۔ خدا کے لیے مجھے نہیں مارو۔۔۔۔ میرے پیسے نہیں چھینو۔"

اس آواز میں کچھ ایسا درد تھا کہ اس نے میرے دل میں برچھی سی چبھو دی، اس میں ایک بدنصیب کی التجا ہی نہیں بلکہ زخمی روح بھی سسک رہی تھی۔ میرے کانوں میں جیسے گرم گرم سیسہ پگھلنے لگا میں نے فوراً ہی بریک لگا کر اسکوٹر روک لی، زمین پر دونوں پیر ٹیک کر کھڑا ہو گیا اور اپنی گردن گھما کر آواز کی سمت دیکھا۔ میرے بائیں بازو کی جانب چھوٹی اور بڑی چھدری چھدری جھاڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ میں نے چونک کر جسم میں خون منجمد کر دینے والا بھیانک منظر دیکھا۔

ایک بوڑھا شخص زمین پر گرا ہوا تھا۔ اس کی چھاتی پر ایک لمبا چوڑا اور تنومند بدمعاش بڑی سفاکی سے سوار تھا۔ اس کے ہاتھ میں بڑا سا چھرا تھا، جس پر اس کی گرفت بڑی مضبوط تھی۔ وہ چھرا فضا میں لہرا لہرا کے گرے ہوئے شخص کو دھمکیاں دیے جا رہا تھا۔ اس چھرے کے پھل کی چمک دیکھ کر مضبوط دل کے آدمی کا کلیجہ بھی منہ کو آ سکتا تھا۔ اس بوڑھے شخص کے سرہانے ایک اور بدمعاش جو لمبے قد، مضبوط اور توانا بدن تھا۔ جس کی لمبی لمبی مونچھوں نے اس کا چہرہ اور بھی خوفناک بنا کر رکھ دیا تھا اپنے ہاتھ میں ڈنڈا لیے، بڑی بے رحمی سے بڑے میاں کی پسلی میں ٹھوکا دیے جا رہا تھا۔ بڑے میاں اس بے رحمانہ تشدد اور ان دو بدمعاشوں کی موجودگی کے باوجود اپنی پوری قوت سے مزاحمت کر رہے تھے۔ جانے ان کے پاس کتنی رقم تھی اور وہ کس امید پر تن تنہا اپنا ایڑی چوٹی کا زور لگا کر محاذ پر

ڈٹے ہوئے تھے۔

صاف شفاف آسمان پر چودھویں کا چاند اپنی مسکراہٹ بکھیر رہا تھا۔ اس کی دودھیا روشنی میں وہ وحشت ناک منظر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ میرے لیے یہ سب کچھ ناقابل برداشت ہونے لگا۔ میں بوڑھے میاں کو ان بے رحم درندوں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر ایک قدم بھی آگے جانے کیلئے تیار نہیں تھا۔ اس طرح ایک شریف آدمی' ان بدمعاشوں کے ظلم و ستم کا نشانہ بن کر موت کے گھاٹ اتر جاتا۔ اگر دن کا وقت ہوتا' اور ایک دوسرے کے مدمقابل' ہم پلہ اور برابر کے طاقتور ہوتے تو میں ان پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈال کر گزر جاتا یا رک کر تماشا دیکھتا۔ میں عموماً ایسے جھگڑوں میں اپنی ٹانگ اڑانے سے گریز کرتا ہوں کیونکہ مجھے کئی مرتبہ اس خدمت خلق کا تلخ نتیجہ بھگتنا پڑا تھا۔ میری نظروں کے سامنے اس وقت معاملہ بڑا سنگین اور خونیں نوعیت کا تھا۔ ایک بوڑھے اور ناتواں شخص پر دو تندرست اور توانا لٹیرے بڑی سفاکی سے اپنی طاقت اور ظلم کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ یہ سراسر زیادتی تھی۔ ایک ایسا ظلم کہ ایک بچہ بھی دیکھ کر برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ یہ غیرت اور مردانگی کی ایسی توہین تھی جس کی مثال نہیں ملتی تھی۔ میری رگوں میں خون ابلنے لگا اور کنپٹیاں گرم ہونے لگیں۔ میں نے سراپا غصے سے کھول کر ان کی جانب اپنی اسکوٹر کا رخ موڑ لیا۔

صرف وہ بدمعاش جس کے ہاتھ میں ڈنڈا تھا' اسکوٹر کے انجن کا شور سن کر میری طرف دیکھتے ہوئے چوکنا ہو گیا تھا جبکہ دوسرا بدمعاش بھی میری موجودگی محسوس کر کے جلد سے جلد بوڑھے میاں کی جیب خالی کر لینا چاہتا تھا۔ بوڑھے میاں تائید غیبی سمجھ کر اور بہادر بن گئے۔ ان کی مزاحمت بڑھتی گئی تھی۔ ڈنڈے والے بدمعاش کو شاید یہ امید نہیں تھی کہ میں ان کی طرف چلا آؤں گا۔ وہ مجھے دیکھ کر کسی گیدڑ کی مانند بدکا' اس نے اپنے ساتھی سے اپنی زبان میں جانے کیا کہا کہ دوسرا بدمعاش بجلی بن کر بوڑھے میاں کی چھاتی پر سے اٹھا اور اپنے ساتھی کے اشارے پر میری جانب تیزی سے پلٹا کھایا۔

میں ان دونوں سے خاصے فاصلے پر اپنا اسکوٹر روک کے بڑی سرعت سے اترا اور اسے کھڑا کر دیا۔ میرے مقابلے میں دو بدمعاش پوری طرح مسلح تھے' میں بالکل تنہا تھا لیکن گھبرایا نہیں' البتہ میں ایک ثانیے کے لیے یہ تو سوچا کہ آج برے پھنسے بیٹے فرید میاں۔ اگر ان دونوں بدمعاشوں نے تم پر قابو پا لیا تو پھر تمہاری خیر نہیں ہے' وہ دونوں مل کر تمہارا

بھرکس نکال دیں گے۔ تمہارے بٹوے میں جو ایک ہزار روپے رکھے ہوئے ہیں وہ بھی چھین کر لے جائیں گے۔ بڑے میاں کا جو حشر نشر ہونا ہے' وہ تو ہو کر ہی رہے گا۔

میری زندگی میں یہ کوئی پہلا موقع تو تھا نہیں کہ میں تن تنہا اور مسلح بدمعاشوں سے نبرد آزما ہونے والا تھا۔ طالب علمی کے زمانے میں اسکول اور کالج میں میں نے اپنے مضبوط جسم اور طاقت سے ہمیشہ فائدہ اٹھایا تھا۔ چاقو زنی میں ماہر بھی رہا اور میرے جسم میں چاقو کے زخموں کے بہت سے نشان موجود ہیں' غنڈہ گردی' لڑکیوں سے چھیڑ چھاڑ' انہیں اغوا کرنے میں دوستوں کی مدد کرنا' کالج کے انتخابات میں دھاندلی اور ہنگامہ آرائی میرا وطیرہ رہا تھا۔ میں بہ یک وقت تن تنہا کئی کئی لڑکوں سے لڑ چکا تھا۔ میں نے اپنے بازوؤں کو ہر سنگین موقع پر آزمایا تھا۔ آج بھی ایسا ہی وقت آن پڑا تھا تو میں پیچھے ہٹنے والوں میں سے نہیں تھا۔ میں ان بے رحم اور سنگ دل بدمعاشوں کو سبق دینا اپنا فرض سمجھنے لگا۔

میں ان کی طرف بڑھتے ہوئے چوکس اور چوکنا تھا۔ میں چند ثانیوں میں گرد و پیش کا جائزہ لے چکا تھا۔ میرا ذہن بڑی تیزی سے سوچ کے عمل میں مصروف تھا۔ جب میں ان دونوں کے نزدیک پہنچا تو درمیانی فاصلہ ایک دو گز کا رہ گیا۔ چھرے والے بدمعاش نے فضا میں چھرا لہراتے ہوئے کہا۔ "اچھا ہوا تم بھی آگیا؟ اب اپنا جیب بھی خالی کر کے جاؤ!"

لڑائی کا ایک اصول یہ بھی ہے کہ اپنے حریف کو مشتعل کر دو' کیوں کہ اشتعال ہوش اور عقل کو گم کر دیتا ہے۔ یہ میرا ایک آزمودہ نسخہ تھا۔ آج اس کا موقع پھر ایک بار ہاتھ لگا تھا۔ میں نے ان دونوں کے سامنے رک کر کہا۔ "حرام کی اولاد! اگر تم واقعی اپنے باپ کی اولاد ہو تو ایک ایک کر کے میرے مقابلے پر آؤ۔"

انہیں توقع نہیں تھی کہ میرے منہ سے ایسے کلمات نکلیں گے' میرے بارے میں شاید ان کا یہ اندازہ تھا کہ میں کوئی خوش پوشاک دفتری بابو ہوں' وہ میری بات سن کر چونکے اور لال پیلے ہونے لگے' ڈنڈا لیے ہوئے بدمعاش کا چہرہ اور خوف ناک ہو گیا۔ جانے کس خیال سے اس نے شقاوت کے لہجے میں جواب دیا۔ "بہادر کا بچہ' اپنا جیب خالی کر کے شرافت سے چلے جاؤ۔" نہیں تو تم کو یہاں ذبح کر دے گا۔"

"حرامیو! ایک غریب کو لوٹتے ہوئے شرم نہیں آتی!" میں نے چیخ کر انہیں طعنہ دیا۔

"تم غریب آدمی نہیں ہو!" اس نے فضا میں چھرا لہراتے ہوئے استہزائیہ انداز میں کہا۔ "ہم ابھی تمہارا کریا کرم کرے گا۔"

"میری جیب میں تمہارے باپ کا مال نہیں ہے کہ تم چھین لو گے۔"

"اپنا زبان بند کرو!" ڈنڈا لئے ہوئے بدمعاش نے دہاڑ لگائی۔ "اب تم ہمارے ہاتھوں سے بچ کر نہیں جا سکتا۔"

"سوچ لو۔۔۔ رذیلو۔۔۔۔!" میں نے کسی قدر اطمینان سے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اگر تم لوگوں نے بھی مجھ سے رحم کی بھیک مانگی تو نہیں ملے گی۔" چھرے والے بدمعاش نے اپنے ساتھی سے کہا۔

"یہ سور کا بچہ بہت بڑھتا جا رہا ہے۔ ابھی ہم اسے مزا چکھاتا ہے۔"

چھرے والے بدمعاش نے میری جانب ایک قدم بڑھایا تھا کہ ڈنڈے والا بدمعاش بھی اس کے ساتھ بڑھا۔ چھرے والے بدمعاش نے اپنے ساتھی کو ہاتھ سے روک لیا۔ بڑے میاں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اسے سمجھایا۔ تم اس بڈھے کا خیال رکھنا۔ وہ بھی ہم پر حملہ کر سکتا ہے۔"

وہ بدمعاش چونک کر بڑے میاں کی جانب تیزی سے بڑھ گیا۔ میں چوکنا ہو کر دوسرے بدمعاش کے حملے کا انتظار کرنے لگا' میری گالیوں نے اسے اس قدر اشتعال دلایا تھا کہ وہ بڑے جوش میں میری جانب للکارتا ہوا لپکا۔ وہ اندھا دھند میری طرف آ رہا تھا۔ ایکا ایکی وہ راستے میں پڑے ہوئے ایک بڑے پتھر سے ٹکرایا اور لڑکھڑا کر قلابازی کھا گیا' اس نے قلابازی کھاتے ہوئے اپنے آپ کو سنبھالنے کی بڑی کوشش کی لیکن وہ توازن قائم نہیں رکھ سکا۔ وہ کٹی پتنگ کی مانند منہ کے بل جا گرا۔ جب وہ ایک چیخ مار کے اپنی جگہ سے اٹھا تو اس کے غالباً دو دانت ٹوٹ گئے تھے۔ اس کے منہ سے خون کا فوارہ ابل پڑا۔ اس کی پیشانی بری طرح زخمی ہو گئی تھی۔ خون کی دھاریں اس کے چہرے پر پھوٹ پڑی تھیں اور چہرہ لہولہان ہو گیا تھا۔

قدرت کو شاید میری اس نیکی پر رحم آ گیا تھا۔ اس بدمعاش کے ہاتھ سے چھرا چھوٹ کر میرے پیروں سے ایک فٹ کے فاصلے پر آ گرا۔ یہ میرے لئے ایک سنہری موقع تھا۔ میں نے بغیر کسی تاخیر کے لپک کر اس چھرے کو اٹھایا اور اس پر اپنی گرفت مضبوط کر

لی۔ چھرا میرے ہاتھوں میں آتے ہی میں نے اپنا سینہ تان لیا۔ "آؤ۔۔۔ میرے بچو۔۔۔" میں غصے سے دھاڑ۔ "بڑی شیخیاں بگھار رہے تھے تم۔"

اس بدمعاش نے بھاگنے میں ہی اپنی عافیت سمجھی' وہ جدھر کو منہ اٹھا' ادھر بھاگ گیا' اسے فرار ہوتے دیکھ کر اس کے ساتھی کا بھی حوصلہ پست ہو گیا۔ اس نے بھی اپنا ڈنڈا زمین پر پھینکا اور سرپٹ دوڑ لگائی' بھاگتے ہوئے اس نے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا' ان پر میری نہیں چھرے کی دھاک بیٹھ گئی تھی۔

وہ دونوں بدمعاش جب میری نظروں سے اوجھل ہو گئے تو میں نے چھرے پر ایک اچٹتی نگاہ ڈالی۔ خوف کی ایک سرد لہر اٹھی اور میری رگوں میں سنسنا گئی' یہ چھرا اس قدر تیز اور خطرناک تھا کہ اس کا ایک ہی وار توانا اور کسرتی جسم کو آسانی سے چیر کر رکھ سکتا تھا۔ اگر قسمت ساتھ نہ دیتی تو میری اور بڑے میاں کی لاشیں اس ویرانے میں پڑی ہوئی ملتیں۔ ان لاشوں کے گل سڑنے سے تعفن پھیلتا اس سے ہی شاید ہماری موت کی خبر منتشر ہوتی تو ہوتی۔

بڑے میاں چند لمحوں تک ان بدمعاشوں کو جاتا ہوا دیکھتے رہے۔

معاً" چونک کر وہ میرے پاس آئے' ان کی تھکی تھکی آنکھوں میں ممنونیت بھری ہوئی تھی۔ دعائیہ لہجے میں کہنے لگا۔ "بیٹا! خدا تمہیں سدا خوش رکھے۔" ان کی آواز جذبات کی شدت سے بھرا گئی۔ "میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ میں کن الفاظ سے تمہارا شکریہ ادا کروں' میں تمہارے اس احسان عظیم کے صلے میں۔۔۔ تمہیں زندگی بھر دعائیں دیتا رہوں گا۔"

میں نے رسمی طور پر جواب دیا۔ "جی کوئی بات نہیں' یہ تو میرا فرض ہے۔"

"تم نے اپنا ذرہ برابر بھی خیال نہیں کیا اور اپنی جان خطرے میں ڈال دی۔" بڑے میاں نے میری پیٹھ تھپکتے ہوئے شاباش دی۔ "واقعی۔۔۔ تم بڑے بہادر' دلیر اور نڈر ہو۔۔۔ نہتے ہو کر ان دو بدمعاشوں کے مقابلے پر ڈٹ گئے۔ تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ اپنی جان بچانے کیلئے بھاگ کھڑا ہوتا۔"

میں بڑے میاں کو اپنے ماضی کے بارے میں کیا بتاتا؟ ایک سوال جو دفعتاً" میرے ذہن میں ابھرا تھا' میں نے ان سے پوچھنے سے پہلے گرد و پیش کا جائزہ لے کر انہیں حیرت

بھری نظروں سے دیکھا۔ "اتنی رات گئے آپ اس ویرانے میں کہاں آ گئے؟ آپ جا کہاں رہے تھے؟ ان بدمعاشوں کے ہاتھ کیسے لگے؟"

"میں اپنی بیٹی اور اس کے بچوں کو سسرال چھوڑ کر گھر لوٹ رہا تھا تو بس کی وجہ سے بہت دیر ہو گئی۔" بڑے میاں کی آواز جذبات سے مغلوب تھی۔ "اس راستے پر کوئی ویگن نہیں چلتی ہے' تو میں پیدل چل پڑا لیکن گھر تک پیدل چل کر پہنچنا ناممکن دکھائی دیا تو لالو کھیت میں کتنے ہی رکشا والوں سے منتیں' سماجتیں کرتا رہا۔ اس میں دو گھنٹے گزر گئے' آخر ایک رکشا والے کو رحم آ گیا۔" بڑے میاں نے سانس لینے کے لئے توقف کیا۔ "اس رکشے والے نے مجھے زبردستی اس چوراہے پر اتار دیا اور اپنے پیسے لے کر چلتا بنا۔ کیوں کہ اندر کا راستہ خراب ہے' کچا بھی۔ لہٰذا میں پیدل ہی چل پڑا۔ یہ دونوں بدمعاش اچانک ان جھاڑیوں میں سے نکل کر میرے سامنے آ گئے اور مجھے لوٹ لینا چاہتے تھے لیکن میں بھی ان کے مقابلے پر ڈٹ گیا۔"

"آپ رقم ان کے حوالے کر دیتے تو اچھا ہوتا!"

"وہ کس لیے؟" بڑے میاں نے حیرت سے پوچھا۔

"میں نے انہیں نیچے سے اوپر تک دیکھا' ان کی حالت اور لباس بتا رہا تھا کہ ان کا تعلق غریب طبقے سے ہے۔" میں نے قدرے تامل سے جواب دیا۔ "ایک معمولی رقم کے لئے آپ کی جان بھی جا سکتی تھی۔"

"اگر وہ پیشہ ور قاتل اور لٹیرے ہوتے تو پہلے مجھے قتل کرتے اور بعد میں میری رقم لے کر فرار ہو جاتے۔" بڑے میاں بولے۔ "وہ انتہائی گیرے تھے اور بزدل تھے' ان میں اتنی ہمت کہاں تھی کہ مجھے قتل کر دیتے۔ میں نے یہی سوچ کر اپنا سارا زور مزاحمت میں صرف کر دیا۔"

میں بڑے میاں سے کوئی بحث نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے ان سے پوچھا۔ "آپ کا مکان کہاں ہے؟"

بڑے میاں نے پلٹ کر مغرب کی سمت ہاتھ کے اشارے سے مجھے بتایا۔ "یہاں سے تقریباً نصف میل کا فاصلہ ہو گا۔"

میں نے دوری کا خیال کر کے ان سے کہا۔ "چلئے آیئے۔۔۔ میں آپ کے گھر تک

چھوڑتا ہوا چلا جاؤں۔" میں نے پیش کش کی۔ "آئندہ آپ احتیاط کر لیا کریں۔۔۔ اتنی رات گئے آنا جانا ٹھیک نہیں ہوتا۔"

"آج محض اتفاق ہی تھا کہ واپسی میں دیر ہو گئی۔" بڑے میاں کا لہجہ جذباتی ہو گیا۔ "آج میری پونجی لٹنے میں کوئی کسر نہیں رہ گئی تھی۔"

میرے ذہن میں یہ خیال بجلی کی طرح آیا کہ بڑے میاں کے پاس یقیناً بہت بڑی رقم ہو گی۔ جب ہی انہوں نے اس رقم کی خاطر اپنی جان کی پروا تک نہیں کی' چھوٹی موٹی رقم ہوتی تو شاید وہ آسانی سے ان بدمعاشوں کے حوالے کر دیتے' میں نے چونک کر نہ چاہتے ہوئے بھی ان سے دریافت کیا۔ "آپ کے پاس کتنی رقم موجود ہے؟"

"تین سو روپے!" بڑے میاں نے سادگی سے جواب دیا۔

"صرف تین سو روپے؟" میں نے حیرت زدہ ہو کر ان کی طرف دیکھا۔

"ہاں بیٹے!" بڑے میاں نے اثباتی انداز سے سر ہلایا۔ "اگر یہ رقم مجھ سے چھین لی جاتی تو میرے ہاں فاقوں کی نوبت آ جاتی۔ پورے ایک ماہ کا خرچ ہے۔"

بڑے میاں کے منہ سے تین سو روپے کی رقم کے بارے میں سن کر یک لخت بڑے زور کی ہنسی میرے ہونٹوں پر آتے آتے رہ گئی۔ میں نے اپنا منہ دوسری سمت کر کے بڑے میاں کی نظروں سے اپنا چہرہ چھپایا جس پر تمسخرانہ مسکراہٹ ابھر آئی تھی۔ اگر بڑے میاں کو میرا بشرہ پڑھنے کا موقع مل جاتا تو انہیں میری ہنسی بڑی ناگوار محسوس ہوتی اور دل میں جانے میرے بارے میں کیا سوچتے' سچی بات تو یہ تھی کہ میرے نزدیک ان تین سو روپوں کی کوئی وقعت نہیں تھی۔ میں نہ صرف ہر ماہ اپنے گھر میں' ماہانہ اخراجات کے لئے تین ہزار روپے دیا کرتا تھا بلکہ روزانہ دو سو روپے اخراجات کے لئے دینا ضروری تھا۔ اس رقم کے علاوہ میری اپنی ذات پر دو سو روپے سے پانچ چھ سو روپے تک کا روز ہی خرچ ہوتا' غیر ملکی برانڈ کے سگریٹ پینا' لنچ کے لئے شہر کے کسی اعلیٰ ترین ریستوران میں تن تنہا یا دوستوں کو ساتھ لے کر چلا جانا' سہ پہر کی چائے پانچ ستاروں والے ہوٹل میں پینا میرا مشغلہ بن گیا تھا۔ مجھے اپنے اس شوق پر فخر اور بڑا ناز رہتا' جامہ زیبی میں کسی شہزادے سے کسی صورت سے کم نہیں تھا۔ میرے پاس روپے پیسوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ بس اللہ میاں کی دین تھی۔ جو دوسرے لوگوں کی معرفت' روز ہی میرے مقدر میں لکھی ہوئی تھی۔ اس کے لکھے

کو کون مٹا سکتا ہے۔

میں چاہتا تو اپنے ذاتی استعمال کے لئے ایک نئے ماڈل کی خوب صورت کار رکھ سکتا تھا لیکن میں دانستہ کار خریدنے سے احتراز کیا کرتا تھا۔ کیوں کہ ہمارے معاشرے میں کوئی بھی ایک دوسرے کو پھلتا پھولتا ہوا نہیں دیکھ سکتا۔ میں کار خرید لیتا تو افسران اعلیٰ کی نظروں میں آ جاتا۔ وہ میرا کچھ بگاڑ تو نہیں سکتے تھے۔ البتہ میرا تبادلہ ضرور کرا دیتے۔ مجھے کسی قیمت پر اپنا تبادلہ منظور نہیں تھا۔

ہفتے عشرہ میں دو تین راتیں کسی نہ کسی ماہ وش کی چوکھٹ پر جبیں سائی میں گزرتیں روایتی انداز سے حاضری دینا اور تین چار سو روپے کا نذرانہ پیش کر کے میں جیسے حاتم طائی کا باپ بن جاتا۔ میں حسن پسند تھا لہٰذا حسن کی تلاش میں سرگرداں رہتا۔ میں نے کسی ایک پر زیادہ دنوں تک نظر کرم نہیں رکھی۔ انصاف بھی کوئی چیز ہے' مساوات کا خیال بھی کرنا پڑتا ہے' آپ شاید یہ کہیں گے کہ میں مرد ہونے کے ناتے' ایک عورت سے جلدی اکتا جاتا ہوا ہے۔ اس سے انکار بھی نہیں کیوں کہ قدرت نے قدم قدم پر اپنی سادگی و پرکاری کا مظاہرہ جو کیا ہوا ہے۔

دودھیا چاندنی چاروں اطراف بکھری ہوئی تھی۔ رات کے اس سناٹے میں چاندنی کی دل فریبی میرے من میں کنول کی یاد تڑپانے لگی اور ناہموار سڑک کے باعث میرا تصور بکھر کے رہ گیا۔ تقریباً نصف میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد' بڑے میاں نے دائیں بائیں کی کوئی تین چار گلیاں گھمائیں' ایک گلی میں کارنر کے نامکمل مکان کے سامنے اسکوٹر رکوائی جیسے ہی میں نے اسکوٹر روکی' اس کا انجن بند ہو گیا۔

مجھے ان سے کوئی رسمی شکریہ تو وصول کرنا نہیں تھا۔ میں نے بڑے میاں کو خیر و عافیت سے ان کے گھر پہنچا دیا تھا۔ جیسے ہی وہ مکان کے اندر گئے' میں نے اسکوٹر اسٹارٹ کی اور تیزی سے گلی پار کر کے بغلی گلی میں آیا۔ چند لمحوں بعد میں مین روڈ پر آ گیا۔ مجھے گھر پہنچنے کی جلدی تھی۔

مجھے تیسری اور آخری رات کاٹنی تھی۔ کل کی رات' صرف میں اور کنول ہوں گے۔ ہم دونوں کہ جو ایک دوسرے کے دل کی دھڑکن بن چکے تھے۔

میں ناظم آباد چورنگی سے ہوتا ہوا حیدری پہنچا تو شام ہو چکی تھی۔ مجھے اپنے ایک

دوست کی دکان سے کنول کے لئے انگوٹھی خریدنی تھی۔ میں اپنی پسند کی انگوٹھی خرید کے دکان سے باہر نکل رہا تھا کہ کسی نے میری پشت پر پہنچ کر میرا بازو پکڑ لیا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ بڑے میاں کھڑے ہوئے مسکرا رہے تھے۔ بڑے میاں نے شکایتی لہجے میں کہا۔

"برخودار! کل تم نے کیا حرکت کی تھی؟ چپکے سے کھسک لئے۔"

میں نے عذر پیش کیا۔ "رات جو بہت ہو چکی تھی۔"

"میں کل ساری رات سو نہیں سکا ہوں۔" بڑے میاں کہنے لگے۔ "میں اندر گیا تھا کہ تمہارے لئے بیٹھنے کا بندوبست کروں' جب میں باہر آیا تو تم جا چکے تھے۔ میرے دل کو کس قدر صدمہ پہنچا' میں بیان نہیں کر سکتا۔ خدا کا شکر ہے کہ میری دعا جلد قبول ہو گئی! تمہیں میرے ساتھ میرے گھر چلنا ہو گا۔" ان کی آنکھوں میں ممنونیت کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا۔ "میں چاہتا ہوں کہ تم ابھی اور اسی وقت میرے ساتھ چلو' میں تمہیں کہیں نہیں جانے دوں گا۔" ان کے لہجے میں بے پناہ اپنائیت تھی۔ میرے ہاں چل کر ایک کپ چائے ہی پی لو بیٹے۔"

"چائے!" میں نے ان کی جانب بے بسی سے دیکھا' کیوں کہ کنول کے لئے تحائف خریدنے تھے۔" آج آپ مجھے معاف کر دیں تو بڑی عنایت ہو گی۔"

"کیا میں اپنے محسن کی اتنی سی بھی خدمت نہیں کر سکتا ہوں۔" بڑے میاں جذباتی سے ہو گئے۔

"آپ کی چائے باقی۔" میں نے انکسار سے جواب دیا۔ "کسی روز آپ کے ہاں حاضر ہو کر پی لوں گا۔ مجھے اس وقت ایک ضروری کام سے ایک جگہ پہنچنا ہے۔"

تم آدھے گھنٹے میں فراغت پا جاؤ گے۔" بڑے میاں نے شدید اصرار کیا۔ "تم نے آج تک میرے ہاں جیسی چائے نہیں پی ہو گی۔"

"کیا میرا چلنا ضروری ہے؟"

"یہ میرے لئے عزت افزائی کا باعث ہو گا۔"

جب میں بڑے میاں کو اسکوٹر پر لے کر گھر پہنچا تو وہ مجھے باہر ہی چھوڑ کر خود اندر چلے گئے۔ میں اندر ہی اندر بھنا کر رہ گیا۔ ان کا خلوص اور چائے میرے لئے مہنگی پڑ رہی تھی۔ مجھے کنول کے لئے تحائف کی فکر ستانے لگی کہ یہاں سے نکلنے میں بہت دیر ہو گئی تو

میں خریداری کیسے کر سکوں گا۔ مجھے ایک دوست کے ہاں فلمیں دیکھنے بھی جانا تھا۔ دیر ہونے پر کہیں میرے گھر والے میری تلاش میں نہ نکل کھڑے ہوں۔ عام دنوں میں رات ایک بجے پہنچتا تھا۔ دوست کے ہاں سے ہوتے ہوئے لوٹ کر جانے کا مطلب یہ تھا کہ رات تین بجے سے پہلے پہنچ نہیں سکتا تھا۔ میں اپنی بے بسی پر کراہنے کے علاوہ کر بھی کیا سکتا تھا۔

میں نے بڑے میاں کی واپسی سے اکتا کر ان کے بوسیدہ مکان کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ اس مکان پر باہر سے پلاستر ہونا باقی تھا۔ اس کی ظاہری حالت بتا رہی تھی کہ اس کے اندر بھی کہیں پلاستر نہیں ہوا ہے۔ بیرونی دروازے پر صرف ایک لوہے کا گیٹ تھا۔ جبکہ اندر کے کمروں میں نہ تو دروازے لگے ہوئے نظر آ رہے تھے اور نہ ہی کھڑکیوں کی جگہ پر کوئی چوکھٹ تھی' البتہ ان کی بجائے' لنڈے بازار کے کمبل' پردے بن کر دروازوں اور کھڑکیوں کی جگہ لیے ہوئے تھے۔

مجھے بڑے میاں کے حلیے اور لباس سے ان کی غربت کا اندازہ پہلے ہی ہو گیا تھا۔ ایک شخص جس کا خاندان صرف تین سو روپے پر گزارہ کر رہا ہو جو ان تین سو روپوں کے لئے اپنی جان کو داؤ پر لگا سکتا ہو' وہ کس طرح اپنی گزر بسر کرتا ہو گا۔ تین سو روپے تو میرے گھر میں دو دن بھی نہیں چل سکتے تھے۔ مجھے بڑے میاں کی زبوں حالی پر بڑا ترس آیا اور میں نے ان کے لئے اپنے دل میں ایک انجانا سا دکھ محسوس کیا۔

کچھ دیر بعد میں اس کمرے کی اکلوتی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا جو ان کا شاید ملاقاتی کمرہ تھا۔ ایک درمیانے سائز کی چوکی دیوار سے لگی ہوئی تھی جس پر ایک چادر بچھی ہوئی تھی۔ بڑے میاں اس چوکی پر میرے روبہ رو ہو کر بیٹھ گئے۔ وہ مجھے ایسی عقیدت بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے جیسے میں ان کے لئے آسمانی فرشتہ ہوں' کتنی دیر تک ہم دونوں کے درمیان گہرا سکوت چھایا رہا' میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں بڑے میاں سے کس موضوع پر بات کروں' کونسا ذکر چھیڑوں' وہ عمر رفتہ تھے اور میں ایک نیا عہد۔ میں بیزار ہو کر ان دیواروں کو دیکھتا رہا جو ساٹھ پاور کے بلب کی میلی سی روشنی میں کسی قدر بھیانک دکھائی دے رہی تھیں۔ آج سے کئی سال پہلے کی بات تھی کہ کبھی ہم نے بھی ایسے ہی ایک گھر میں کسمپرسی کے دن گزارے تھے۔ وہ بھولی بسری زندگی میری نظروں کے سامنے

ابھرنے لگی تھی۔ میں نے ان یادوں کو اپنے ذہن سے جھٹک دیا' میرے کانوں میں چوڑیاں بج اٹھتی تھیں اور کبھی کبھی پیالیاں آپس میں کھڑک جاتی تھیں۔ بڑے میاں نے خود ہی سکوت کو توڑتے ہوئے پوچھا۔ "کیا میں اپنے محسن کا نام دریافت کر سکتا ہوں؟"

"خاکسار کو فرید احمد کہتے ہیں۔" میں نے اپنا تعارف کرایا۔ "میں انکم ٹیکس کے محکمے میں ملازمت کرتا ہوں۔"

"ماشاء اللہ!" بڑے میاں یک لخت خوش ہو گئے' انہوں نے مجھے نیچے سے اوپر تک ایسی نظروں سے دیکھا جیسے میں بر دکھاوے کے لئے آیا ہوا ہوں۔" میں بھی ایک سرکاری محکمے سے پچیس سال وابستہ رہا۔"

میں نے ان سے یہ پوچھنے کی ضرورت نہیں سمجھی کہ وہ کس محکمے میں ملازمت کرتے تھے جس محکمے میں بھی ملازمت کرتے رہے ہوں گے۔ وہاں چپڑاسی یا زیادہ سے زیادہ کلرک رہے ہوں گے۔ اگر ان کا عہدہ کچھ بڑا ہوتا تو آج وہ ان بدترین حالات کا شکار نظر نہیں آتے۔ میں بڑے میاں سے رسمی طور پر ایک سوال پوچھنا چاہتا تھا کہ اچانک میرے کان اس آواز کی جانب متوجہ ہو گئے جو کسی کے پیروں کی چاپ تھی۔ معاً" میری نگاہ سامنے والے کمرے کے پردے کی طرف اٹھی۔ جو مرتعش ہو رہا تھا۔ وہیں سے ایک ترنم خیز آواز کا زیر و بم' گھرے سناٹے میں امرت بن کر گونجا اور میرے کانوں میں اتر گیا۔ "ابو! چائے لے لیجئے۔"

میں اس وقت بہ ظاہر بڑے میاں کی طرف متوجہ تھا لیکن میرا ذہن تو کنول کے حسن کا اسیر بنا ہوا تھا۔ گزرے بسرے ایک ایک لمحے کا عکس میرے ذہن کے پردوں پر ابھرا ہوا میری رگوں میں نشہ بن کر اترتا جا رہا تھا۔ میں اس چائے کے لئے بڑا بے تاب ہو رہا تھا جس نے میرے پیروں میں بیڑیاں ڈالی ہوئی تھیں۔ میں جلد از جلد چائے پی کر اس اذیت سے نجات پا کر اپنے گھر پہنچنا چاہتا تھا۔ میں اپنے کمرے کے بستر میں دبکا کنول کے دہکتے بدن کے تصور میں کھو کر اس سے باتیں کرتا' آنے والے دن کا پروگرام ترتیب دیتا اور مری میں ہنی مون کے پروگرام کو ایسی شکل دیتا کہ وہ دن میری زندگی کے یادگار بن جائیں' کنول کے سحر سے نکلنے کو میرا جی نہیں چاہتا تھا۔ لیکن اس آواز کی کھنک نے کنول کا سارا فسوں بکھیر کر رکھ دیا تھا۔ میں نے یوں محسوس کیا کہ فضا میں جو ایک بار جل ترنگ بج

اٹھے تھے' وہ برابر بجتے ہی جا رہے تھے۔ اس آواز میں ٹھنڈے میٹھے پانی کا ایسا آبشار تھا کہ وہ میرے سینے میں بھر گیا تو میرا دل اس کی سطح پر ڈگمگانے لگا۔ میں چونک کر بے چین سا ہو گیا۔ میرے سینے میں ایک تڑپ سی بھر گئی۔ میرے من کے کسی گوشے میں انجانی خواہش بے قرار ہونے لگی۔ میں ایک بار پھر وہی ساز سننا چاہتا تھا۔ میں نے اپنی پوری زندگی میں کبھی ایسا شیریں نغمہ نہیں سنا تھا۔ اس لڑکی کے نفیس لب و لہجے سے میرے تصور میں ایک ایسا تراشیدہ پیکر ابھرنے لگا جو میری گنہگار نگاہوں سے چھپا ہوا تھا۔

میں لڑکپن ہی سے حسن پرست واقع ہوا تھا۔ نوجوانی کی حدوں میں قدم رکھا تو حسن کا سوداگر بن گیا۔ ہر پرکشش شے کی خریداری پر تل جاتا تھا۔ گو کہ ہر چیز بکنے والی نہیں ہوتی لیکن مجھے دولت کی بے پناہ طاقت کا اندازہ تھا۔ میں اس قوت کو کئی مرتبہ آزما چکا تھا۔ جہاں دولت کام نہیں کرتی تھی وہاں میں نے ہمیشہ طاقت سے کام لیا تھا۔ میں اپنی پسند کے حصول تک چین سے نہیں بیٹھا تھا۔ میں نے اپنے دل میں تہیہ کر لیا کہ ہر قیمت پر اس آواز کا چہرہ دیکھوں گا' کیا قدرت نے چہرہ بھی آواز کی طرح ہی حسین بنایا ہو گا؟ یا اس کے گلے میں صرف رس ہی رس بھر کے رکھ دیا ہے؟ میں بڑے میاں کی طرف دیکھنے لگا۔ بس وہ اب اٹھتے ہی ہوں گے۔ چائے کی ٹرے لینے اس کمرے کی دہلیز تک جائیں گے' تب پردہ لہرا کے ذرا سا سرکے گا۔ جب پردہ ہٹے گا تو وہ چہرہ میری نظروں سے کیوں کر اور کیسے چھپ سکے گا؟ اگر وہ چہرہ اس لئے بھی نظر نہیں آئے گا تو میں دوسرے دن کسی بہانے یہاں آ دھمکوں گا۔ اس وقت تک آتا رہوں گا جب تک میں اس چہرے کو دیکھ کر اپنی آنکھیں سیراب نہ کر لوں۔" میرے ذہن میں باغیانہ خیالات دندنانے لگے تھے۔

لیکن مجھے اتنی دور جانے کی کوئی ضرورت نہیں رہی' میرے من کی آرزو بر آئی تھی۔ شاید خدا نے میرے دل کی سن لی تھی۔ بڑے میاں نے چوکی پر کسماتے ہوئے اپنے منہ کا رخ دہلیز کی جانب کیا اور شفقت بھرے لہجے میں بولے۔

"بیٹی! تم یہیں چائے لے آؤ! یہ صرف میرے ہی نہیں تمہارے بھی محسن ہیں۔"

مجھے اس ڈرامائی منظر کی ذرہ برابر بھی امید نہیں تھی۔ میں اپنی جگہ چونکا اور سنبھل سا گیا۔ میرے سینے میں دل کسی پرندے کی مانند پھڑپھڑایا۔ حالانکہ جب میں کنول کو دیکھ رہا تھا تب مجھ پر ایسی ہیجانی کیفیت طاری نہیں ہوئی تھی۔ میں ایک لمحے کے لئے بڑے میاں کی

موجودگی نظرانداز کر بیٹھا اور میری نگاہ دروازے پر جم گئی۔

ایک بے حد حسین سڈول اور نرم و نازک ہاتھ نے نمودار ہو کر پردہ ایک طرف ہٹایا۔ دوسرے لمحے کمرے میں جیسے چاندنی چٹک گئی تھی۔ میری آنکھوں پر سکتہ چھا گیا۔ میری آنکھیں تو اس طرح پھٹی کی پھٹی رہ گئیں جیسے میری نظروں کے سامنے آسمان سے چاند اتر آیا ہو' مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایک لڑکی اس قدر حسین بھی ہو سکتی ہے۔ وہ چاند سے یقیناً دوگنی حسین تھی۔ میری آنکھیں خیرہ ہونے لگیں' میری نگاہوں میں اتنی تاب نہیں رہی تھی کہ اس کے چہرے پر چھائے ہوئے جلال کو نظر بھر کے دیکھ سکوں۔ اس کا دہکتا ہوا بدن ہی بھرپور نہیں تھا بلکہ سرتاپا تراشیدہ تھی۔ اس کی غزالی آنکھوں میں جادو تھا۔ چہرے کے تیکھے تیکھے نقش و نگار' ترشے ہوئے گلابی گلابی لبوں اور سیاہ لانبے بالوں کا حسن۔ میں سرتاپا چشم بن گیا تھا۔

وہ اپنے نازک ہاتھوں میں چائے کی ٹرے لئے سبک خرامی سے نپے تلے قدم رکھتی ہوئی آئی۔ سر بہ سر سفید لباس میں ملبوس۔ سفید دوپٹے کی محراب میں' میک اپ سے مبرا چہرے کا حسن پھوٹتا جا رہا تھا۔ میں اس لمحے کنول کو بالکل بھول چکا تھا۔ میں اس کی یاد کے چنگل سے یوں نکلا کہ مجھے ہوش ہی نہیں رہا۔ بڑے میاں نے اپنی بیٹی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے تعارف کرایا۔ "یہ میری بیٹی مہ جبین ہے؟"

میں مہ جبین سے کیا کہتا۔ میری زبان جو آج تک کسی لڑکی یا عورت کے سامنے گنگ نہیں ہوئی تھی۔ آج میرا ساتھ چھوڑ رہی تھی۔

"آپ فرید احمد صاحب ہیں بیٹے!" بڑے میاں' اپنی بیٹی سے مخاطب ہوئے۔ "اگر کل فرید صاحب اپنی جان پر نہ کھیل جاتے تو میری لاش بھی نہ ملتی۔"

"یہ میرا فرض تھا۔" میں نے پہلو بدلا۔ "آپ مجھے شرمندہ نہ کریں۔"

"آداب!" مہ جبین نے اپنا سر جھکا کر شائستگی سے کہا۔ جل ترنگ پھر بج اٹھے تھے۔ میرا جی چاہنے لگا کہ وہ بجتے ہی رہیں۔

میں بے خودی میں مہ جبین کو دیکھتا رہا' رسم و آداب سب کچھ بھول گیا تھا۔ مجھے اپنی محویت پر قطعی اختیار نہیں رہا تھا۔ مہ جبین میرے سامنے کھڑی تھی۔ اس کی بڑی بڑی غزالی آنکھوں میں ممنونیت کا کسی قدر گہرا احساس صاف جھلک رہا تھا۔ آنکھوں سے

ممنونیت نکل کر اس کے یاقوتی لبوں پر بکھر گئی۔ "فرید صاحب! چائے لے لیجئے۔"

میرے کانوں میں رس ٹپکنے لگا تو مجھے ہوش آگیا۔ میں چونک اٹھا۔ وہ میرے روبہ رو اپنی گھنیری پلکیں جھپکاتی ہوئی کھڑی تھی' جانے کس خیال سے اس کے رخساروں پر سرخی آئی اور مٹ گئی۔ شاید میری بے باکی سے وہ سرخ ہو گئی تھی۔ مجھے ندامت سی ہونے لگی۔ مجھے ایسی بے خودی کی کیفیت سے مہ جبین کی طرف نہیں دیکھنا چاہیے۔ یہ میں کسی کوٹھے پر بیٹھ کر حسن و جوانی کا سودا نہیں کر رہا ہوں' بلکہ ایک شریف اور عزت دار شخص کے ہاں بیٹھا ہوا ہوں۔ میرے سامنے اس لڑکی کا باپ موجود ہے۔ وہ جانے اپنے دل میں کیا سوچتا ہو گا۔ مہ جبین نے بھی میرے بارے میں کوئی غلط رائے قائم کی ہو گی لیکن میں تو اپنی جگہ بے بس اور مجبور تھا۔ ایک تو دل پر اختیار بالکل نہیں رہا اور حواس بھی ساتھ چھوڑ چکے تھے۔

مہ جبین نے ٹرے سے چائے کی ایک پیالی اٹھا کر میری طرف بڑھائی۔ اس کے ہاتھوں سے چائے کی پیالی لیتے ہوئے نہ چاہتے ہوئے بھی میں اس کی غزالی آنکھوں میں جھانکے بغیر نہیں رہ سکا۔ مہ جبین کی آنکھوں وزدیدگی سے مجھے دیکھ رہی تھیں۔ میرا دل دھک کر اٹھا۔ میرے سینے میں ٹھنڈی سانسیں غبار بن کر پھیل گئیں۔

"فرید صاحب!" فضا میں نغمے بکھرنے لگے۔ "آپ نے صرف میرے ابو پر ہی نہیں میری ذات پر بھی احسان کیا ہے؟ کاش! ہم آپ کے اس احسان کا عشر عشیر بھی ادا کر سکیں۔"

میں اس پری جمال کے شکریہ کا جواب دینے کے لئے الفاظ موزوں کرنے لگا۔ مجھے زندگی میں پہلی مرتبہ ایک نفیس لڑکی سے واسطہ پڑا تھا۔ میں نے چند لمحوں کے تذبذب کے بعد کہا۔ "مس مہ جبین! یہ کوئی احسان نہیں تھا۔ ظاہر ہے کوئی بھی شخص کسی دوسرے پر ظلم ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید وہ بھی آپ کے ابو کی جان بچانے کے لئے اپنی زندگی خطرے میں ڈال دیتا۔"

"کوئی اور ہوتا تو وہ اپنی راہ لیتا۔" مہ جبین کی مترنم اور تابندہ آواز لہرائی۔ "دن دہاڑے سینکڑوں لوگوں کی موجودگی میں قتل کے واقعات ہوتے رہتے ہیں' کیا آپ نے کبھی دیکھا یا سنا ہے کہ کسی نے اپنی جان پر کھیل کر کسی شخص کی جان بچائی ہو۔"

"لیکن۔" میں متذبذب ہو کر لاجواب ہو گیا۔

"ہمارے معاشرے میں نفسانفسی کا یہ عالم ہے کہ ایک شخص ایڑیاں رگڑ رگڑ کر بھی مر جائے تو کوئی اسے ایک گلاس پانی تک نہیں پلاتا۔" مہ جبین کی آواز میں تلخی تھی۔ "سچ پوچھیے تو۔۔۔ ایسے معاشرے میں آپ کا وجود کسی آسمانی فرشتے سے کم نہیں ہے' ہم آپ کا جس قدر احسان مانیں۔۔۔ وہ کم ہے۔"

سحر انگیز لہجے میں اپنی تعریف سن کر میں پھول سا گیا' میرے لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ بکھر گئی۔ میں نے اسی حلیے' اس پری وش کو دیکھ کر سوچا۔ "مہ جبین جیسی لڑکی اس گھر میں کیسے پیدا ہو گئی؟

"میری بیٹی نے جو کچھ کہا ہے' وہ اپنی جگہ حرف بہ حرف درست ہے بیٹے!" بڑے میاں نے کہا۔ "انسانیت' انسانی غرض تلے روندھی جا رہی ہے۔"

لیکن میں تو اس وقت کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔ میں بہت کچھ سوچنا چاہتا تھا۔ اسی سوچ کی خاطر میں جلدی جلدی چائے پینے لگا۔ چائے واقعی بہت اچھی تھی۔ میں نے کبھی کسی ہوٹل یا گھر میں ایسی شان دار چائے نہیں پی تھی۔ شاید اس میں مہ جبین کے ہاتھ کا حسن شامل ہو گیا تھا یا پھر مجھ پر ہی کسی لمحے کی گرفت سخت ہو رہی تھی۔

رات گھر پہنچ کر بستر پر لیٹا تو میں حیران سا ہو رہا تھا کہ آج جو بساط کنول کے لئے بچھائی تھی' وہ مہ جبین نے کیوں الٹ کر رکھ دی؟" مہ جبین کا دور دور تک کوئی وجود نہیں تھا۔ ساری رات میں کنول اور مہ جبین کا موازنہ ہی کرتا رہا۔

مہ جبین' کنول کو ہر محاذ پر شکست فاش دیتی چلی گئی تھی۔

○

میں صبح ناشتے کی میز پر پہنچا تو سبھی میرا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ ہر ایک کی سوالیہ نگاہ میری جانب اٹھی اور آپ ہی آپ جھک گئی' ان کی آنکھوں میں جو سوال تھے وہ اپنے ہونٹوں پر لا نہیں سکتے تھے۔ اس کے علاوہ کوئی یہ پوچھنے کی جرات نہیں کر سکتا تھا کہ میں رات بھر کہاں غائب رہا؟ اتنی دیر سے کیوں آیا؟ اب تو امی جان نے بھی مجھ سے یہ سوال کرنا چھوڑ دیا تھا۔ اس لئے کہ وہ میرے کرتوتوں سے پوری طرح واقف ہو چکی

تھیں' وہ یہ سمجھتی تھیں کہ میں اتنی دور نکل گیا ہوں کہ واپسی مشکل ہے' کوئی ٹھوکر ہی مجھے راہ راست پر لا سکتی ہے۔ انہیں شاید اسی میں بہتری نظر آئی کہ خاموشی اختیار کر لی جائے لیکن میں چاہتا تھا کہ ان میں سے کوئی ایک یہ تو پوچھے کہ اگر تم رات بھر ایک پل کے لئے بھی نہیں سو سکے ہو تو آخر کس لئے "تم اس قدر الجھے الجھے کیوں دکھائی د رہے ہو؟" لیکن سبھی چور نظروں سے میری جانب دیکھ دیکھ کر میرے موڈ کا اندازہ لگا رہے تھے تاکہ اپنی فرمائشوں کا اعادہ کر سکیں' میں اپنے سامنے چائے کی پیالی رکھے ہوئے یہ سوچتا رہا کہ اپنے دل کی بات کس طرح سے کہوں' اس کا آغاز کہاں سے اور کیسے کروں؟ میری سمجھ میں جس طرح آیا' میں نے بڑے سادا سے انداز میں امی سے کہا۔

"امی جان! میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

اگر اس وقت میں کسی بم کا دھماکا کر دیتا تو شاید میرے گھر والے اس قدر **بھونچکے** ہو کر نہیں رہ جاتے جو میرے منہ سے شادی کا اعلان سن کر ہوئے تھے۔ ان سب پر ایک دم سکتہ سا چھا گیا۔ سب کے سب یک لخت بے حس و حرکت ہو کر رہ گئے۔ انہیں گویا اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ پہلے تو انہوں نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانک کر یہ تصدیق چاہی کہ ہم نے جو کچھ سنا کیا وہ اپنی جگہ درست ہے' دوسرے لمحے ایک بھن بھناہٹ سی ہوئی' امی جان نے مجھے اس طرح سے دیکھا' جیسے انہیں یہ گمان ہو گیا تھا کہ آج رات میں نے کچھ زیادہ ہی پی لی ہے۔ ان کے گمان کو میری آنکھوں کے سرخ سرخ ڈورے تقویت پہنچانے کے لئے کافی تھے۔

"بھائی جان!" سعیدہ نے سب سے پہلے اپنی زبان کھولی۔ "میری ایک سہیلی ہے' اس کا نام جمیلہ ہے' لاکھوں میں ایک ہے۔ آپ دیکھیں گے تو فوراً ہی راضی ہو جائیں گے۔ آپ کہیں تو کل شام اسے چائے پر بلا لوں؟

"تم اپنی اس سہیلی کا تذکرہ کر رہی ہو جو بانس کی طرح ہے؟" نجمہ نے کڑوا سا منہ بنایا۔ کیا وہ میری بشریٰ کا مقابلہ کر سکتی ہے؟ بھائی جان! پلیز! بشریٰ کو ایک نظر دیکھ لیں۔ وہ آج ہی میرے ساتھ آ سکتی ہے۔"

"وہ پولٹری فارم کی مرغی دکھائی دیتی ہے۔" سعیدہ الجھ پڑی۔ صرف چمڑی ہی تو سفید ہے' نقوش اور رنگ روپ نام کو بھی نہیں ہے۔"

"لڑکی خوش اخلاق بھی ہو۔" قمر بولا۔ "مجھے ایسی بھابی چاہئے۔"

"تم سب لوگ اپنی اپنی زبانیں بند کرو۔" امی جان ان سب کو ڈانٹ کر میری جانب متوجہ ہوئیں۔ "میری نظر میں چند اعلیٰ سرکاری افسران اور دولت مند گھرانوں کی لڑکیوں کے رشتے موجود ہیں' وہ لوگ تمہیں نہ صرف اپنی بیٹیاں دینے کے لئے تیار ہیں بلکہ وہ لڑکیاں اپنے ساتھ اس قدر جہیز لے کر آسکتی ہیں کہ تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے' ہمارا گھر نیچے سے اوپر تک بھر جائے گا۔ کار کے علاوہ بنگلہ بھی مل سکتا ہے۔"

"اچھا اب میری بھی سنئے!" میں نے تند لہجے میں کہا۔ میں کسی دوسرے کی پسند کی لڑکی سے نہیں بلکہ اپنی پسند کی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

"کیا وہ بہت خوبصورت ہے؟" نجمہ نے پوچھا۔

"تم لوگ زندگی بھر ایسی حسین لڑکی تلاش نہیں کر سکتے ہو؟" میں نے اسی لہجے میں جواب دیا۔

وہ لڑکی کون ہے؟ اس کے ڈیڈی کیا کرتے ہیں؟ وہ لوگ کہاں رہتے ہیں؟ سعیدہ نے ایک ہی سانس میں اتنے سارے سوالات کر دیئے۔" آپ نے چپکے سے ایک لڑکی پسند کر لی اور ہمیں ہوا تک نہیں لگنے دی۔"

"وہ لڑکی اپنے باپ کو ڈیڈی نہیں کہتی ہے بلکہ ابو کہہ کر پکارتی ہے۔" میں نے سپاٹ آواز میں کہا۔ "وہ ایک غریب اور ریٹائرڈ سرکاری آدمی کی بیٹی ہے' نئی آبادی میں اسی گز کے پلاٹ پر بنے ہوئے ایک نامکمل بوسیدہ مکان میں رہتی ہے اور شاید اپنے ساتھ جہیز بھی نہیں لا سکتی۔"

صرف قمر میری بتائی ہوئی تفصیلات سن کر خوش ہوا تھا۔ امی جان کی پیشانی پر ٹیڑھی میڑھی لکیریں اور گہری ہو گئیں۔ آنکھیں غصے سے بھر گئیں اور چہرے پر کڑواہٹ پھیل گئی۔ ان کے رخساروں پر جسم کا سارا خون سمٹ آیا تھا۔ وہ کچھ کہنے کے لئے تڑپ رہی تھی' کوئی انجانا خوف انہیں چپ کئے ہوئے تھا۔

میری دونوں بہنوں کے چہروں کے تاثرات امی جان سے کسی طرح مختلف نہیں تھے لیکن مجھے ان لوگوں کی کب پروا تھی جو میں متزلزل ہو جاتا' میں اپنے دل کی بات کہہ کر اپنے آپ کو بے حد ہلکا اور پرسکون محسوس کرنے لگا تھا۔ سعیدہ نے بے چین ہو کر

پوچھا۔ "کیا وہ لڑکی ہمارے گھر کے لائق ہے؟"

"نہ صرف لائق ہے بلکہ اس جیسی سگھڑ اور سلیقہ شعار تو مجھے اپنے خاندان اور گھر میں کوئی دکھائی نہیں دیتا۔"

"تم پر کسی نے جادو کر دیا ہے۔" امی جان ایک دم پھٹ پڑی۔ "تم ایک غریب گھرانے میں جا کر پھنس رہے ہو۔ ہمیں دنیا کے ساتھ چلنا ہے۔ جانے وہ لڑکی کیسی شکل و صورت کی ہے جو تم نے پسند کر لی' ہم سے چھپا کر رکھا اس کے بارے میں بتایا تک نہیں۔"

میں نے مختصر طور پر رات کا واقعہ من و عن سنا کر کہا۔ "میں اگر شادی کروں گا تو اسی لڑکی سے' ورنہ زندگی بھر کنوارا رہوں گا یا اس لڑکی سے شادی کر کے اپنا گھر الگ بسا لوں گا۔"

میرے آخری جملے میں ایسی دھمکی تھی کہ سبھی دہل کر رہ گئے۔ امی جان گھبرا کے بولیں۔ "تمہاری پسند ہماری پسند' ہم بھی تو ایک نظر اسے دیکھ لیں۔"

"آپ لوگ آج سہ پہر ان کے گھر جا کر میرے لئے رشتہ مانگ لیں۔"

میں نے دفتر جاتے ہوئے قمر کو اپنے ساتھ لے لیا اور اس علاقے میں پہنچ کر' اسے دور سے بڑے میاں کا مکان دکھا دیا' قمر کو میں نے ناگن چورنگی پر اتارا اور اپنے دفتر کی راہ لی۔ دفتر پہنچا تو کسی کام میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ کنول کے نئے ڈرامے میں اس کی اداکاری اور حسن کی بے حجابی کے تذکرے بھی ہو رہے تھے' لیکن اب مجھے کنول سے کوئی دلچسپی بھی نہیں رہی تھی' میں نے اپنے دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ میری شادی کنول سے نہیں بلکہ مہ جبین سے ہو گی' میں چوروں کی طرح شادی نہیں کروں گا بلکہ باوقار اور شاندار طریقے پر یہ تقریب انجام پائے گی' اب میں کنول کی جانب سے جاؤں گا بھی نہیں' اس کے بارے میں سوچنا بھی ترک کر دوں گا' وہ لوگ آج میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ انتظار کر رہے ہیں تو کرنے دو' اگر کل پرسوں فخرو بھائی وجہ دریافت کرنے کیلئے دوڑے ہوئے اور پریشان آئیں گے تو میں انہیں سمجھا بجھا کر راضی کر لوں گا۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہو گا کہ فخرو بھائی اپنا کمیشن اور وہ لوگ حرجانہ مانگیں گے۔ جب کی جب دیکھی جائے گی۔

فائلوں اور کاغذ کی سطح پر مہ جبین کا سراپا ابر کی طرح لہرانے لگتا۔ اس کی بڑی بڑی

غزالی آنکھوں میں میرے لئے ایک پیغام ہوتا' میرے کانوں میں اس کی باتیں رسیلا نغمہ بن کے گونجتی رہتیں' میں اپنے آپ حیران سا تھا کہ مجھے کیا ہو گیا ہے؟ اور کیا ہوتا جا رہا ہے؟ آخر میں مہ جبین کے بارے میں اس قدر جذباتی اور سنجیدہ کیوں ہونے لگا ہوں؟

جب میں سہ پہر کو گھر پہنچا تو معلوم ہوا کہ قمر' امی جان اور بہنوں کو مہ جبین کے ہاں لے کر گیا ہوا ہے' جب وہ لوگ رات آٹھ بجے واپس آئے تو ان کے چہروں پر میں نے ایک دمک پھوٹتے ہوئے دیکھی' میرے دل میں ایک خدشہ بار بار ابھرا تھا کہ اگر مہ جبین کا رشتہ کہیں طے پا چکا ہوا تو میرے لئے راہیں مسدود ہو جائیں گی۔ اس صدمے کو سنے کا مجھ میں حوصلہ نہیں تھا۔ ویسے میں نے سوچ رکھا تھا کہ میں اس بات چیت میں کوئی بگاڑ پیدا کر کے اپنے لیے راہ ہموار کر لوں گا۔ اگر مہ جبین کی بات کہیں طے نہیں ہوئی تھی تو بڑے میاں کا مجھے اپنی فرزندی میں قبول کرنا ان کے لئے ایک خوش کن بات ہوتی۔ کیوں کہ میں ان کا محسن بھی تھا۔

"امی جان خود ہی کہنے لگیں۔۔۔" جب ہم ٹیکسی سے اس مکان کے سامنے اترے تو اس کی حالت دیکھ کر اندر جانے کو دل نہیں چاہا' مکان کی حالت اندر سے دیکھی عجیب سی گھبراہٹ ہونے لگی۔ "مہ جبین گھر پر موجود نہیں تھی۔ اس کے باپ نے بتایا کہ وہ کسی بیوٹی پارلر میں پارٹ ٹائم ملازمت کے سبب مغرب تک لوٹتی ہے' ہم نے اسے بغیر دیکھے ہی تمہارا رشتہ مانگا تو بڑے میاں خوش ہو گئے لیکن انہوں نے یہ عذر پیش کیا کہ جب تک وہ اپنے قریبی عزیزوں سے مشورہ نہ کر لیں اور تمہارے بارے میں پوری طرح چھان بین نہ کر لیں' اس وقت تک کوئی جواب نہیں دے سکتے۔"

جانے کیوں مجھے تاؤ آگیا۔ "وہ میرے بارے میں کیسی چھان بین کرنا چاہتے ہیں؟"

"اسی طرح جیسا زمانے کا دستور ہے۔" امی نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "ہر باپ اپنی بیٹی کے بارے میں پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہے۔"

"آپ بالکل فکر مند نہ ہوں بھائی جان۔" سعیدہ نے مجھے تسلی دی۔ "انہیں آپ جیسا شہزادہ کہاں ملے گا؟"

میں ان لوگوں کی باتوں سے اکتا کر اپنے مطلب کی طرف آیا اور پوچھا۔ آخر انہوں نے جواب دینے کے لئے کب بلایا ہے؟"

"پندرہ دن کے بعد۔"

"پندرہ دنوں بعد!" میرا پارہ چڑھ گیا۔ "کیا وہ میری پیدائش سے لے کر جوانی کے آغاز تک کے واقعات کا کھوج لگائیں گے؟"

میرے دل میں ایک کھٹکا سا ہوا۔ اگر انہیں میرے گھناؤنے ماضی اور کرتوتوں کے بارے میں معلوم ہو گیا تو وہ شخص نہ صرف مجھ سے نفرت کرنے لگ جائے گا بلکہ اس کی بیٹی بھی مجھ سے متنفر ہو جائے گی' میرا احسان بھی دھل کر رہ جائے گا لیکن میں نے اپنے دل کو تسلی دی کہ بڑے میاں کبھی ان حدوں تک نہیں پہنچ سکتے' آخر ایسا کون سا شخص انہیں ملے گا جو میرے بارے میں تفصیل سے بتائے گا۔ میں یہ سب کچھ سوچ کر ایک طرح سے مطمئن ہو گیا۔

دوسرے دن سویرے سویرے فخرو بھائی میرے گھر پر آ دھمکے' جب میں انہیں لے کر ایک ریستوران میں پہنچا تو فخرو بھائی مجھ سے لپٹ پڑے۔ "ارے او فرید بھائی۔ یہ تم نے کیا غضب کیا؟ میں کنول اور اس کی ماں کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا۔ ہم رات گیارہ بجے تک تمہارا انتظار کرتے رہے۔ کنول اور آنٹی نے بار بار مجھ سے کہا اور طعنے دیتے رہے کہ تمہارا آدمی جھوٹا اور مکار نکلا' ہمیں فریب دینے کی کیا ضرورت تھی۔ میں نے انہیں بڑی مشکل سے سمجھا کر ٹھنڈا کیا ہے۔ تم ابھی اور اسی وقت چلو تاکہ میری عزت رہ جائے۔"

میں نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے۔ میں کنول سے شادی نہیں کر سکتا ہوں۔" فخرو بھائی سٹ پٹا گئے۔ "یہ تم کیا کہہ رہے ہو فرید بھائی؟"

"میرے سر سے کنول کا بھوت اتر گیا ہے۔"

"یہ میں کیا سن رہا ہوں؟" فخرو بھائی نے اپنا سر پکڑ لیا۔"

میں آپ کو کوئی ترانہ نہیں سنا رہا ہوں بلکہ یہ بتا رہا ہوں کہ میں ان لوگوں کے ہاتھوں کھلونا نہیں بن سکتا' میرا لہجہ سخت ہو گیا تھا۔" خدا نے مجھے بچا لیا' اب میرے مقدر میں ایک دوسری حسین لڑکی لکھ دی گئی ہے' فخرو بھائی اگر آپ نے ایک بار بھی دیکھ لیا تا تو اس کی شکل مرتے دم تک آپ کی آنکھوں میں گھومتی رہے گی۔" میں نے بڑی تفصیل سے اس واقعے اور مہ جبین کے بارے میں بتا دیا۔

فخرو بھائی پر میرے اس کارنامے کی تفصیل اور مہ جبین کے حسن کا ذکر کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ کسی اور خیال کے تحت پریشان ہو کر بولے۔ "فرید بھائی تم نے اپنے سر ایک بڑی مصیبت مول لے لی ہے۔ وہ تمہیں بخشیں گے نہیں؟"

"کیوں؟" میں نے بے پروائی سے کندھے اچکا کر پوچھا اور مجھے غصہ آ گیا۔ "کیا میں نے ان کے گھر پر ڈاکا ڈالا ہے؟ کیا میں نے کنول کو اس روز دل کھول کر نوازا نہیں؟"

"میں مانتا ہوں اور ان دونوں کو بھی اس بات کا احساس ہے کہ تم نے بڑی دریا دلی کا مظاہرہ کیا تھا۔" فخرو بھائی مضطرب ہو گئے۔ "لیکن یہ بھی تو سوچو کہ تم نے شادی کا چارا ڈال کر اپنی غرض پوری کر لی اور شادی کا وعدہ کر کے عین وقت پر نہیں پہنچے۔ تمہاری اسی حرکت نے آنٹی کو چراغ پا کر دیا ہے۔ انہیں اس بات کا صدمہ ہے کہ پچیس ہزار روپے کی رقم بھی گئی اور وہ ماہانہ ہزاروں روپے کی آمدنی سے بھی محروم ہو گئیں۔ شاید تم بھی جانتے ہو کہ جب ایک شکاری اپنے شکار کو پھانسنے کے لئے چارا ڈالتا ہے تو اپنے شکار کو بھاگنے نہیں دیتا۔ اسے ہر قیمت پر شکار کر لیتا ہے؟"

"آنٹی کو۔۔۔۔ کنول کی بھری جوانی کے بڑے بڑے قدر داں مسل جائیں گے۔" میں نے بپھر کے جواب دیا۔ کراچی شہر میں سینکڑوں لوگوں کے پاس اس قدر کالا دھن ہے کہ وہ اس سے کنول کو نہلا سکتے ہیں۔"

"تم نے ایک طرح سے ان کی بے عزتی کی ہے اور آنٹی یہ برداشت نہیں کریں گی۔"

"کیا وہ لوگ اپنے آپ کو عزت دار بھی سمجھتے ہیں؟" میں بے اختیار ہنس پڑا۔

فخرو بھائی جو بے حد سنجیدہ ہو گئے تھے ان کی آنکھوں میں خوف جھلکنے لگا۔ "تم جو بھی سمجھو' لیکن وہ لوگ بظاہر جو نظر آتے ہیں اندر سے انتہائی گھٹیا اور خطرناک ہیں' پالتو غنڈے اور بدمعاش سائے کی طرح ان کے ساتھ رہتے ہیں اور ان کے ایک ہلکے سے اشارے کے منتظر رہتے ہیں۔"

میں نے طیش میں آ کر پوچھا۔ "کیا آپ مجھے آنٹی کی طرف سے دھمکانے آئے ہیں۔"

"آنٹی ہر قیمت پر تمہیں کنول کا شوہر دیکھنا چاہتی ہیں۔" فخرو بھائی کے ہونٹوں پر

ایک بے معنی مسکراہٹ ابھری۔ "کنول تم پر بری طرح مرمٹ چکی ہے' وہ تمہارے فراق میں تڑپ تڑپ کر رو رہی ہے۔ اس نے مجھ سے کہا بھی تھا کہ میں فرید کو نہ صرف اپنا تن بلکہ اپنی روح بھی دے چکی ہوں' میں اس کے بغیر ایک پل بھی نہیں رہ سکتی۔"

"یہ کون سے ڈرامے کے ڈائیلاگ تھے جو کنول نے آپ کو فرفر سنا دیے۔" میں مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا۔ "اسے میری جیب سے بہت زیادہ محبت ہو گئی ہے' لیکن آپ میرا فیصلہ بھی سن لیں' میں اپنی غرض کی پوری قیمت ادا کر کے آیا ہوں۔ شادی سے اس لئے تائب ہو گیا کہ وہ ایک بازاری عورت ہے' میں ان دھمکیوں میں آنے والا نہیں ہوں۔ آنٹی کو صاف صاف سنا دیں۔ رہا آپ کا کمیشن۔ یہ لیں۔۔۔" میں نے جیب سے اپنا پرس نکال کر سو سو کے دو نوٹ نکال کر ان کی طرف بڑھا دیے۔ "آئندہ آپ آنٹی اور کنول کا کوئی پیغام لے کر میرے پاس نہ آئیں۔"

فخرو بھائی نے میرے ہاتھ سے نوٹ لپک لینے میں کوئی تکلف نہیں کیا' نوٹ لے کر اپنی پتلون کی اندرونی جیب میں رکھتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ "تمہیں سمجھانا اپنا فرض تھا۔ سو میں نے پورا کر دیا' میری پوزیشن بھی بڑی نازک ہو گئی ہے پر تم میری پروا نہ کرو لیکن اپنی فکر کرنا' وہ تمہیں آسانی سے نہیں چھوڑیں گے؟"

میں کوئی دو چار دن' آنٹی کی جانب سے کسی بھی انجانے خوف سے کسی حد تک خائف سا رہا' میں نے اپنے آپ کو حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار کر لیا تھا۔ اگرچہ مہ جبین سے رشتے کی بات چیت نہ چل رہی ہوتی تو میں کنول سے ہرگز دغا نہ کرتا لیکن میں اب کنول سے محض اس لئے پریشان ہو گیا تھا کہ ان کی جانب سے کوئی ایسی کارروائی ہو اور اس کی بھنک بڑے میاں کے کان میں پہنچے تو ساری بات الٹ کر رہ جائے گی۔

پندرہ دن بغیر کسی ہنگامے کے گزر گئے۔ ان پندرہ دنوں میں' میں' مہ جبین کے لئے بڑا ہی بے چین رہا' میری آنکھیں اسے دیکھنے کے لئے ترسی رہتیں مجھے اس بیوٹی پارلر کا نام پتا بھی نہیں معلوم تھا جہاں مہ جبین ملازمت کر رہی تھی ورنہ میں کسی راستے میں چھپ کر اس پری چہرہ کے جمال سے اپنی آنکھوں کو سیراب کر لیتا' میں ایک دو مرتبہ اس علاقے سے دانستہ گزرا بھی لیکن مہ جبین کا پیکر کہیں دکھائی نہیں دیا' میں اپنے دل پر صبر کی سل رکھ کے ہر بار ناکام و نامراد لوٹ آیا۔

*

امی جان اور میری بہنیں بھی بڑے میاں سے عندیہ بھی معلوم کرنے کے لئے بے چین تھیں' وہ سولہویں دن' چھوٹا سا قافلہ لے کر مہ جبین کے ہاں جا پہنچیں' واپس آئیں تو ان کے چہرے کا رنگ اڑا ہوا تھا۔ جب میں نے گھبرا کر وجہ پوچھی تو انہوں نے سب سے پہلے قمر اور بہنوں کو کمرے سے باہر نکال دیا اور افسردگی سے کہنے لگیں۔ "جب ہم لوگ ان کے ہاں پہنچے تو بڑے میاں نے بڑی سرد مہری سے استقبال کیا میں اپنے مطلب کی بات زبان پر لائی تو بڑے میاں نے بڑے تاسف سے کہا۔ "بہن اگر تمہارے بیٹے کا مجھ پر اتنا بڑا احسان نہیں ہوتا تو یقین مانو میں تمہیں اس گھر کی چوکھٹ بھی پار کرنے نہیں دیتا' مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ کا بیٹا کس قماش کا ہے؟ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میرا عظیم محسن اس قدر برا آدمی نکلے گا۔ میں نے جہاں جہاں جا کر فرید کے بارے میں پوچھا اس سے میرے دل کو بڑی ٹھیس پہنچی ہے۔ فرید بڑی بے رحمی سے روزانہ سینکڑوں روپے رشوت کے طور پر وصول کرتا ہے' اس ایک برائی نے اس کے اندر جہان بھر کی برائیاں پیدا کر دی ہیں۔ کون سی ایسی برائی تھی جسے اس نے اپنایا نہیں؟ کیا ایسے لڑکے کا رشتہ آپ کی بیٹی کے لئے آئے گا تو آپ قبول کر لیں گی؟

امی جان خاموش ہوئیں تو میں شرم کے مارے زمین میں گڑ گیا۔

سوچنے لگا کہ بڑے میاں نے میرے بارے میں یہ سب کچھ کیسے اور کہاں سے معلوم کر لیا۔ میری حیرانی لمحہ بہ لمحہ بڑھنے لگی۔ وہ ایک دن کے لئے کبھی میرے دفتر آکر نہیں جھانکے' اگر محلے میں آکر میرے بارے میں دریافت کرتے تو اس کی ہوا مل جاتی' میں نڈھال ہو کر رہ گیا۔ میری نگاہ میں اتنی تاب نہیں رہی تھی کہ امی جان کی طرف دیکھوں۔

میں پھر بھی نہیں ہارا۔ "امی جان بولیں۔" میں نے انہیں سمجھایا کہ نوجوانی میں بن باپ کے بچے بگڑ جاتے ہیں۔ میرا بچہ بھی بگڑ گیا تھا لیکن اب اس نے ایک ایسی عمر میں قدم رکھ دیا ہے جہاں اسے اچھے برے کی تمیز ہو گئی ہے۔ کسی بھی مرد کی اس کے کردار کی ضمانت نہیں دی جا سکتی ہے' ایک نیک سیرت لڑکا شادی کے بعد بھی بگڑ سکتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں ایسی ایک نہیں بہت ساری مثالیں ملیں گی۔ آپ اس سے انکار نہیں کر سکتے۔ میری باتیں کسی حد تک بڑے میاں کی سمجھ میں آگئی تھیں' وہ بڑی دیر تک گہری سوچ میں غرق رہے' کچھ دیر بعد بولے۔ "میری بیٹی بہ ظاہر جس قدر خوب صورت ہے'

باطنی طور پر اس سے کہیں زیادہ ہے۔ جب آپ اس کی ذہانت اور شخصیت کو قریب سے جانیں اور پرکھیں گی تب اس کی قدر و قیمت کا احساس ہو گا۔ ایک نادر اور نایاب ہیرا ہے' میں اپنی بیٹی کو ضرورت سے زیادہ چاہتا ہوں۔ میں اس پر اپنی کوئی مرضی مسلط کرنا نہیں چاہتا' اس لئے کہ اسے اپنی زندگی خود گزارنا ہے۔ لہٰذا مجھے کچھ اور دنوں کی مہلت دیں تاکہ میں کسی دن اس کی ماں بن کر اس کی رائے معلوم کر سکوں۔" میں بڑے میاں سے پندرہ دنوں کے بعد دوبارہ آنے کا کہہ کر آ گئی۔"

میرے ذہن پر ہتھوڑے بجنے لگے۔ بڑے میاں نے بڑی خوبصورتی اور صفائی لیکن بے رحمی سے مجھے اپنی بیٹی کا رشتہ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ انہوں نے فی الحقیقت اپنے تئیں یہی سمجھا کہ یہ احسان فراموشی نہیں ہوئی ہے' لیکن میرے نزدیک یہ کھلی احسان فراموشی تھی۔ اس روز میں انہیں ان بدمعاشوں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر چلا جاتا تو ان کی لاش قبر میں کیڑے مکوڑوں کی نظر ہو کر رہ جاتی' ان کی بیٹی بے سرو سامانی کی حالت میں جانے کس شخص کے ہتھے چڑھ جاتی۔ میرا خون کھول رہا تھا۔ میں غصے میں آپے سے باہر ہونے لگا تو امی جان مجھے جھوٹی تسلیاں دے کر غصہ رفع کرنے کی کوشش کرنے لگیں۔

میں کوئی بچہ نہیں تھا کہ بڑے میاں کی چال نہ سمجھتا' انہوں نے میری امی سے مزید پندرہ دنوں کی مہلت اس لئے مانگی تھی کہ اس عرصے میں وہ واقعہ اور میرے احسان ایک بھولا بسرا قصہ بن کر رہ جائے گا۔ اس کا اثر زائل ہونے میں دیر کیا لگتی ہے۔ جب میری امی پندرہ دنوں کے بعد جائیں گی تو وہ اپنی بیٹی کی رائے کی آڑ لے کر بڑی آسانی سے رشتہ دینے سے انکار کر دیں گے۔

میرے ذہن کے ایوان میں جانے کہاں سے کنول آ کھڑی ہوئی گو کہ آنٹی سے میری بات بگڑ گئی تھی۔ روپے کا لالچ پھر سے بگڑی ہوئی بات بنا سکتا تھا لیکن میں نے بڑی سفاکی سے کنول کا خیال ذہن سے جھٹک دیا۔ میں مہ جبین کی ذات کو پانے کے لئے اتنی دور نکل آیا تھا کہ واپسی کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

میں رات چھت پر جا کر چارپائی پر لیٹ گیا۔ میں نے بڑی سنجیدگی سے حالات کا جائزہ لیا۔ تمہیں بڑے میاں نے بڑی شرافت سے دھتکار دیا ہے۔ تمہارے اپنے کارناموں کی ساری کالک تمہارے چہرے پر اس طرح تھوپ دی ہے کہ تمہاری امی جان اگر عقل

مند ہوں تو مہ جبین کا رشتہ مانگنے سے باز رہ سکیں۔ اگر بے حیا بن کر چلی بھی گئیں تو اس عرصے میں تمہارے بارے میں کوئی ایسی خبر سن لیں گے کہ تم اپنی ماں کو بھی اپنا چہرہ دکھانے کے قابل نہیں رہو گے۔ اگر تم ہاتھ دھو کر مہ جبین کے پیچھے پڑ گئے تو بڑے میاں اپنی بیٹی کے ہاتھ جلدی سے پیلے کر دیں گے اور تم منہ تکتے رہ جاؤ گے۔ اس وحشت ناک تصور ہی سے میری رگ رگ میں خون ابلنے لگا' کنپٹیاں دہک اٹھیں۔ کیا میں سنتا اور کہنا پسند کروں گا کہ مہ جبین کسی اور کی ہو گئی ہے؟ میں نے اپنے دل کو ٹٹولا۔ میرے من کے ہر گوشے میں ایک باغیانہ لہر گونج اٹھی۔ نہیں۔ ہرگز نہیں۔ مہ جبین میری ہے۔ صرف میری ہے۔ میں اس کی ذات کو کسی دوسرے کی بستر کی زینت بنتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔ تب مجھے کیا کرنا ہو گا؟ میں نے خود ہی اپنے دل سے پوچھا۔ جواب ملا۔ اس احسان فراموش اور سنگ دل بڑے میاں سے اب کوئی امید اور توقع رکھنا فضول ہے۔ جو تمہیں بھلائی کا بدلہ اچھائی سے نہیں دے سکتا۔ اس کی جان لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ بڈھے کو قتل کرنا ہو گا۔ بڈھے کی موت میری راہ کو آسان بنا دے گی۔ یہ کام جلد سے جلد ہونا چاہئے۔ اگر اس بڈھے نے اپنی بیٹی کو میرے بارے میں سب کچھ بتا دیا تو میں وہیں کا وہیں رہ جاؤں گا۔

بڑے میاں کو قتل کرنا کچھ مشکل نہیں تھا۔ مہ جبین دن کے بارہ بجے اپنے گھر سے بیوٹی پارلر جانے کے لئے نکلتی تھی اور مغرب کے فوراً بعد لوٹتی تھی۔ پانچ چھ گھنٹے کا درمیانی عرصہ' جس میں بڑے میاں گھر میں اکیلے ہی ہوتے تھے' دوپہر کے وقت وہ کھانا کھا کر گہری نیند سو جاتے ہوں گے۔ گرمیوں میں دوپہر کی نیند ویسے بھی گہری ہوتی ہے۔ میں اس وقت سے فائدہ اٹھا کر ان کا کام آسانی سے تمام کر سکتا تھا۔ مہ جبین کو حاصل کرنے کی میرے لئے کوئی اور صورت نہیں تھی۔ میں نے قتل کے منصوبے کا از سر نو دوبارہ جائزہ لیا۔ جب اسے ہر طرح سے مکمل اور بھرپور پایا تو میں مطمئن ہو گیا اور مجھے گہری نیند آ گئی۔

صبح جب میں اٹھا تو مجھے سب سے پہلے بڑے میاں کو قتل کرنے کا ہی خیال آیا۔ میں ان کے قتل کا مصمم ارادہ کر چکا تھا اور آج ہی یہ کار خیر انجام دینا چاہتا تھا۔ میں جب تیار ہو کر اسکوٹر پر گھر سے باہر نکلا تو گلی کے نکڑ پر فخرو بھائی آٹو رکشا میں میرے گھر کی جانب جا رہے تھے۔ مجھ پر جیسے ہی نگاہ پڑی' انہوں نے رکشا رکوا لیا۔ مجھے ان کی آمد بڑی

ناگوار لگی اور بے حد غصہ بھی آیا۔ میں نے انہیں منع کر رکھا تھا۔ میں اسکوٹر روک کے ان کا انتظار کرنے لگا۔ وہ رکشا والے کو پیسے دے رہے تھے' ادھر میں نے بھی دل میں ٹھان لی تھی کہ ان کی ایسی خبرلوں گا وہ زندگی بھر یاد رکھیں گے۔

فخرو بھائی رکشا والے کو کرایہ دے کر میری طرف بڑھے تو میں ان کا چہرہ دیکھ کر چونکا' ان کے چہرے پر بارہ بج رہے تھے' وہ جیسے اپنے حواس میں نہیں تھے' فخرو بھائی نے میرے قریب پہنچ کر لرزیدگی سے کہا۔ "فرید بھائی بڑا غضب ہو گیا۔ مم۔۔۔ مم۔۔۔ سوچ بھی نہیں سکتا تھا؟"

"کیا ہو گیا؟" میں نے گھبرا کر حیرت سے پوچھا۔ "کیا آنٹی مجھے یا آپ کو کسی پھڈے میں پھنسوا رہی ہے؟"

"آپ کسی جگہ چلیں تو بتاؤں۔۔۔ یہاں نہیں بتا سکتا۔۔۔۔۔ بہت بری خبر ہے۔"

"کیا میرے لئے بری خبر لائے ہو؟"

"ہاں ہاں!" فخرو بھائی اپنے منتشر حواس پر قابو پاتے ہوئے بولے۔ "ہمارے لئے ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔"

فخرو بھائی میری اسکوٹر کی پچھلی نشست پر بیٹھ گئے' اپنے دونوں ہاتھ میرے کندھے پر رکھ کے بولے۔ "بچوں جیسی باتیں مت کرو' اسکوٹر چلاؤ' کسی ہوٹل یا پارک میں چلو۔"

فخرو بھائی سے بحث و مباحثہ فضول تھا۔ میں انہیں اسکوٹر پر اپنے ساتھ لے کر تیزی سے نکل پڑا۔ بہت کچھ سوچنے کے باوجود میں کسی نتیجے پر پہنچ کر یہ اندازہ نہیں لگا سکا کہ وہ بری خبر کیا ہو سکتی ہے؟ یہ تو سمجھ میں آ گیا تھا کہ اس بری خبر کی پشت پر آنٹی ہے۔ آنٹی نے مجھ سے آخرکار میرے مکر جانے پر ایسی کوئی حسرت پوری کر لی تھی۔ اس عورت نے میرے لئے کون سا جال بچھایا ہے۔ میں آنٹی کی پس پردہ کارستانیوں سے بے خبر تھا۔ میں تو مہ جبین کو پانے کی جستجو میں ایسا گم ہوا کہ کنول کو یکسر فراموش کر بیٹھا۔ رفتہ رفتہ میرے ذہن سے فخرو بھائی کا وہ اشارہ بھی غبارے کی ہوا کی طرح نکل گیا جو انہوں نے آنٹی کے گھناؤنے کردار کی جانب کیا تھا۔ آج اس چہرے پر سے نقاب اٹھ کر مکروہ چہرہ سامنے آنے والا تھا۔ میرے ذہن میں ایک ہل چل سی مچی ہوئی تھی کہ آخر اس عورت نے میری راہ میں کیا رکاوٹ کھڑی کی ہے؟

ناظم آباد میں ایک ریستوران کے پرسکون گوشے میں ہم دونوں کسی قدر منتشر اور مضطرب سے ہو کر جا بیٹھے' صبح کا وقت تھا اس وقت یہ ریستوران کھلا تھا اور ہال خالی تھا۔ اس ریستوران کے اندر قدم رکھنے والے ہم پہلے گاہک تھے۔ ہمارے بیٹھتے ہی بیرا سر پر آ پہنچا' میں نے ناشتے اور چائے کا آرڈر دیا ناشتہ فخرو بھائی کے لئے منگوایا گیا تھا۔

کرسی پر بیٹھتے ہی فخرو بھائی نے سب سے پہلے پانی منگوایا' جب پانی آیا تو وہ گلاس پر اس طرح جھپٹ پڑے جیسے وہ تپتے ہوئے صحرا میں کئی دن پیاسے رہ کر آئے ہوں۔ وہ پانی کا گلاس ایک ہی سانس میں غٹاغٹ چڑھا گئے۔' اس پانی نے ان کے حلق میں اتر کر کسی امرت کا کام کیا۔ ان کے اعصاب بڑی حد تک معمول پر آ گئے تھے لیکن اس بشرے پر خوف ابھرا ہوا تھا۔ میری حالت طرح طرح کے اندیشوں کے باعث ہر لحہ غیر ہوتی جا رہی تھی۔ فخرو بھائی کی نگاہ اٹھی اور جھک گئی۔ وہ ٹھہر ٹھہر کے ندامت سے بولے۔ "آنٹی نے مہ جبین کو اغوا کروا دیا ہے؟"

مجھے اس لمحے یوں محسوس ہوا کہ میں جس میز پر بیٹھا ہوا ہوں اس کے نیچے کوئی بم چھپا ہوا تھا جو اچانک ایک دھماکے سے پھٹ پڑا ہے۔ میرے پرخچے اڑ گئے ہیں اور اب بلندیوں تک جا کر نیچے کی جانب تیزی سے گرتے چلے آ رہے ہیں۔ میرا دماغ ایسا چکرایا کہ مجھے فخرو بھائی اپنی کرسی سمیت چکر کھاتے ہوئے نظر آئے' جب میرے چکر تھمے تو میں نے فخرو بھائی کا فق چہرہ دیکھا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں فخرو بھائی کے ساتھ کیا سلوک کروں' کیوں کہ وہ اس سارے فساد کی جڑ تھے۔ اس روز جو میں نے فخرو بھائی کو اپنا ہمدرد سمجھ کر مہ جبین کے بارے میں بتایا تھا وہ میری حماقت اور نادانی تھی۔ لیکن اب کیا کیا جا سکتا تھا۔ تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ فخرو بھائی کی قسمت اچھی تھی کہ ہم ریستوران میں بیٹھے ہوئے تھے۔ میں یہاں تماشہ بننا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے جانتے بوجھتے' خون کا گھونٹ پی کر تیز و تند لہجے میں ان سے پوچھا۔ "آنٹی نے مہ جبین کو کس مقصد کے لئے اغوا کیا ہے؟ مجھے فوراً ہی اپنے احمقانہ سوال کا احساس ہوا۔ میں فخرو بھائی کی زبان کھلنے سے پہلے ہی پھنکارا۔ "آنٹی کو مہ جبین کے بارے میں بتانے والا شخص آپ کے سوا اور کون ہو سکتا ہے؟"

فخرو بھائی نے اعتراف جرم کے انداز میں خجالت سے اپنا سر جھکا لیا اور چند ثانیوں

تک کسی ذہنی کشمکش میں الجھے رہے' پھر اپنا جھکا ہوا سر اوپر اٹھا کر رندھی ہوئی آواز میں بولے۔ فرید بھائی۔ "خدا کے لئے مجھے معاف کر دینا۔ میں تمہارا مجرم ہوں' تم جو سزا دو گے میں اسے قبول کروں گا' میں اس کمینی عورت کے فریب میں آ گیا' اس عورت نے تمہارے اچانک انکار کا پس منظر معلوم کرنے کی بہت کوشش کی' مجھے بڑے سے بڑا لالچ دیا گیا لیکن میں ٹال مٹول سے کام لیتا رہا' اس مکار عورت نے آخری حربہ کنول کا آزمایا۔ کنول نے جب میرے سامنے دستر خوان چن دیا تو میرا دل اور زبان باغی ہو گئے۔"

میں نے اپنا سر پیٹ لیا اور کتنی ہی دیر تک اپنے کھولتے دماغ کو قابو کرنے میں مصروف ہو گیا۔ فخرو بھائی کو لعن طعن کرنے سے اب کچھ حاصل نہیں تھا۔ میں جانتا تھا کہ مہ جبین کو اغوا کرنے کے بعد اس کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا۔ آنٹی کے پاس ایسے مردوں کی کمی نہیں ہے جو مہ جبیں پر وحشی درندے بن کر جھپٹ پڑیں گے۔ اس دہشت ناک تصور سے میری رگ رگ میں لہو ابلنے لگا۔ کوئی چیز بڑی بے رحمی سے میرے دل کو نچوڑنے لگی تھی۔ میرا پارہ چڑھ گیا تھا۔ میں نے درشت لہجے میں فخرو بھائی سے پوچھا۔

"اس غریب مہ جبین نے اس حرافہ کا کیا بگاڑا تھا جو اسے اغوا کر لیا گیا ہے؟"

"آنٹی نے اس روز کا انتقام تم سے لیا ہے۔" فخرو بھائی نے سرسراتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"آخر کنول مجھ سے شادی کرنے پر کس لئے تلی ہوئی تھی؟" میں نے اپنے غصے کو دباتے ہوئے پوچھا۔ "کیا مجھ سے شادی کرنے میں کوئی راز پوشیدہ تھا۔"

"ہاں!" فخرو بھائی اپنا سر ہلا کر رہ گئے۔

"کیسا راز۔" میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ میں نے متعجب ہو کر کہا۔ "کیا مجھ سے وہ شادی کر کے کوئی بہت بڑا ہاتھ مارنا چاہتی تھی۔"

"تم ٹھیک سمجھے فرید بھائی۔"

"تفصیل بتاؤ کہ اصل ماجرا کیا ہے؟" میں نے فرید بھائی کو گھورا۔ "میں اسی صورت میں آپ کو معاف کر سکتا ہوں۔"

"میں آپ کو سب کچھ بتانے کے لئے ہی یہاں لے کر آیا ہوں۔" فخرو بھائی اپنی پیشانی پر ابھرتے ہوئے پسینے کی بوندیں پونچھتے ہوئے کہنے لگے۔ "کنول کا ماموں اس کلب کا

کرتا دھرتا ہے' جس کے زیر اہتمام یہ اسٹیج ڈرامے کھیلے جاتے ہیں' اس نے کوئی دو سال سے کسی ایک ڈرامے کی ابھی آمدنی کا انکم ٹیکس نہیں دیا ہے' اس نے کوئی ڈیڑھ سال تک کھیلے گئے ڈراموں کو نقصان میں دکھایا تھا' لیکن کنول نے جب سے ان ڈراموں میں حصہ لینا شروع کیا اس کے اسٹیج بڑی کامیابی سے چل کر بے اندازہ دولت کما رہے ہیں۔ انکم ٹیکس کے محکمے میں کسی شخص سے تکرار ہو گئی۔ لاکھوں روپے کی ادائیگی کا نوٹس جاری کر دیا گیا۔ آنٹی کی سمجھ میں یہی آیا کہ کسی انکم ٹیکس کے محکمے والے کو پھانسا جائے' میں نے تمہارا تذکرہ کیا تو آنٹی بہت خوش ہوئیں وہ تم سے اس شادی کے بہانے فائلیں پار کروانا چاہتی تھیں تاکہ کیس دب جائے۔ میں تمہاری تلاش میں نکل رہا تھا کہ تم اتفاق سے ہال کے باہر ٹکرا گئے' لیکن تم نے آخری وقت پر آنٹی کو دغا دے دیا۔ اس بات نے آنٹی کو مشتعل کر دیا۔ ورنہ ان لوگوں کے نزدیک تم کس کھیت کی مولی ہو۔ بڑے بڑے لوگ ان کے در پر منہ کالا کر کے جاتے ہیں۔"

"آنٹی کی میں کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ "جو کچھ ہوا وہ میرے حق میں بہتر ہوا' لیکن میں جلد سے جلد مہ جبین کی بازیابی چاہتا ہوں۔ اگر آنٹی نے اسے ہاتھ لگایا تو میں ان سب کا خون پی جاؤں گا۔ کنول کا چہرہ ایسا بگاڑ دوں گا کہ کوئی اس کی صورت دیکھنا بھی پسند نہیں کرے گا۔ کیا آپ میری مدد کریں گے؟

"میں تمہارا دوست ہوں اور دوست ہی رہوں گا۔" فخرو بھائی کے لہجے میں خلوص تھا۔

فخرو بھائی! کیا آپ مجھے یہ بتا سکتے ہیں کہ مہ جبین کو کب' کس وقت اور کہاں سے اغوا کیا گیا ہے؟" میں نے مضطرب ہو کر پوچھا۔

فخرو بھائی کہنے لگے۔ "مجھے آنٹی کے ایک قریبی ملازم نے جو میرے بھروسے کا ہے' بتایا تھا کہ آنٹی نے اپنی ایک سہیلی پری خانم سے مل کر مہ جبین کو اغوا کرنے کا منصوبہ بنایا اور اسی پری خانم نے مہ جبین کو بڑی آسانی سے اغوا کر لیا' لیکن اس واردات میں جبرو زبردستی کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی' پری خانم اپنے منصوبے کے مطابق مہ جبین کی دکان پر پہنچی۔ گھر میں دلہن سنوارنے کی غرض سے مہ جبین کو اپنے ساتھ لیا تو ایک اور عورت بھی آئی تھی۔ پری زاد خانم نے اس عورت کو کسی بہانے راستے میں اتار دیا' وہ مہ جبین کو

اپنی کوٹھی میں لے کر پہنچی اور اسے ایک کمرے میں قید کر رکھا ہے۔ آنٹی کسی اسکینڈل کے خوف کے باعث منظر عام پر آنا نہیں چاہتی ہے۔ پری زاد خانم نے جب سے مہ جبین کو دیکھا ہے اس کے منہ میں پانی بھر آیا ہے۔ وہ مہ جبین کے لئے بڑے سے بڑا گاہک تلاش کر رہی ہے۔"

"کیا آپ مجھے اس کوٹھی کا پتا بتا سکتے ہیں؟" میں نے تڑپ کر پوچھا۔

"وہ کوٹھی ڈیفنس میں ہے۔" فخرو بھائی نے جواب دیا۔ "میں اس کوٹھی تک پہنچا سکتا ہوں کیا تم مہ جبین کی بازیابی کے لئے پولیس کی مدد حاصل کرو گے؟"

"نہیں۔" میں نے میز پر مکا مارتے ہوئے کہا۔ "میں اپنے بازوؤں کی مدد سے مہ جبین کو رہا کراؤں گا۔ میں اس کے لئے اپنی جان تک قربان کر سکتا ہوں۔"

"نہیں۔۔۔۔ نہیں۔۔۔" فخرو بھائی گھبرا گئے۔ کوئی حماقت مت کرنا' تم پری زاد خانم کو نہیں جانتے' وہ آنٹی سے کہیں خطرناک عورت ہے۔ اس پر پولیس بھی ہاتھ تک ڈالنے کی جرات نہیں کر سکتی ہے۔ میری رائے میں تم قانون کی مدد حاصل کرو۔" فخرو بھائی نے مشورہ دیا۔ "سانپ بھی مرجائے گا اور لاٹھی بھی نہیں ٹوٹے گی۔"

"لیکن مہ جبین کا کیس اخبارات کی زینت بن جائے گا۔" میں نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔ "میں نہیں چاہتا کہ اس کے حسن کے چرچے اس قدر عام ہو جائیں کہ اس غریب کا گھر سے نکلنا محال ہو جائے۔"

"تمہارا خیال درست ہے۔" فخرو بھائی نے میری تائید کی۔ "تم اس کی بازیابی کے لئے کوئی اور راستہ نکالو' تم اپنی ٹانگ نہیں اڑانا ورنہ مہ جبین یہ سمجھے گی کہ۔۔۔ اس اغوا کے ڈرامے میں تم بھی شامل ہو؟"

میں فخرو بھائی کی بات سمجھ کر اپنی جگہ سے اچھل پڑا' میں نے اس پہلو پر تو سوچا ہی نہیں تھا مہ جبین مجھے اس واقعے میں ملوث پا کر صرف ایک ہی سوال پوچھے گی۔ "فرید صاحب۔۔۔ آپ کے علم میں یہ بات کیسے آئی کہ مجھے اغوا کر لیا گیا ہے اور آپ میری بازیابی کے لئے اس مقام تک کیسے پہنچ گئے؟" میرے پاس واقعی ان سوالوں کا جواب نہیں ہو سکتا تھا۔ میں اپنے دل میں فخرو بھائی کی ذہانت کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکا۔

فخرو بھائی نے اپنے کوٹ کی اندرونی جیب سے ایک لفافہ نکال کر میری طرف بڑھایا۔

"میں اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے' آنٹی' کنول اور اس کے ماموں کو قانون کے حوالے کرنے کی غرض سے یہ کاغذات چرا کر لایا ہوں' ان کاغذات کی مدد سے یہ لوگ قومی دولت کی چوری کرنے کے الزام میں گرفتار ہو سکتے ہیں۔"

میں نے لفافہ میں سے تمام کاغذات نکال کر ان کا سرسری سا جائزہ لیا۔ میں ان پر پوری طرح توجہ نہیں دے سکا۔ میرا سارا دھیان مہ جبین کی طرف تھا جو کسی درندے کا نشانہ بننے جانے والی تھی۔ وہ کاغذات فی الحقیقت بے حد اہم تھے اور ان تینوں کی پریشانی کا جواب بن سکتے تھے۔ میں نے ان کاغذات کو لفافے میں واپس رکھتے ہوئے کہا۔ "فخرو بھائی مجھے سب سے پہلے تم وہ کوٹھی لے جا کر دکھا دو۔ پھر میں جو مناسب سمجھوں گا وہ کر لوں گا اور یہ کاغذات بھی متعلقہ حکام تک پہنچا دوں گا۔"

جب میں نے فخرو بھائی کے ساتھ جا کر وہ کوٹھی دیکھی جہاں مہ جبین قید تھی تو میرے دل کی عجیب حالت ہو گئی' اس کوٹھی کے صدر دروازے پر ایک بدمعاش پہرہ دے رہا تھا۔ اس کوٹھی کے احاطے میں تین چار نئے ماڈل کی کاریں کھڑی ہوئی تھیں۔ میرے جی میں تو آیا کہ اپنی اسکوٹر سے اس بدمعاش کو کچل کر' کوٹھی کے اندر دندناتا ہوا چلا جاؤں' ان کاروں پر تیل چھڑک کر آگ لگا دوں۔ پری زاد خانم کو تلاش کر کے اس کا چہرہ بگاڑ دوں' مہ جبین کو رہائی دلا کر ہیرو بن جاؤں لیکن میں ہیرو کیسے بن سکتا تھا بلکہ اس مہ جمال کی نظروں میں میری کچھ وقعت نہیں رہتی' وہ بھی یہی کہتی کہ میں نے دانستہ یہ ڈرامہ اسٹیج کیا تھا۔

میں فخرو بھائی کو ساتھ لے کر کلفٹن آ گیا۔ ایک لان کے پرسکون گوشے میں بڑی بے تابی سے ٹہل ٹہل کر تیزی سے اپنے ذہن میں ایک منصوبہ ترتیب دینے لگا۔ میرا ذہن منتشر تھا اور مجھے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ مہ جبین کی رہائی کے لئے دو تین ایسے آدمیوں کی ضرورت تھی جو انتہائی چھٹے ہوئے بدمعاش ہوں' ایسے بدمعاشوں کی خدمات سے ہی میں کوئی فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ یکایک میرے ذہن میں بجلی کوند گئی۔ مجھے قاسم بخش کا خیال آیا۔ قاسم بخش چاکیواڑہ کا نامور بدمعاش تھا۔ بغدادی' لیاری' شیرشاہ اور کراچی کے بدنام ترین علاقوں کے تمام بدمعاش نہ صرف اس کا نام سن کر گھبرا جاتے تھے بلکہ وہ ان سب کا استاد بھی تھا۔ وہ ہرفن مولا تھا۔ میری قاسم بخش سے اس زمانے میں دوستی ہوئی تھی جب

میں اپنے کالج میں سیکرٹری ہوا کرتا تھا۔ کالج کے الیکشن میں کامیابی کے لئے قاسم بخش کی مدد ضرورت پڑتی تھی۔ پھر ہم دونوں کی دوستی وہیں تک محدود نہیں رہی' قدم بہ قدم ہم دونوں ایک دوسرے کا ساتھ دیتے رہے' میں نے ایک دو مرتبہ قاسم بخش کی جان بھی بچائی تھی مگر وہ الگ کہانیاں ہیں۔

قاسم بخش کے خیال سے میرے رگ و پے میں جیسے نئی زندگی نے وجود لے لیا۔ میں تو اس وقت جیتے جی مرگیا تھا جب مہ جبین کے اغوا کی خبر سنی تھی۔ فخرو بھائی نے جو ایکا ایکی میری باچھیں کھلتے ہوئے دیکھیں تو انہوں نے حیرت سے پوچھا۔ "کیا بات ہے' فرید بھائی؟" لگتا ہے تم نے پالا مار لیا ہے۔ بڑے خوش دکھائی دے رہے ہو۔"

"چلو۔۔۔ میرے ساتھ چلو۔" میں نے فخرو بھائی سے پرجوش لہجے میں کہا۔ "میں اپنے مشن پر جا رہا ہوں میں نے ایسی راہ نکالی ہے کہ سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ مہ جبین اس خبیث عورت کے پنجے سے رہا ہو کر باعزت طور پر اپنے گھر پہنچ جائے گی۔ آپ اپنی زبان بند رکھیں گے اور آنٹی اور کنول سے کوئی تذکرہ نہ کریں۔ انہیں نہیں معلوم کہ ان کا واسطہ کس سے پڑا ہے۔"

"میں اب اس گھر کی دہلیز پر قدم بھی نہیں رکھوں گا۔" فخرو بھائی نے شرمساری سے جواب دیا۔ "میں نے اپنے ایک دوست سے غداری کی ہے' اس کا دکھ زندگی بھر رہے گا۔"

"ان باتوں کو بھول کر میری کامیابی کے لئے دعا کرنا۔"

میں نے فخرو بھائی کو ان کی مرضی کے مطابق' انہیں صدر کے علاقے میں اتار دیا اور خود چاکیواڑہ کی جانب چل پڑا جو میری امیدوں کی آخری منزل تھی۔

○

قاسم بخش کے اڈے کی طرف جاتے ہوئے میں نے سوچا کہ کیوں نہ پہلے اس کے گھر جھانکتا چلوں' قاسم بخش جانے کسی وجہ سے یا اتفاق سے اس وقت اپنے گھر پر ہی موجود ہو' یوں بھی اس کا گھر اڈے سے پہلے پڑتا تھا۔ میں نے اس گلی میں داخل ہو کر اس کے گھر کے سامنے اسکوٹر روکا۔ دروازے پر تالا نہیں لگا ہوا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ

اپنے گھر پر موجود ہے۔ قاسم بخش اکیلا اس دنیا میں اپنی زندگی گزارنے کے لئے رہ گیا تھا۔ اندر سے دروازہ بند دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ اندر ضرور جوئے یا شراب کی کوئی محفل جمی ہوئی ہو گی۔ میرے ہونٹوں پر آپ ہی آپ ایک معنی خیز مسکراہٹ ابھر آئی۔ اس مکان سے میری بھی کچھ یادیں وابستہ تھیں' میں اسکوٹر سے اتر کر دروازے کے پاس پہنچ کر رکا اور پلٹ کر گردو پیش کا جائزہ لیا۔ کوئی ایسا شخص کہیں نظر نہیں آیا جو آس پاس کھڑا ہوا قاسم بخش کے مکان کی پہرے داری کر رہا ہو۔ مجھے تعجب بھی ہوا۔" قاسم بخش کے گھر میں کوئی محفل جمتی تو کوئی نہ کوئی ساتھی گھر سے باہر گلی میں کھڑے ہو کر پہرے داری کے فرائض انجام دیتا تھا کیوں کہ پولیس کے چھاپے کا دھڑکا لگا رہتا تھا۔

دروازے پر تین مرتبہ وقفے وقفے سے دستک دی' اندر سے کوئی جواب نہیں ملا' سناٹا طاری تھا۔ البتہ چارپائی چرمرانے کی آواز سنائی دی۔ مرتا کیا نہ کرتا میں نے چوتھی مرتبہ بڑے زور سے دروازہ بجا دیا۔ چند لمحوں کے وقفے کے بعد میں نے قاسم بخش کی بھاری بھرکم آواز کمرے میں گونجتی ہوئی محسوس کی۔ "کون ہے بھئی؟ ایک منٹ صبر کرو۔۔۔ میں دروازہ کھول رہا ہوں۔"

مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا یہ قاسم بخش کی آواز ہے' یہ لب و لہجہ اسی کا ہو سکتا ہے' میں تو یہ سمجھا کہ میں نے غلطی سے کسی اور شخص کے گھر پر دستک دے دی ہے' میری سماعت نے دھوکا کھایا تھا۔ قاسم بخش جیسا شخص بغیر گالی کے کسی بات کی ابتدا کر ہی نہیں سکتا' بات بات پر اس کی زبان سے غلیظ گالی نکلتی تھی۔ وہ کہتا تھا کہ میں نے پیدا ہوتے ہی سب سے پہلے گالی بکی تھی اور بعد میں رونے لگا تھا۔ میں شش و پنج میں پڑا ہوا تھا کہ چٹخنی گرنے کی آواز آئی۔ دروازے کے دونوں پٹ کھل گئے' میری نظروں کے سامنے قاسم بخش کھڑا ہوا تھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں خمار چھایا ہوا تھا۔ اس کی پلکیں بند ہوئی جا رہی تھیں' اس نے بہ وقت تمام آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا' اسے جیسے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہیں آیا' اس نے لمحہ بھر میری جانب حیرت سے دیکھا اور دوسرے ہی لمحے وہ فرط مسرت سے چیخا۔ "میرا یار۔۔۔ فرید بھائی۔"

ہم دونوں گرم جوشی سے بغل گیر ہو گئے' قاسم بخش نے الگ ہو کر میری آنکھوں میں جھانکا تو اس کی آنکھوں میں ایک عجیب روشنی تھی۔ "اماں یار۔۔۔ آج تجھے قاسم بخش

کیسے یاد آگیا۔ کہیں تم یہ سمجھ تو نہیں گیا کہ۔۔۔ قاسم بخش مر گیا ہے؟"

میں نے اس کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھا دیا۔ "خدا نہ کرے۔" مجھے واقعی اس سے انس تھا۔

"انسان جس طرح پیدا ہوتا ہے اسی طرح ایک روز مر بھی جاتا ہے۔" قاسم بخش محبت سے میرا بازو پکڑ کے مجھے اپنی چارپائی تک لے آیا۔ بستر ایک طرف تہہ کر کے مجھے اس پر بٹھا دیا۔ "کہیں میں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں؟"

قاسم بخش مجھے یک سر بدلا بدلا نظر آیا۔ اس نے اپنے منہ سے ایک گالی بھی نہیں نکالی تھی۔ اس کی باتوں میں اور ہی رنگ جھلک رہا تھا۔ میں نے اسے حیرت و تعجب سے نیچے سے اوپر تک دیکھا۔ اس کی وضع قطع کسی بدمعاش کی طرح نہیں بلکہ ایک مزدور کی سی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ مجھے اپنی طرف حیرت سے دیکھتے پا کر مسکرا دیا۔ "تیرا قاسم بخش اب مزدور بن گیا ہے۔ میں رات تین بجے تک جٹی پر جہاز سے سامان اتارتا رہا تھا۔ چار بجے آ کر سویا ہوں تو مجھے خود اپنا ہوش نہیں رہا۔ تم کتنی دیر سے دروازہ کھٹکھٹا رہے تھے؟"

"ایں۔۔۔" حیرت سے میرا منہ کھلا رہ گیا۔ "تم مزدوری کرنے لگے۔ کس لئے۔۔۔ تمہارا اڈا۔۔۔۔"

"وہ اڈا میں نے دو سال پہلے ہی بند کر دیا تھا۔" قاسم بخش سنجیدہ ہو گیا۔ "اپنے ہاتھوں سے محنت کر کے کھانے میں جو خوشی ہوتی ہے وہ حرام کی کمائی میں کہاں ہے؟ کاش! یہ روشنی مجھے بہت پہلے نظر آ جاتی۔"

"تو تم مولوی بن گئے ہو؟" میں بے اختیار مسکرا دیا۔

"مولوی بننے کی کوشش کر رہا ہوں۔" جانے کس احساس سے اس کے جسم پر جھرجھری سی آگئی۔ "آدمی بننا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ برا ہونا کس قدر آسان بات ہے اور محنت کی کمائی کا مزا ہی اور ہے۔ مزدوری کی جیب میں پیسے ڈالے اور گھر آ کر اطمینان و سکون سے سو گئے' نہ پولیس کا ڈر اور نہ ہی جیل کی کال کوٹھڑی کا' کسی کی انگلی بھی نہیں اٹھتی لیکن برے کام کا انجام برا ہی ہوتا ہے۔"

"تم محنت مزدوری کر کے واقعی خوش ہو۔"

"میرے لئے اس سے بڑی کوئی خوشی نہیں ہے۔" قاسم بخش نے میری آنکھوں میں

جھانکتے ہوئے پوچھا۔ "کیا تمہیں اس بات کی خوشی نہیں ہو رہی ہے کہ میں ایک اچھا آدمی بن گیا ہوں؟"

میں نے جھجک کر کہا۔ "جانے کیوں مجھے یقین نہیں آ رہا ہے؟"

"کیوں؟" قاسم بخش کے لہجے میں حیرانی تھی۔

میں نے لمحاتی توقف کے بعد متذبذب ہو کر کہا۔ "جس شخص کی زندگی میں برس کے گناہوں سے آلودہ ہو کیا وہ ایک دن یا ایک دو سال میں آدمی بن سکتا ہے؟"

قاسم بخش کے لبوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ بکھر گئی۔ انسان کی زندگی میں صرف ایک لمحہ ایسا آتا ہے جو اس کی ساری زندگی پر بھاری ہو جاتا ہے۔۔۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو۔۔۔ تم کیسے ہو؟ کیا تم نے شادی کر لی؟ آج میرے پاس کیسے بھول بھٹک کر آ گئے؟"

میں نے ہچکچا کر جواب دیا۔ "میں اپنی ایک غرض سے آیا ہوں۔ تم سے ایک معاملے میں مدد لینا ہے۔"

ایکا ایکی قاسم بخش کے رویے میں تبدیلی آ گئی' جیسے اسے میری بات بہت بری لگی ہو' اس نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔ "کیا لڑکی کا کوئی چکر ہے؟"

میں قاسم بخش کے بشرے پر ناگواری کو ابھرتے ہوئے دیکھ کر سرد پڑ گیا۔ میں جھجک گیا۔ میرے اندر جیسے حوصلہ موجود نہیں رہا کہ اس سے اپنا مدعا بیان کر سکوں اب جبکہ میں نے ایک معاملے کو اٹھایا ہی تھا تو اس کے ذکر سے گریز کر کے کترانا اور گریز کرنا احمقانہ بات تھی۔ اگر میں قاسم بخش کے اکھڑ رویے کے باعث اس بے حد نازک مسئلے کو پیش نہیں کرتا ہوں تو اس طرح مہ جبین کی عزت و ناموس اور زندگی خطرے میں پڑ جاتی تھی۔ اگر خدانخواستہ مہ جبین کو کچھ ہو جاتا یا وہ اپنی عزت بچانے کی خاطر جان دیتی ہے تو اس کی ساری ذمے داری مجھ پر عائد ہوتی تھی۔ میں بھی اس کا مجرم ٹھہرتا۔ میں نے دل کڑا کر کے قاسم بھائی کے رویے کو بالکل نظر انداز کر دیا۔ اپنی مرتعش آواز پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "بات اس قدر نازک ہے کہ تفصیل سے بیان کرنا ہو گی۔ ایک معصوم لڑکی ناکردہ گناہوں کی سزا پانے جا رہی ہے۔" میں نے مختصر طور پر سارا قصہ سنا دیا۔

قاسم بخش کے چہرے پر فکر مندی چھا گئی۔ اس نے میری کہانی کا ایک ایک لفظ بڑے غور اور انہماک سے سنا تھا اس کے سینے میں سانسوں کا تموج تھا کہ تھمتا نظر نہیں آیا

تھا۔ یک لخت اس کے چہرے پر کرب اور بے چینی سی چھا گئی۔ اس نے کسما کر بے قراری سے پہلو بدلا۔ "اس حرام زادی' پری زاد خانم کو میں اس وقت سے جانتا ہوں جب اس کی قیمت صرف دس روپے تھی' وہ جتنی خوب صورت تھی' ایک وقت تھا کہ وہ میری مٹھی میں تھی لیکن آج مجھ جیسے کتنے ہی اس کے اشاروں پر ناچتے ہیں۔ یہ سب پیسوں کا کھیل ہے' وہ ایک دو مرتبہ ہیروئن اور چرس یورپ لے جانے میں کامیاب ہو گئی۔ آج اس کی بدولت ڈیفنس کی ایک عالی شان کوٹھی میں رہتی ہے' اس کی کوٹھی کیا ہے؟ فاحشاؤں' سمگلروں اور بدکاروں کا اڈا ہے۔ اس کا اس قدر اثر و رسوخ ہے کہ ہم نے قانونی کارروائی کی تو منہ کی کھانی پڑے گی۔ کیوں کہ پولیس میں ایسی کالی بھیڑیں بھی ہیں جو اس کی پالتو ہیں' وہ پولیس کے چھاپے کی بو پا کر اس لڑکی کو کہیں اور منتقل کر کے چھپا دے گی۔ تب اس کی بازیابی اور مشکل ہو جائے گی۔"

قاسم بخش کسی گہری سوچ میں غرق ہو گیا۔ میری نگاہ اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھی لیکن میں امید و بیم کی حالت میں کھڑا جیسے پاش پاش ہوا جا رہا تھا۔ قاسم بخش نے پری زاد خانم کا جو واضح تعارف کرایا تھا' اس نے مجھے اور خوف زدہ کر دیا تھا۔ میں گزرتے ہوئے لمحے کی زد میں آ کر مایوسی کے اندھیروں میں بھٹکنے لگا۔ قاسم بخش جیسا بدمعاش پری زاد خانم کے بارے میں سنجیدگی سے سوچ رہا تھا۔ ورنہ اس سے پہلے میں نے ہمیشہ قاسم بخش کو دلیر اور نڈر پایا تھا۔ کبھی اس نے اپنے سے قد آور مقابل کی بھی پروا نہیں کی تھی۔ بپھرا ہوا طوفان بن کے جا ٹکراتا تھا لیکن آج مجھے وہی قاسم بخش بزدل دکھائی دے رہا تھا۔

قاسم بخش نے دفعتاً" اپنا جھکا ہوا سر اوپر اٹھایا اور میرے چہرے پر اپنی نگاہ مرکوز کر دی' دوسرے ہی لمحے اس نے مسکرا کے میری پشت پر ایک دھپ جمائی۔ "میرا یار۔۔۔ کیا مایوس ہو گیا ہے مجھ سے۔۔ میرے دوست' مایوسی' بزدلی کی نشانی ہے۔ تو فکر کیوں کرتا ہے؟ ہزاروں پری خانم بھی آ گئیں نا تو میں انہیں آج بھی چیونٹی کی طرح مسل کر رکھ سکتا ہوں لیکن میں پری زاد خانم سے صرف اس لئے ٹکر لینے جا رہا ہوں کہ مہ جبین ایک غریب اور شریف باپ کی معصوم اور نیک بیٹی ہے' جب تم جیسا شخص اس کی شرافت کا یقین دلا رہا ہے تو میں اسے واقعی اچھی لڑکی سمجھوں گا۔" قاسم بخش سانس لینے رکا۔ "اگر یہ نیک کام بہ خیر و خوبی انجام پا گیا تو میں یہ سمجھوں گا کہ میں نے اپنے گناہوں کی بے حد معمولی

سی تلافی کر لی ہے۔"

میں قاسم بخش کو ذہنی طور پر مہ جبین کی مدد کے لئے تیار پا کر کھل اٹھا' یہ لمحات اس قدر خوش کن تھے کہ میرے اعصاب پر سکون ہو گئے' میرے دل کی ڈھارس بندھی' میں نے بڑی بے تابی سے جھک کر قاسم بخش کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیے۔

"دوست میں تمہارا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔"

"تم مجھے شرمندہ مت کرو۔" قاسم بخش محبت کے انداز میں بگڑ کر بولا۔ تمہارے احسانات پہلے ہی کیا کم ہیں' میں ان احسانات کا بدل کبھی نہیں اتار سکا' اگر میں نے مہ جبین کو بچا لیا۔۔۔ تو یہ سمجھو کہ یہ مجھ پر تمہارا یہ ایک اور احسان چڑھ گیا۔"

قاسم بخش کی منطق میری سمجھ میں نہیں آئی۔ میں نے حیرت سے پوچھا۔ "یہ میرا احسان کیسا ہو گا؟"

اس نے مسکرا کے جواب دیا۔ "تم نے مجھے جو ایک بڑی نیکی کا موقع دیا ہے۔ اچھا ان باتوں کو چھوڑو۔ تم میرا ساتھ دینے کے لئے تیار ہونا! ہم دونوں مل کر یہ مہم سر کریں گے۔"

"لیکن میں ایک وجہ سے تمہارے ساتھ چل نہیں سکتا ہوں' کیوں کہ مہ جبین میری موجودگی سے بدگمان ہو جائے گی۔ وہ یہ سمجھے گی کہ میں نے اس کی مرضی حاصل کرنے کیلئے یہ سارا ڈرامہ رچایا ہے۔" میں نے قاسم بخش کو بڑی وضاحت سے سمجھا دیا۔

"تم فکر نہ کرو اور میرے ساتھ چلو۔" قاسم بخش نے جواب دیا۔ "میں ہر ممکن کوشش کروں گا کہ مہ جبین سے تمہارا سامنا نہ ہو۔ اگر حالات نے وہاں پلٹا کھایا اور کسی وجہ سے بساط الٹ گئی تو میں مجبور ہوں گا۔"

میں بادل نخواستہ قاسم بخش کے ساتھ چلنے کے لئے تیار ہو گیا تو قاسم بخش نے مجھ سے پوچھا۔ "کیا کنول' اس کی آنٹی اور ماموں کو کوئی سبق نہیں دینا ہے؟"

"نیکی اور پوچھ پوچھ۔" میں نے کہا۔ "میں ان ماں بیٹی کو ایسا سبق دینا چاہتا ہوں کہ ان کی جھوٹی عزت اور شہرت خاک میں مل کر رہ جائے۔"

"کیا انہیں سبق دینے کے لئے تم پانچ سو روپے کی رقم خرچ کر سکتے ہو؟"

"پانچ سو روپے کیا۔۔۔ ایک ہزار روپے بھی خرچ کر سکتا ہوں۔" میں نے حیرانی

سے قاسم بخش کی جانب دیکھا۔ "تم کیا کرنا چاہتے ہو؟"

"خون کا بدلہ جیسے خون ہوتا ہے اس طرح کمینگی کا بدلہ' کمینگی ہے۔" قاسم بخش کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ ابھر آئی۔ "پانچ سو روپے کی چرس خرید کر اس کے تین حصے کیے جائیں گے۔ جب پولیس کسی شخص کے ٹیلی فون پر ان کے گھر پر چھاپہ مارے گی تو۔۔۔ ہر ایک کمرے سے چرس برآمد ہو گی۔"

"وہ کس طرح بھلا؟" میں اپنی جگہ سے اچھل پڑا۔

"کل کسی ہال میں کنول کا ڈرامہ اسٹیج ہو رہا ہے۔" قاسم بخش نے کہا ادھر اسٹیج پر ایک ڈراما کھیلا جائے گا دوسری طرف اس کے گھر میں چرس رکھنے کا ڈراما کھیلا جائے گا؟"

"وہ کس طرح؟" میں نے اشتیاق سے پوچھا۔

"بہت ساری باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ وہ بتائی نہیں جاتیں' تم جیب سے پیسے نکالو' میں ابھی بندوبست کیے دیتا ہوں۔" قاسم بخش بولا۔

کیا پانچ سو روپے کی مالیت کے چرس سے بڑا کیس بن جائے گا؟" میں نے احمقانہ سوال کیا۔

"پانچ روپے کی چرس رکھنا بھی اتنا ہی بڑا جرم ہے جتنا پانچ سو روپے کی چرس کی موجودگی۔" قاسم بخش نے کہا۔ "ویسے بھی مجھے دوسرے لوگوں کے مقابلے میں چرس کی زیادہ مقدار ہی ملے گی۔"

میں نے اپنی پتلون کی جیب سے پرس باہر نکالا اور پانچ سو روپے قاسم بخش کے حوالے کر دیئے' قاسم بخش اپنے ہاتھ میں نوٹ لے کر کھڑا ہو گیا۔ "تم میرا انتظار کرو میں اپنے لوگوں کو سارا کیس سمجھا کر اور کچھ بندوبست کر کے واپس آتا ہوں۔ ہاں اس کمینی آنٹی کے گھر کا کیا پتا ہے؟"

قاسم بخش جب مجھ سے اچھی طرح آنٹی کے گھر کا پتا سمجھ چکا تو اس نے کہا۔ "شاید میرے کچھ لوگ اس کنول کے گھر سے واقف ہوں گے۔ انہیں ہیرو اور ہیروئنوں سے ملنے کا ہمیشہ اشتیاق رہتا ہے۔ تم اطمینان سے میرے بستر پر لیٹ جاؤ' میں ناشتے پانی کا بھی بندوبست کر کے آتا ہوں۔"

میں اپنی زندگی میں پہلی بار ایک ایسی مہم پر جا رہا تھا جس کا کبھی تصور بھی نہیں کیا

تھا۔ قاسم بخش دروازہ بھیڑ کر نکل گیا تو میں بستر پر لیٹ کر اس مہم کے بارے میں سوچنے لگا' میرے اندر آنٹی' کنول اور پری زاد خانم سے انتقام لینے کی آگ جو بھڑکی تو بھڑکتی چلی گئی۔ میرا جی تو یہ چاہ رہا تھا کہ ابھی اور اسی وقت اس کمینی عورت کی کوٹھی پر دھاوا بول دوں' لیکن یہ سب کچھ سوچنے کی طرح آسان نہیں تھا۔ پری زاد خانم کے پاس نہ صرف چھٹے ہوئے معاش ملازم تھے بلکہ اس کے پاس روپے کی قوت بھی تھی جو اس دور میں سب سے بڑی طاقت ہے۔ دولت کی طاقت سے کبھی کسی کو انکار نہیں رہا۔

ہمیں اپنی مہم پر جانے کے لئے رات کا انتظار کرنا بے حد ضروری تھا۔ رات کا اندھیرا ہمارے لئے ایک ایسا ساتھی ثابت ہو سکتا تھا کہ ہم اس سے ہر لمحے فائدہ اٹھا کر دشمن پر کاری ضرب لگا سکتے تھے۔ میرے لئے دن کا وقت کاٹنا دوبھر ہو گیا' ایک ایک لمحہ بھاری ہونے لگا تھا۔ خدا خدا کر کے شام ہوئی' شام ہوتے ہی مجھے اپنے گھر والوں کا خیال آیا' انہیں اطلاع دینا ضروری تھا کیوں کہ قاسم بخش نے کہا تھا کہ اس مہم میں پوری رات لگ سکتی ہے۔ میں نے گھر پیغام بھجوا دیا کہ میں دفتر کے ایک بے حد ضروری کام سے ابھی اور اسی وقت حیدر آباد جا رہا ہوں۔ کل دن میں کسی وقت واپسی ہو گی۔"

میرے گھر والے میرے ان پیغامات کو خوب سمجھتے تھے۔ وہ میری حرکتوں سے بہ خوبی واقف تھے۔

میں آج رات پیش آنے والے لمحات کی سنگینی سے بے خبر نہیں تھا۔ میرے لئے خطرہ نہیں بلکہ خطرات تھے۔ میرا کسی چکر میں آ کر دشمنوں کے ہتھے چڑھ جانے کا مطلب یہ تھا کہ وہ مجھے اپنے اثر و رسوخ سے کام لے کر جیل کی ہوا کھلا دیتے۔ میری برسوں پرانی سرکاری ملازمت بھی چلی جاتی اور مہ جبین کا حصول تو خیر خاک میں مل ہی جاتا۔ میں تو یہ چاہتا تھا کہ رند کے رند بھی رہیں اور جنت بھی ہاتھ سے نہ جائے۔ دشمن سے یہ بھی بعید نہیں تھا کہ وہ ہم دونوں کو قتل کر کے ہماری لاشیں سمندر میں پھینک دے۔ اس امر کے امکانات قوی تھے لیکن اب جب کہ میں نے اس پرخار راستے پر قدم رکھ دیا تھا۔ ان پیش آنے والے حالات کے خوف سے دہشت زدہ ہو جانا بزدلی کے مترادف تھا۔

رات گیارہ بجے ہم دونوں اپنے مشن پر روانہ ہوئے۔ ہم دونوں نہتے ہی تھے۔ البتہ قاسم بخش نے حفظ ماتقدم کے طور پر ایک چاقو اپنے شلوار میں چھپا کر رکھ لیا تھا۔ اس چاقو

کی کوئی حقیقت نہیں تھی۔ آج کل تو پستول' ریوالور اور اسٹین گن کی کوئی حقیقت نہیں تھی۔ لیکن ڈوبنے والے کے لئے تنکے کا سہارا بھی بہت ہوتا ہے۔

پری زاد خانم کی کوٹھی کا جائزہ لینے کی غرض سے ہم اس گلی میں داخل ہو کر اس کی کوٹھی کے سامنے سے گزرے' دو تین چکر لگائے' کوٹھی کے احاطے میں تین چار نئے ماڈل کی بڑی بڑی کاریں کھڑی ہوئی تھیں۔ گیٹ پر ایک پہرے دار اونگھ رہا تھا لیکن قاسم بخش نے بتایا کہ اس نے پی رکھی ہے اور اس پر نشہ چڑھ رہا ہے۔ ان کاروں کی موجودگی کے بارے میں قاسم بخش کا خیال تھا کہ اندر شراب و شباب کی محفل جمی ہو گی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس عورت نے مہ جبین کا نیلام کرنے کیلئے بڑے بڑے رؤسا کو مدعو کیا ہو۔ مہ جبین کا نیلا ہو رہا ہو۔ پری زاد خانم ہمیشہ سے ہر حسین لڑکی کو ہوس کاروں کے سامنے کھڑا کر کے اس کا نیلام کیا کرتی تھی۔

قاسم بخش کے اس انکشاف نے میری رگوں میں خون کی گردش اس قدر تیز کر دی کہ مجھے اپنی ایک ایک رگ پھٹتی ہوئی سی محسوس ہو رہی تھی۔ دماغ میں آتش فشاں دہکنے لگا۔ قاسم بخش نے مجھے کوٹھی کے پچھواڑے چلنے کو کہا۔ کوٹھی کے عقبی حصے میں آنے کے لئے ایک لمبا چکر لگانا پڑا۔ اس گلی میں اندھیرا دیکھ کر کراچی الیکٹرک والوں کے لئے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے دعائیں نکلیں۔ جب میں نے اپنی اسکوٹر کوٹھی کے عقبی گیٹ سے چند گز کے فاصلے پر دیوار کے ساتھ روکی تو قاسم بخش بڑی تیزی سے نیچے اتر آیا۔ جب میں نے اسکوٹر کا انجن بند کر کے قاسم بخش کو دیکھا تو وہ اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے گردوپیش کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس نے میرے کان کے پاس اپنا منہ لا کر کہا۔ "چابی مجھے دے دو!"

قاسم بخش کی بات میری سمجھ میں آ گئی۔ میں نے چابی قاسم بخش کو دے دی۔ قاسم بخش نے مجھے اپنا منصوبہ سمجھا رکھا تھا۔ اس نے ایک پل بھی تاخیر نہیں کی' میرے جھک کر اکڑوں بیٹھتے ہی اس نے میرے دونوں کندھوں پر اپنے پیر رکھ دیئے اور وہ دیوار پر اپنے ہاتھ رکھ کے کھڑا ہو گیا' میں نے اپنی قوت مجتمع کی اور آہستہ آہستہ اوپر اٹھنے لگا۔ میں بڑی آسانی سے جلد ہی کھڑا ہو گیا۔ قاسم بخش نے لپک کر دیوار کی منڈیر پکڑ لی اور میرے دیکھتے ہی دیکھتے دیوار پر چڑھ کر اندر دھم سے کود گیا۔ چند لمحوں کے بعد اس نے عقبی گیٹ اندر

سے کھول دیا۔ میرے اندر داخل ہونے کے بعد اس نے چٹخنی نہیں لگائی۔ گیٹ کو صرف بھیڑ دیا۔

پری زاد خانم کی عالی شان اور پرشکوہ کوٹھی دو ہزار گز کے پلاٹ پر بنی ہوئی تھی۔ ایسی کوٹھیاں حرام آمدنی والے اور سمگلر ہی بنا پاتے ہیں' پری زاد خانم کے پاس بھی حرام دولت ہی تھی۔ میں نے کوٹھی کے عقبی حصے کا جائزہ لیا۔ اس جانب تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ البتہ بالائی منزل کے ایک کمرے کی کھڑکی سے روشنی باہر چھن رہی تھی۔ اس بڑی سی کھڑکی میں موٹی چادر کی ایسی گرل لگی ہوئی تھی کہ ہاتھ بھی اندر نہیں جا سکتا تھا۔ وہ کھڑکی پیپل کے اونچے' گھنے اور چاروں طرف پھیلے ہوئے درخت کے باعث اس کی شاخوں کی آغوش میں اس قدر چھپ گئی تھی کہ عقبی گلی سے نہ وہ کھڑکی دکھائی دیتی تھی اور نہ ہی روشنی کا کچھ اتا پتا تھا۔ وسیع و عریض کوٹھی گہرے سناٹے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ البتہ زیریں حصے سے نرم ہنسی اور بے ہنگم قہقہوں کی آواز اسی طرح سے سنائی دے رہی تھیں جیسے وہ لوگ بہت دور بیٹھے ہوئے ہیں۔

قاسم بخش نے میرا کندھا ہلا کر میرے کان میں سرگوشی کی۔ "میرا دل کہہ رہا ہے کہ وہ لڑکی اسی کمرے میں بند ہے۔ میں درخت پر چڑھ کر دیکھتا ہوں۔"

قاسم بخش نے میرے جواب کا انتظار بھی نہیں کیا' وہ کسی گلہری کی مانند درخت پر چڑھتا چلا گیا۔ میں چوکنا اور چوکس ہو کر چاروں اطراف گھوم کر دیکھنے لگا' مگر کوئی خطرہ نہیں تھا لیکن پھر بھی ہوشیار رہنا ضروری تھا۔ میں نے چاروں طرف سے مطمئن ہو کر اوپر کی جانب دیکھا' قاسم بخش ایک اور تن آور شاخ پر بندر کی طرح سے لپٹا ہوا کھڑکی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس شاخ کے سرے پر پہنچ کر وہ ایکا ایکی کھڑا ہو گیا اور اس نے اپنے بائیں ہاتھ سے ایک قریبی شاخ کا سہارا لے کر اپنا دایاں ہاتھ کھڑکی کی جانب کر کے ہلانے لگا۔ قاسم بخش کا اندازہ درست نکلا تھا۔ مہ جبین اسی کمرے میں قید تھی۔ قاسم بخش چند لمحوں تک اپنی زبان سے سی سی کی آوازیں نکالتا رہا۔ وہ مہ جبین کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ شاید مہ جبین کا رخ اس کی جانب نہیں تھا یا وہ توقع نہیں کر رہی ہو گی کہ اسے تائید غیبی بھی مل سکتی ہے۔ پھر میں نے اچانک مہ جبین کو کھڑکی کے جنگلے کے پاس دیکھا۔ وہ حیرت اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے پیپل کے درخت کی جانب دیکھ رہی تھی۔ قاسم

بخش کی آواز فضا میں گونجی۔ "بہن گھبراؤ نہیں۔ میں تمہاری مدد کرنے آیا ہوں اپنے آپ کو تیار رکھنا اور اپنی جگہ جا کر بیٹھ جاؤ۔"

قاسم بخش جس تیزی سے اوپر گیا تھا' اسی تیزی سے نیچے اتر آیا۔ "تم نے مہ جبین کو دیکھا اور میری بات بھی سن لی ہو گی۔"

"ہاں۔" میں اپنی مسرت چھپا نہیں سکا۔

"دعا کرو کہ ہم اس غریب کو ان درندوں کے پنجے سے رہائی دلا دیں' وہ اکڑوں بیٹھی رو رہی تھی' اف وہ کس قدر حسین ہے' میں نے اپنی زندگی میں ایسی حسین لڑکی کبھی نہیں دیکھی' چاند بھی اسے دیکھ کر شرما جائے۔ یہ کمینی پری زاد خانم۔" قاسم بخش کے بدن پر جھرجھری آ گئی۔ "اس کی اتنی بڑی قیمت وصول کرے گی کہ تم اور میں اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔"

قاسم بخش مجھے خاموش پا کر اپنے دانت پیستے ہوئے بولا۔ "میں نے اس لڑکی کو بہن کہہ دیا ہے۔ جب بہن کہہ ہی دیا ہے تو اسے بھائی بن کر بھی دکھاؤں گا۔ اگر مہ جبین کو کچھ ہو گیا تو اس ملعون عورت کا خون کر دوں گا۔"

ہم دونوں اندھیرے میں دبے پاؤں بڑھے' پھونک پھونک کر قدم رکھتے جا رہے تھے کہ کہیں فضا میں ہمارے جوتوں کی چاپیں پہرے دار یا ملازموں کو ہوشیار نہ کر دیں۔ یوں بھی اس کوٹھی کے ملازمین اور پری زاد خانم کو کسی خطرے کا احساس بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ جیسے جیسے ہم دونوں گھوم کر بڑھتے جا رہے تھے ویسے ویسے ہنسی اور قہقہوں کا شور قریب آتا جا رہا تھا۔ قاسم بخش آگے آگے تھا اور اس کے ہاتھ میں چاقو کھلا ہوا تڑپ رہا تھا۔ میں اس سے ایک دو قدم پیچھے تھا۔ قاسم بخش اس کوٹھی کے چپے چپے سے واقف تھا۔ وہ اوپر جانے کے لئے راستہ تلاش کر رہا تھا۔ کچن کے برابر ایک عقبی راستہ تھا جو اوپر کی طرف جاتا تھا۔ قاسم بخش اسی کی جانب مجھے لئے جا رہا تھا۔ دفعتاً" وہ ایک جگہ رک کے کچھ دیکھنے لگا۔ میں نے بھی اس کی پشت پر پہنچ کر اپنی گردن باہر نکالی۔

یہ ایک وسیع و عریض ملاقاتی کمرہ تھا۔ اس کی دیواریں صاف شفاف شیشوں کی تھیں۔ اس پر بڑے بڑے پردے لہرا رہے تھے۔ ایک جگہ دو پردوں کے درمیان اتنی سی جھری رہ گئی تھی کہ اندر کا منظر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ تیز روشنیوں میں ہال جگ مگ

جگ مگ کر رہا تھا۔ میں نے چار مردوں کے درمیان ایک عورت کو دیکھا جو سیاہ رنگ کی جارجٹ کی ساڑھی اور بے حد مختصر بلاؤز میں ملبوس تھی۔ اس کا گورا بدن سیاہ رنگ میں پھوٹا جا رہا تھا۔ فربہی مائل بدن پرکشش تھا۔ چہرے کے نقوش میں جاذبیت تھی۔ قاسم بخش نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ "اسی حرافہ کا نام پری زاد خانم ہے۔ یہ چاروں مرد پینے پلانے اور عیاشی کے لئے آئے ہوئے ہیں۔"

اس کمرے میں شراب کا دور چل رہا تھا۔ پری زاد خانم ایک مرد کے پہلو میں بیٹھی ہوئی ساقی کے فرائض انجام دے رہی تھی' ایکا ایکی قاسم بخش چونک پڑا اور زیر لب بڑبڑایا۔ "یہ کون شخص ہے؟ مجھے اس کا چہرہ کچھ مانوس لگ رہا ہے۔" قاسم بخش نے یک لخت میری جانب پلٹ کر دیکھا۔ "کیا تم اس شخص کو پہچانتے ہو؟"

میں نے اس شخص کو دیکھا لیکن پہچان نہیں سکا۔ لیکن قاسم بخش تو کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا تھا۔ وہ اس شخص کے نام یاد کرنے کے لئے اپنے ذہن پر زور دینے لگا۔ ایک عجیب سا اضطراب اس کے بشرے پر ابھر آیا تھا۔ اسے جیسے قرار نہیں آ رہا تھا۔ یہ شخص ملک دشمن عناصر سے ملا ہوا ہے۔ اس نے ایک سیاسی لیڈر اور وزیر کو قتل کیا ہے۔ اور قتل کر کے افغانستان بھاگ گیا تھا۔" قاسم بخش بہ مشکل اپنی مسرت کو دبا سکا۔ "اب یہ شخص اور فریدہ خانم قانون کے ہاتھوں سے کسی طرح نہیں بچ سکتے۔ اسے اتنی لمبی سزا ہو جائے گی کہ جب وہ رہا ہو کر جیل سے نکلے گی تو اسے بھیک بھی نہیں ملے گی۔" میں نے اس شخص کی تصویر کئی مرتبہ اخباروں میں دیکھی تھی۔"

وہ چاروں مرد اور پری زاد خانم جانے کس بات پر اپنی اپنی شراب کے گلاس حلق میں انڈیل کر اٹھ کھڑے ہوئے اور وہ پانچوں پری زاد خانم کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔ "بہت برا ہوا دوست۔" قاسم بخش تشویش ناک لہجے میں کہا۔ "وہ کمینی عورت ان مردوں کو اوپر لے گئی ہو گی تاکہ مہ جبین کا چاند سا چہرہ دکھائے اور بولی لگا سکے۔"

میرا دماغ سنسنا گیا۔ میں نے وحشت زدہ لہجے میں پوچھا۔ "اب کیا کیا جائے؟"

"صبر کرو۔ ضبط سے کام لو۔ دیکھو کہ کیا حالات پیش آتے ہیں' شاید ہمارے لئے کوئی بہتری کی صورت نکل آئے۔" قاسم بخش نے مجھے تسلی دی۔

قاسم بخش کا اندازہ غلط ثابت ہوا۔ چند لمحوں کے بعد احاطے میں کھڑی گاڑیاں ایک

ایک کر کے اسٹارٹ ہوئیں اور باہر نکل گئیں۔ قاسم بخش کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ "تھینک یو مائی گاڈ۔" قاسم بخش نے میری طرف پلٹ کر کہا۔ "میں نے تم سے ابھی کیا کہا تھا۔ "شاید ہمارے لئے بہتری کی کوئی صورت نکل آئے۔"

"اوپر چلیں۔" میں نے بے تابی سے کہا۔

"صبر کرو۔ میرے بیٹے صبر۔" قاسم بخش نے بڑے پیار سے میری پشت تھپ تھپائی۔ "ایسے موقعوں پر صبر و ضبط سے کام نہیں لیا جاتا ہے تو لینے کے دینے پڑ جاتے ہیں۔" قاسم بخش نے ملاقاتی کمرے کی جانب اشارہ کیا۔ "اب تم اس ڈرامے کا دوسرا ایکٹ دیکھو گے۔ اس بنگلے میں جتنے ملازمین اس وقت موجود ہیں' وہ سب کے سب اس کمرے میں جمع ہونے والے ہیں۔ ہمیں ان کی تعداد کے بارے میں معلوم ہو جائے گا۔"

قاسم بخش کی بات میری سمجھ میں آگئی۔ میں چپ ہو کر ملاقاتی کمرے میں جھانکنے لگا' قاسم بخش کی پیشین گوئی درست ثابت ہوئی' زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ دو ہٹے کٹے' لمبے چوڑے اور تومند ملازم اندر داخل ہوئے۔ پہلے تو ان دونوں نے مل کر بڑی تیزی سے خالی گلاسوں میں سے بچی کھچی شراب اپنے حلق میں انڈیل لی۔ دو تین بوتلوں میں جو شراب بچی ہوئی تھی اسے گلاسوں میں ڈال کر پینے کی زحمت ہی نہیں کی۔ بغیر کسی تکلف کے اپنے باپ کا مال سمجھ کر پی گئے' سوڈا ملانے کا تکلف بھی نہیں کیا۔ خاصی دیر تک یہ شغل چلتا رہا۔ ان دونوں پر نشے کی کیفیت طاری ہونے لگی۔ ان لمحات سے فائدہ اٹھا کر قاسم بخش پلٹا اور مجھے کچن کی جانب لے کر چلا۔ ہم دونوں کچن کا دروازہ سمجھ کر اندر داخل ہوئے تو آنکھیں پھٹ سی گئیں۔ تین بڑی بڑی الماریوں میں شراب کی بوتلیں رکھی ہوئی تھیں۔ ان الماریوں میں اس قدر بڑی تعداد میں بوتلیں موجود تھیں کہ ایک بڑی دکان کے لئے کافی تھیں۔ ایک جانب شراب کی بوتلوں کے بھرے کارٹن بھی رکھے ہوئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی آٹے کی چھوٹی بوریاں پڑی ہوئی تھیں۔ قاسم بخش نے ان بوریوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ ہیروئن ہے۔"

جب ہم دونوں دوسرے دروازے سے باہر نکلے تو یہ ایک لمبی سی راہ داری تھی۔ ہم دونوں نے چند قدموں کا فاصلہ طے کیا تھا کہ دائیں جانب کے ایک کمرے کا دروازہ اچانک کھلا' یہ دروازہ ملاقاتی کمرے اور اوپر جانے والے زینے کی جانب کھلتا تھا۔ اچانک ایک

ملازم راہ داری میں داخل ہوا۔ وہ ہم دونوں کو دیکھ کر ٹھٹکا اور حیرت سے اچھل گیا۔ ایک لمحے کے لئے بھونچکا سا ہو کر اس نے پوچھا۔ تم کون ہو؟ اندر کیسے آئے؟"

"میں تمہارا باپ ہوں اور یہ تمہارا چچا ہے۔" قاسم بخش نے پلٹ کر میری طرف اشارہ کیا۔ قاسم بخش نے کسی تاخیر کے بغیر اپنی لات اس کے بدن کے سب سے نازک حصے میں جما دی' وہ تڑپ کر فرش پر جا گرا۔ اس نے ایک دل خراش چیخ ماری اور بے ہوش ہو گیا۔ اس کی چیخ سن کر دوسرا ساتھی بھاگا ہوا آیا۔ قاسم بخش کو چوکنا اور اپنے ساتھی کو فرش پر بے ہوش دیکھ کر وہ سارا ماجرا سمجھ گیا۔ وہ قاسم بخش پر جھپٹ پڑا۔ دونوں آپس میں گتھم گتھا ہو گئے' اس نے میری ذرہ برابر بھی پروا نہیں کی اور قاسم بخش کی گردن توڑنا چاہ رہا تھا۔ میری سمجھ میں اس وقت کچھ نہیں آیا کہ میں کیا کروں' میں نہتا بھی تھا۔ میں نے پہلے تو ایک دو گھونسے اس کی پیٹھ پر مارے لیکن اس کا جسم اس قدر سخت تھا کہ کوئی اثر نہیں ہوا۔ معاً" میری نظر دائیں طرف پڑی' سامنے دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ کچن تھا۔ میں اندر سے چھری لانے دوڑ گیا۔ چھری تو دکھائی نہیں دی البتہ چولہے پر ایک بڑی سی کیتلی رکھی ہوئی تھی اور اس کی نال میں سے دھواں نکلا جا رہا تھا۔ گویا چائے کا پانی کھول رہا تھا۔ میں نے وہ کیتلی لا کر اس کا گرم گرم پانی اس بدمعاش کے سر اور پیٹھ پر انڈیل دیا۔ وہ ایک چیخ مار کے میری طرف پلٹا۔ قاسم بخش اس سے آزاد ہو گیا۔ جب وہ بدمعاش میری طرف بڑھنے لگا تو قاسم بخش نے اس کے سر کے بال پکڑ کر نیچے گرا دیا اور میرے ہاتھ سے کیتلی لے کر بڑی سفاکی سے اس کے چہرے پر کھولتا ہوا سارا پانی انڈیل دیا۔ اس بدمعاش کی دل دوز چیخیں اور کراہیں فضا میں گونجتی رہیں ور وہ فرش پر لوٹتا' تڑپتا ہوا جلد ہی درد کی شدت سے نڈھال ہو کر بے ہوش ہو گیا۔

قاسم بخش نے مجھے ہدایت کی کہ میں اسی راہ داری میں کھڑے ہو کر ان دونوں بدمعاشوں پر نظر رکھوں۔ وہ دروازہ کھول کر اوپر چلا گیا۔ میں نے کچن میں جا کر دوبارہ چھری تلاش کی تو چھری مل گئی' میں ہاتھ میں چھری لئے' سینے میں دھک دھک کرتے دل کے ساتھ کھڑا رہا۔ کچھ دیر بعد قاسم بخش تنہا میرے پاس آیا تو وہ بڑا خوش تھا' اس نے سرگوشی کی۔ "میں مہ جبین کو ساتھ لے کر جا رہا ہوں' تم میرے گھر پہنچ کر انتظار کرنا۔ خدا حافظ میں اسے گھر پہنچا کر آ رہا ہوں۔

جب میں عقبی گیٹ سے باہر نکلا تو قاسم بخش کو دیکھا وہ مہ جبین کو اسکوٹر کے پیچھے بٹھائے اڑا چلا جا رہا تھا۔ میں نے اطمینان کا گہرا سانس لیا اور دوڑتا ہوا' ایک خالی ٹیکسی گزر رہی تھی' اس میں سوار ہو گیا۔ میں نے آنکھیں بند کر کے اپنا سر سیٹ کی پشت پر ٹکا دیا۔

قاسم بخش کے مکان کی چابی میری جیب میں تھی۔ میں نے اس کے کمرے میں پہنچ کر اپنے آپ کو بستر پر گرا دیا۔ جانے کیوں مجھے یقین ہی نہیں آتا تھا کہ یہ کارنامہ بڑی خوش اسلوبی اور کامیابی سے اپنے انجام کو پہنچ گیا ہے' میں خوش تھا کہ مہ جبین ان درندوں کے پنجے سے بچ گئی۔ مجھے یہ سب کچھ ایک خواب لگ رہا تھا۔

کوئی ایک گھنٹے کے بعد قاسم بخش آیا تو اپنے ساتھ مٹھائی کا ڈبا بھی لے آیا تھا۔ اس نے مٹھائی کا ایک ٹکڑا میرے منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔ "اس کامیابی کی خوشی میں ایک مزدور بھائی کی جانب سے منہ میٹھا کرو۔ میں نے اپنی بہن کو حفاظت سے اس کے گھر پہنچا دیا' اس کے باپ کی حالت بیٹی کی جدائی میں بڑی خراب ہو رہی تھی۔ وہ اپنی بیٹی کو دیکھتے ہی خوش ہو گیا تھا۔ میں نے ان دونوں کو اچھی طرح سمجھا دیا کہ اب گھبرانے اور فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں' کسی کو اس واقعے اور حادثے کے بارے میں بتانا بھی نہیں' روزمرہ کی طرح زندگی گزارنا۔ اب کوئی بھی میری بہن پر ہاتھ نہیں ڈال سکتا ہے۔ بڑے میاں نے ایک عقلمندی کی تھی کہ پولیس میں رپورٹ درج نہیں کرائی' ورنہ مسئلہ بڑا نازک ہو جاتا۔ پولیس بڑی الجھنیں پیدا کر دیتی۔"

"کیا تم سے مہ جبین نے پوچھا تھا کہ۔" قاسم بخش نے میری بات سمجھ کر میری بات کاٹی۔ "اس نے بہت سارے سوال کئے' میں نے اسے سمجھا دیا کہ خدا کا شکر ادا کرو کہ عزت و آبرو بچ گئی۔ میں کون ہوں اور کس لئے تمہاری جان بچائی؟ مجھے خبر کیسے ہوئی' اس سے کچھ حاصل نہیں ہو گا اور ہاں۔" قاسم بخش نے کچھ یاد کر کے کہا۔ "مہ جبین نے بتایا کہ اسے کل افغانستان لے جایا جا رہا تھا تاکہ وہاں سے کسی طرح ایران لے جایا جائے۔ ایران سے خلیج لے جا کر کسی شیخ کے سپرد کر دیا جاتا۔"

"قاسم بخش تم نے نہ صرف مہ جبین پر بلکہ مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے؟"

"تمہارا احسان تو میرے احسان سے بھی بڑا ہے۔"

"کون سا احسان؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

اگر تم اس بدمعاش پر کھولتا ہوا پانی نہیں ڈالتے تو وہ میری گردن توڑ کر رکھ دیتا۔ اس کے ہاتھوں میں زندہ بچ نہیں سکتا تھا۔ وہ حرام کی کھا کھا کر کس قدر طاقت ور ہو گیا تھا اس کا حشر ٹھیک ہی ہوا۔"

قاسم بخش نے اپنی گردن پر ہاتھ پھیرا۔" تم بہرحال ایک اچھی خبر سنو۔ میں نے ٹیلی فون پر پری زاد خانم اور آنٹی کے بارے میں متعلقہ محکموں کو اطلاع دے دی ہے۔ پرسوں کے اخبار میں لوگوں کو سنسنی خیز خبریں پڑھنے کو ملیں گی۔"

قاسم بخش میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے مسکرایا اور مٹھائی کھاتے ہوئے بولا۔

"یار بھوک کھل اٹھی ہے۔"

تیسرے روز صبح کے اخبارات میں پری زاد خانم' آنٹی کنول اور اور اس کے ماحول کی گرفتاری کی سنسنی خیز خبریں شائع ہوئی تھیں۔ پری زاد خانم پر سنگین نوعیت کے دو الزام عائد کئے گئے تھے۔ اس پر پہلا الزام تو یہ تھا کہ اس نے اپنے ہاں ایک سیاسی لیڈر کے مفرور قاتل کو پناہ دے رکھی تھی۔ دوسرا الزام اس کے ہاں سے سمگل شدہ بدیسی شراب اور ہیروئن کی ایک مقدار کا پایا جانا تھا۔ جس کی مالیت ڈیڑھ کروڑ روپے کے لگ بھگ تھی۔

میں بڑی سنجیدگی سے مہ جبین کے بارے میں سوچنے لگا۔ حالات پلٹا کھا چکے تھے۔ بڑے میاں کو قتل کرنے کے بجائے میں کچھ اور ہی سوچتا رہا۔ مہ جبین اور بڑے میاں کا اغوا کے اس واقعے کے بعد دہشت زدہ ہو کر رہ جانا قدرتی امر تھا۔ بڑے میاں شاید سنجیدگی سے اپنی بیٹی کی شادی کے بارے میں سوچ بھی رہے ہوں گے۔ اس وقت لوہا گرم تھا۔ ایک بھرپور چوٹ کی ضرورت تھی۔ قاسم بخش انہیں تسلی دے کر اور یہ سمجھا کر بھی آیا تھا کہ فریدہ خانم گرفتار ہو کر برسوں کی سزا بھگتتی رہے گی۔ ہوا بھی ایسا ہی تھا لیکن اس کے باوجود بڑے میاں کے دل میں جو خوف و ہراس بیٹھ گیا ہو گا اور مہ جبین جس وحشت میں مبتلا ہو گی وہ جلد دور نہیں ہو سکتی تھی۔ ان تمام واقعات کے بارے میں امی جان کو میں نے کچھ نہیں بتایا' البتہ انہیں میں نے کسی بہانے سے اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ بڑے میاں سے جا کر دریافت کر آئیں اور مہ جبین کی مجھ سے جلد سے جلد شادی کرنے پر زور دیں۔

امی جان بڑے میاں کے ہاں پہنچیں تو گھر پر مہ جبین موجود نہیں تھی بلکہ اپنی ملازمت پر گئی ہوئی تھی۔ میں مہ جبین کی جرات اور بہادری پر تحیر زدہ رہ گیا۔ گویا اس نے حادثے کی سنگینی کا کوئی گہرا اثر نہیں لیا تھا۔ جب کہ فطری طور پر اسے ڈر محسوس ہونا چاہیے تھا۔ وہ اس طرح ملازمت پر جانے لگی تھی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔

ادھر بڑے میاں نے امی جان کو ٹکا سا جواب دے دیا تھا۔ "میں اپنی بیٹی سے ابھی تک دریافت نہیں کر سکا ہوں۔ کیوں کہ ان دنوں میری طبیعت بڑی خراب رہی اور میری بیٹی کا کام اس قدر بڑھ گیا ہے کہ وہ آج کل دیر سے گھر آنے لگی ہے۔"

اب بڑے میاں سے کوئی توقع رکھنا فضول تھا۔ وہ قطعی انکاری ہو گئے تھے۔ پھر میں نے بڑے میاں کے خلاف ایک نیا منصوبہ ترتیب دینا شروع کر دیا۔ ایک روز سہ پہر کے وقت میں اخبار میں ایک خبر پڑھتے ہی چونکا اور اس خبر نے میرے ذہن میں ایک ایسا نادر منصوبہ پیدا کر دیا تھا کہ میں یکایک خوشی سے اچھل پڑا۔ میں اس منصوبے پر بڑی دیر تک غور کرتا رہا۔ جب میں نے اس منصوبے کو ہر طرح موزوں پایا تو میں قاسم بخش کے گھر پر جا دھمکا' وہ اسی وقت ڈیوٹی انجام دے کر لوٹا تھا۔ اس نے بڑی گرم جوشی سے میرا استقبال کیا۔ رسمی باتوں کے بعد اس نے مجھ سے پوچھا۔ "میں تمہاری کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"انکار تو نہیں کرو گے؟" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "آج تم سے بہت بڑی خدمت لینے آیا ہوں۔"

"تمہارے لئے میری جان بھی حاضر ہے۔" قاسم بخش نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "تم مجھے آزما کر تو دیکھو' میں ایک قدم بھی پیچھے نہیں ہٹوں گا۔"

میں نے کس قدر ہچکچا کر اور اپنی پلکیں جھپکاتے ہوئے کہا۔ "مہ جبین کو اغوا کر کے میرے فلیٹ پر پہنچا دو۔"

"کیا کہا؟"

قاسم بخش اپنی جگہ سے اچھل کر جیسے پتھر کی طرح منجمد ہو گیا۔ اس پر سکتہ سا چھا گیا تھا۔

○

قاسم بخش کو جیسے میری بات کا یقین نہیں آیا تھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور چہرے کا رنگ بدلنے لگا۔ وہ میری طرف ایسی نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے اس کے سامنے کوئی خبیث روح رقص کر رہی ہو۔ اس نے چند ثانیوں کے بعد تحیر زدہ لہجے میں پوچھا۔ "کہیں تم مجھ سے مذاق تو نہیں کر رہے ہو؟"

"مذاق!" میرا لہجہ ناگوار ہو گیا۔ "تم میری بات کو مذاق سمجھ رہے ہو؟"

"اگر یہ مذاق نہیں ہے تو؟" قاسم پل بھر کے لیے جھجکا' اس کا چہرہ سپاٹ ہو گیا۔ "تم نے مجھے ایک انتہائی غلیظ گالی دی ہے۔"

مجھے اس بات کا احساس تو تھا کہ قاسم بخش میری بات کا برا مانے گا لیکن وہ اس قدر جذباتی ہو جائے گا' میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ میں اسے منانے کی غرض سے مسکراتا ہوا اس کے قریب پہنچا اور پیار بھرے انداز سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ "قاسم بخش! تم کیسی باتیں کرتے ہو! میں تمہیں کبھی گالی دے سکتا ہوں۔ میں تو تم سے ایک درخواست کر رہا ہوں کہ مہ جبیں کو کسی بھی صورت سے میرے فلیٹ پر پہنچا دو۔"

قاسم بخش نے بے رحمی کے انداز میں میرا ہاتھ اپنے شانے سے ہٹا دیا۔ "یہ کیسے ممکن ہے کہ میں اپنی بہن کو اغوا کر کے تمہارے فلیٹ پر پہنچا دوں۔" وہ یکایک تند لہجے میں گرجا۔ "کیا تم میرے کہنے پر اپنی بہن کو یہاں لا سکتے ہو؟"

قاسم بخش کا لہجہ اس قدر سفاک تھا کہ اس کا ایک ایک لفظ نیزے کی انی بن کر میرے دل میں چبھنے لگا۔ میرا دماغ غصے سے تپ گیا اور سارا بدن جھن جھنا اٹھا۔ میرے جی میں آیا کہ میں اپنے دونوں ہاتھوں سے قاسم بخش کا گلا دبا دوں۔ اس وقت تک دباتا رہوں کہ جب تک اس کی آنکھیں ابل نہ پڑیں۔ وہ بے آب ماہی کی طرح تڑپتا رہے۔ اس کے

منہ سے ایک چیخ بھی باہر نہ آسکے اور وہ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرجائے لیکن مجھے اس زہر کو پینا پڑا۔ قاسم بخش کی باتیں جیسے میرے سر سے گزر گئی تھیں۔ میں یہاں اپنی غرض لے کر آیا تھا۔ میں قاسم بخش کی مدد کے بغیر تن تنہا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے کھسیانا ہو کر اس سے پوچھا۔ "مہ جبیں تمہاری بہن کب سے ہو گئی؟"

"اسی روز سے جب میں نے اسے پری زاد خانم کے چنگل سے چھڑایا تھا۔" قاسم بخش نے اکھڑے ہوئے انداز سے جواب دیا۔ "تم نے بھی تو سنا تھا۔ میں نے اسے اپنے منہ سے بہن کہہ کر پکارا تھا۔"

"کیا منہ سے بہن کہہ دینے سے ایک غیر لڑکی بہن ہو جاتی ہے؟" میرا لہجہ میرا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔

"کیا زبان کا کوئی بھروسا نہیں ہوتا؟"

"آج کل تو ہر ایک پر سے بھروسا اٹھ گیا ہے۔" میں نے نرمی سے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ "مہ جبیں یا کوئی اور لڑکی تمہارے اس پرخلوص جذبے کی کبھی قدر نہیں کر سکتی۔ ایک غیر لڑکی تمہیں بھائی تسلیم کرنے سے قاصر ہے۔ اگر اس نے تمہیں بھائی بنا بھی لیا تو ہمارا معاشرہ ایسے رشتوں کو شک کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور لوگ انگلیاں اٹھاتے ہیں کیونکہ اکثر مرد نوجوان لڑکیوں کو بہنیں بنا کر اپنی غرض پوری کرتے رہتے ہیں' ایسا ہوتا رہا ہے۔" میں نے اندھیرے میں تیر چلایا۔ "مہ جبیں نے بھی اپنے دل میں سوچا ہو گا کہ تم بھی انہی مردوں میں سے ایک ہو گے۔"

"مجھے کسی کے سوچنے کی ذرہ برابر فکر نہیں ہے۔" قاسم بخش نے بے پروائی سے اپنے کندھے جھٹکے' وہ طیش میں آگیا۔ "میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں۔ تم مجھے بے حد قریب سے جانتے ہو۔ میں بہت برا آدمی سہی لیکن میں اپنی بات اور قول پر قائم رہتا ہوں۔ میں نے مہ جبیں کو ایک مرتبہ بہن کہہ دیا تو وہ میری بہن ہو گئی۔ میں اسے مرتے دم تک اپنی سگی بہن کی طرح سمجھتا رہوں گا۔" قاسم بخش کا لہجہ جذباتی ہو رہا تھا۔ "میں نے اسے بہن کہہ دیا تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں اس کے گھر آنا جانا شروع کر دوں گا۔"

"استاد آخر تم اس قدر جذباتی کیوں ہو رہے ہو؟"

"کیا میں نے تمہیں اسی روز نہیں بتایا تھا کہ میں اب استاد نہیں رہا ہوں بلکہ قاسم

بخش ہوں، صرف قاسم بخش۔" اس نے برہمی سے جواب دیا۔

"تو تم صاف طور پر یہ بات کیوں نہیں کہتے ہو کہ اب میں تمہارے کسی کام نہیں آسکتا ہوں؟" میں نے اس پر چوٹ کی۔

"سنو فرید بھائی!" قاسم بخش بھڑک اٹھا۔ "تم میری دکھتی رگ پر انگلی رکھ کے میرا مذاق نہ اڑاؤ۔ تمہیں کیسے بتاؤں کہ میں آج اپنے گناہوں پر کس قدر شرمسار ہوں۔ اس کا اندازہ کوئی دوسرا نہیں لگا سکتا۔ ان بدنصیب لوگوں کی یادیں جنہیں میں نے اپنی غنڈہ گردی کا نشانہ بنایا، میرے دل میں برچھیاں بن کر پیوست ہو جاتی ہیں۔ ان کی دہشت زدہ آنکھیں، متوحش چہرے اور التجائیں میرے وجود کو سانپ بن کر ڈسنے لگتی ہیں۔ میں لرز جاتا ہوں اور انگاروں پر لوٹنے لگتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ مجھے وہ لڑکیاں اور عورتیں ایک بار کہیں مل جائیں جن کے میں نے گھر، سکون اور عزتیں لوٹ لی ہیں، میں ان کے ہاتھوں میں کوڑے دے کر کہوں گا کہ میرے جسم پر اس وقت تک کوڑے برساتی رہو جب تک میں تڑپ تڑپ اور سسک سسک کر مر نہ جاؤں اور اگر میں مرتے مرتے پانی مانگوں تو ہرگز ایک بوند بھی میرے حلق تک نہ پہنچنے دو۔" قاسم بخش نے توقف کرکے ایک سرد آہ بھری۔ "شاید تب بھی میرے گناہوں کا کفارہ ادا نہ ہو سکے۔"

میں قاسم بخش کی تقریر سے اکتا گیا۔ میں یہاں وعظ سننے تو نہیں آیا تھا۔ قاسم بخش کو کسی نہ کسی صورت سے راہ پر لانے کے لیے جھوٹ کا سہارا لینا ضروری تھا۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "میرے یار! میں کب چاہتا ہوں کہ مہ جبیں پر کوئی داغ لگاؤں؟"

قاسم بخش نے چونک کر اپنا جھکا ہوا سر اوپر اٹھایا۔ اس نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے میں پاگل ہو گیا ہوں۔ "آخر تم چاہتے کیا ہو؟" اس نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔ وہ مضطرب سا ہو گیا۔ "تمہاری کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آرہی۔ کل تو تم نے مہ جبیں کو اس کمینی اور ذلیل عورت پری زاد خانم کے پنجے سے رہائی دلوانے کے لیے میری اور اپنی جان کو داؤ پر لگا دیا تھا اور آج تم مجھ ہی کو اس بات پر مجبور کر رہے ہو کہ میں اس نیکی کو برائی میں تبدیل کرکے اپنے منہ پر کالک مل لوں۔"

"مہ جبیں کو اغوا کرنے کا مقصد اس سے نکاح کرنا ہے!"

"فرید بھائی! تم پوری طرح سٹھیا گئے ہو۔" قاسم بخش کے بشرے پر استعجاب چھا گیا۔

"کیا نکاح کرنے کے لیے یہی ایک شریفانہ طریقہ رہ گیا ہے؟"

قاسم بخش کے لہجے کی کاٹ نے مجھے جزبز کر دیا۔ میں نے بڑی تفصیل سے مہ جبیں کے باپ کی ہٹ دھرمی کی کہانی سنائی۔ قاسم بخش نے بڑی توجہ سے سنا اور کہا۔ "تم اجازت دو تو میں بڑے میاں سے مل کر انہیں سمجھاتا ہوں۔ شاید وہ میری بات مان جائیں۔ آخر انہیں ایک نہ ایک روز اپنی بیٹی کی شادی تو کرنا ہی ہے نا؟"

"وہ ذلیل بڈھا میرے لیے اپنے باپ کی سفارش بھی قبول نہیں کرے گا۔" میں نے چڑ کر کہا۔ "اس خبیث اور کمینے شخص نے جانے کہاں سے اور کیسے میرے بارے میں اس قدر معلومات حاصل کرلی ہیں کہ میں اس کی نظروں میں پوری طرح بے لباس ہوگیا ہوں۔ ذرا ذرا سی بات کی اسے خبر ہے اور اس نے میرا ناطقہ بند کر دیا ہے۔"

"مجھے کوشش کر لینے دو۔ آخر اس میں حرج ہی کیا ہے۔"

"تمہارا وہاں جانا مناسب نہیں ہے!"

"کیوں؟"

"باپ اور بیٹی فوراً ہی تم پر شک کریں گے کہ یہ رشتہ حاصل کرنے کا ڈرامہ کسی خاص مقصد کے لیے کھیلا جا رہا ہے۔"

میں نے کہا۔ "وہ مردود تمہارا ماضی بھی چھان مارے گا تو بات اور بگڑ جائے گی۔"

"کسی اور گھر میں اپنی شادی کا پیغام بھیج دو۔" قاسم بخش نے مجھے بزرگانہ انداز میں مشورہ دیا۔ "کراچی جیسے شہر میں ایسی حسین لڑکیوں کی بھرمار ہے جو رشتوں کے انتظار میں بیٹھی ہوئی ہیں۔ میری نگاہ میں بھی دو تین لڑکیاں اس قدر حسین ہیں کہ وہ تمہیں یقیناً پسند آئیں گی۔ وہاں اپنے گھر والوں کو بھیج کر دیکھ لو۔" "کیا وہ لڑکیاں مہ جبیں سے بھی زیادہ حسین ہیں؟"

"نہیں۔" قاسم بخش نے نفی میں اپنا سر ہلا دیا۔ "مہ جبیں جیسی حسین لڑکی صدیوں میں ایک بار پیدا ہوتی ہیں۔"

"میں مہ جبیں کے علاوہ کسی اور لڑکی کو اپنی بیوی بنانے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا ہوں۔" میں نے اپنے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ "میں اسے ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہتا ہوں۔"

"جبر و ظلم سے تمہیں کچھ حاصل نہیں ہوگا!" قاسم بخش نے مجھے سمجھایا۔ میں نے مہ جبیں کے ساتھ بمشکل نصف گھنٹہ گزارا ہے۔ وہ ان لڑکیوں میں سے نہیں ہے جو دھونس یا کسی لالچ میں آکر تم سے شادی کر لے۔ وہ اس دور کی پڑھی لکھی اور سمجھدار لڑکی ہے۔ اگر ایک مرتبہ ہٹ دھرمی پر اتر آئی تو مرتے دم تک اپنی ضد پر اڑی رہے گی' پھر کسی میں دم نہیں کہ اس کے انکار کو اقرار میں تبدیل کرا لے۔"

"مجھے جائز و ناجائز کی کوئی پروا نہیں۔" میں نے تکبر سے کہا۔ "چند سو روپے کے عوض مجھے نکاح نامہ مل جائے گا۔ مہ جبیں دو تین روز کے بعد اپنے گھر جائے گی تو اس کا باپ مجھ سے سمجھوتہ کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔"

"میں اس کھیل میں تمہارا شریک نہیں بن سکتا۔" قاسم بخش نے صاف طور پر انکار کر دیا۔

قاسم بخش کے اس انکار نے میرے اندر اک آگ سی لگا دی۔ جو بات میں اس سے کہنا نہیں چاہتا تھا' وہ بے ساختہ میری زبان پر آگئی۔ "آج تم میرے احسانات کا صلہ اس طرح دو گے' میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔"

میں نے اپنی بات ختم بھی نہیں کی تھی کہ قاسم بخش کے چہرے کے تاثرات اور تیور بدلتے ہوئے دیر نہیں لگی۔ وہ کسی وحشی درندے کی مانند بپھر کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا' اس نے وحشت میں میرا گریبان پکڑ لیا۔ اس کی سخت' موٹی اور کھردری انگلیاں بے رحمی سے اپنی گرفت سخت کرنے لگیں۔ یکبارگی اس کا جسم کانپ کر رہ گیا۔ اس نے اپنی انگاروں جیسی دہکتی آنکھیں میری آنکھوں میں ڈال دیں۔ اس کی چھاتی میں پھولتی ہوئی سانسیں جیسے اسے خاک کر کے باہر نکلنے پر تلی ہوئی تھیں۔ اس نے مجھے سفاکی سے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔

"کیا تم آج اپنے احسانات کا حساب چکانے آئے ہو؟"

"تم میری بات سمجھے نہیں قاسم بخش!" میری آواز حلق میں پھنسنے لگی۔

"کیا میں بچہ ہوں؟"

قاسم بخش نے یکایک میرا گریبان چھوڑ دیا۔ اس کے تمتماتے ہوئے چہرے پر ایک کرب سا چھا گیا۔ "میں تمہارے احسانات کے بوجھ تلے اس قدر دبا ہوا تھا کہ اپنا سر اونچا نہیں کر سکتا تھا لیکن آج میں تمہارے سامنے سر اٹھانے کے قابل ہو رہا ہوں۔ چلو اچھا

ہے' کل کوئی مجھے طعنہ تو نہیں دے سکے گا۔"

"قاسم بخش میری بات سنو۔"

قاسم بخش نے تیز لہجے میں میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "میں تمہارے ایک ایک احسان کا بدلہ ضرور چکاؤں گا۔ میں تمہاری خواہش پوری کر کے رہوں گا لیکن یہ کام میں اپنے ہاتھوں انجام نہیں دوں گا۔"

"یہ کام کسی دوسرے آدمی کے بس کا نہیں۔"

"میری نظر میں مجھ سے کہیں بہتر' بھروسے کے لائق میرا ایک آدمی ہے۔" قاسم بخش نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "لیکن میری ایک شرط ہے۔"

"مجھے ہر شرط منظور ہے!"

"تم میرے آدمی سے مہ جبیں کی بازیابی کے واقعے کا کوئی تذکرہ نہیں کرو گے!" قاسم نے شکستگی سے کہا۔ "اگر اس کے علم میں یہ بات آگئی کہ میں جس لڑکی کو کسی مجبوری کے تحت' تمہارے ایماء پر اغوا کرانا چاہتا ہوں اور میں نے اس لڑکی کو بہن بنایا ہوا ہے تو میرا آدمی سب سے پہلے تمہیں قتل کر دے گا اور پھر میرے منہ پر تھوک دے گا۔"

"میرے بدن میں چونٹیاں سی رینگنے لگیں' خوف سے میں نے جھرجھری لی۔ "تمہارا یہ راز میرے سینے میں دفن رہے گا۔"

"کیا تم میری زندگی پر ایک احسان کرنا پسند کرو گے؟"

"میں تمہارے لیے اپنی جان بھی نثار کر سکتا ہوں!" میں نے جذباتی ہو کر اس کا بازو تھام لیا۔ "تم جب چاہو' مجھے آزما سکتے ہو۔"

قاسم بخش نے حقارت کے انداز میں اپنا بازو چھڑا لیا۔ "تم یہ بتاؤ کہ مجھ پر اپنا آخری احسان کرو گے یا نہیں' میں تمہاری جان لے کر کیا کروں گا؟"

قاسم بخش کے نفرت انگیز رویے نے میرا دل اندر سے بجھا دیا۔ میں اپنی غرض کے لیے اس کا محتاج نہیں تھا۔ میں اپنی اس بے غیرتی کو سہہ گیا۔ میں نے مردہ لہجے میں کہا۔ "حکم دو' میں تمہاری ہر بات ماننے کو تیار ہوں۔"

"تم!" وہ ہچکچایا اور اس نے لرزیدگی سے کہا۔ "آئندہ کبھی میری چوکھٹ پر قدم نہیں رکھو گے!"

"لیکن قاسم بخش-" میں سٹپٹا گیا- اس لمحے میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس بے رحم فیصلے کے خلاف کیسے اپیل کروں- وہ مجھے شش و پنج میں چھوڑ کر دروازے کی جانب بڑھا- اس نے دروازے کے پاس پہنچ کر کہا- "میں اپنے آدمی کو لینے جا رہا ہوں- کچھ دیر میں واپسی ہوگی' انتظار کر لینا-" میں چارپائی پر کسی ٹوٹی ہوئی شاخ کی مانند بکھر گیا- میں قاسم بخش کی ناراضگی مول لینا نہیں چاہتا تھا- وہ بڑے کام کا آدمی تھا- ہر آڑے وقت میں ساتھ دے سکتا تھا- اگر مہ جبیں کے علاوہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو میں قاسم بخش کو ناراض نہیں کرتا لیکن مہ جبیں کو پانے کے لیے تو قاسم بخش جیسے ہزاروں دوستوں کو قربان کیا جا سکتا تھا- میں نے یہ سوچ کر اپنے آپ کو تسلی دی کہ مہ جبیں سے شادی کرنے کے بعد جب حالات معمول پر آجائیں گے تب قاسم بخش کو منانا کچھ مشکل نہیں ہوگا- اس خیال نے مجھے پھر سے تازہ دم کر دیا-

قاسم بخش کو گئے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی لیکن وقت بے رحم بن کر میرے اعصاب پر سوار ہو گیا تھا- میں بے چین ہو کر کمرے میں ٹہلنے لگتا یا چارپائی پر لیٹ جاتا لیکن میری نگاہ بار بار دروازے کی جانب اٹھ جاتی تھی- جب قاسم بخش کا چہرہ دروازے میں ابھرا تو میرے اندر خوشی کی لہر اٹھی- اس کے پیچھے پیچھے ایک شخص بڑے مودبانہ انداز سے اندر داخل ہوا اور کسی غلام کی طرح ایک جگہ کھڑا ہو گیا-

اس شخص پر نگاہ پڑتے ہی مجھے جھرجھری آگئی- میری رگوں میں خون منجمد ہونے لگا- میں نے چند ثانیوں میں جانے کتنی ہی مرتبہ اس کی جانب دیکھا اور لرز لرز گیا- اس کا چہرہ پیشہ ور اور سفاک قاتل کی مانند دکھائی دے رہا تھا- اس کی بڑی بڑی' وحشی' خوف ناک آنکھوں میں درندگی کی جھلک صاف نمایاں تھی- وہ مجھے پہلی ہی نظر میں انتہائی کمینہ اور خودغرض آدمی لگا- میں ہی نہیں بلکہ کوئی اور شخص بھی اس پر بھروسا کرنا حماقت سمجھتا- جب ہی میرے دل میں شک کی لہر اٹھی کہ کہیں قاسم بخش اس شخص کے ذریعے میرے ساتھ کوئی چال چل کر میرے مشن کو ناکام بنانا تو نہیں چاہتا ہے؟ قاسم بخش ان بدمعاشوں میں سے نہیں تھا جو اپنی بات سے پھر جاتے ہیں- اس نے اپنے ساتھی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے تعارف کرایا- اس کا نام عبدل ہے' یہ میرا خاص آدمی ہے سر" قاسم بخش نے عبدل کی جانب گھوم کر میرا تعارف کرایا- "یہ میرا گہرا دوست فرید احمد ہے- ایک ایسا

دوست جس پر مجھے ہمیشہ فخر رہا تھا۔" قاسم بخش کے آخری جملے کے طنز کو میں محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔

عبدل نے مجھے بڑے تپاک سے سلام کیا اور میرے سامنے پڑی ہوئی چارپائی پر دھپ سے بیٹھ گیا۔ میں اس کی صورت سے اس قدر متنفر ہو گیا تھا کہ اس کی خدمات حاصل کرنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ میرے ذہن میں کتنے ہی خدشات کیڑے مکوڑوں کی طرح کلبلانے لگے۔ اگر یہ بدمعاش مہ جبیں کے بے مثال حسن پر ریجھ گیا اور اسے اغوا کر کے کہیں روپوش ہو گیا تو میں کیا کروں گا؟ مہ جبیں اور اس بدمعاش کو کہاں کہاں تلاش کرتا پھروں گا۔ اس بدمعاش کا مہ جبیں کو دیکھ کر بہک جانا یقینی امر تھا۔ مہ جبیں کا پرکشش سراپا ایک مرد کو آسانی سے للچا اور ورغلا سکتا تھا۔ ایسے بہت سارے واقعات میرے علم میں تھے۔ عبدل ایک خطرناک بدمعاش دکھائی دے رہا تھا۔ وہ مہ جبیں جیسی حسین لڑکی کی خاطر دنیا سے لڑ بھڑ جانے کا حوصلہ رکھتا تھا۔

قاسم بخش نے جیسے میرے ارادوں کو بھانپ لیا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ "تم مجھ سے زیادہ اس شخص پر بھروسا کر سکتے ہو' اگر اس نے تمہارے ساتھ کوئی دھوکے بازی کی تو میں اسے قتل کر دوں گا۔"

قاسم بخش کی بات نے میرے دل کو بڑی ڈھارس بندھائی۔ میری نگاہ غیر ارادی طور پر عبدل کی طرف اٹھی تو اس نے اپنی پلکیں جھپکاتے ہوئے کہا۔ "صاحب جی! آپ میرے چہرے مہرے اور ظاہری حالت پر نہ جائیں۔ ہم اوپر سے جس قماش کے نظر آتے ہیں' اندر سے اتنے برے نہیں ہوتے۔" اس نے توقف کر کے سانس لیا۔ "آپ میری ایک بات لکھ لیں جی۔ ہم لوگ اپنی زندگی میں اپنے استاد کا جتنا احترام کرتے ہیں اور اس پر اپنی جان نثار کرنے کے لیے جو ہر لمحے تیار رہتے ہیں' اتنا کچھ اپنے ماں باپ کے لیے بھی نہیں کرتے۔"

میرا تجربہ شاہد تھا کہ عبدل نے جو کچھ کہا ہے' وہ اپنی جگہ سو فیصد درست ہے۔ عبدل کے لہجے کی سچائی نے میرے سارے شکوک رفع کر دیئے۔ میں نے مطمئن ہو کر کہا۔ "میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ یہ کام بڑی خوش اسلوبی سے انجام پائے۔"

عبدل' قاسم بخش کی جانب دیکھ کر معنی خیز انداز سے مسکرا دیا۔ "صاحب جی! آپ

میرا کام دیکھیں گے تو اش اش کر کر اٹھیں گے۔" عبدل مجھ سے مخاطب تھا۔ "اس شہر کی کسی لڑکی کو اغوا کرنا کوئی کارنامہ نہیں ہے۔ میں پشاور سے ایک نہیں، تین چار لڑکیاں اغوا کر کے کراچی پہنچا سکتا ہوں۔ لاہور سے کراچی تک کتنے ہی کارنامے انجام دے چکا ہوں، بس آپ کی دعا چاہیے۔"

"عبدل بالکل سچ کہہ رہا ہے۔" قاسم بخش نے تائیدی انداز میں اپنا سر ہلایا۔

میں اپنی اسکوٹر پر عبدل کو بٹھا کر گلشن اقبال کے فلیٹ پر لے آیا جہاں اسے مہ جبیں کو پہنچانا تھا۔ اسے محل وقوع اچھی طرح ذہن نشین کرا دیا۔ چوکیدار سے بھی اس کا تعارف اور سامنا کرا دیا۔ جب میں اسے مہ جبیں کے گھر کی جانب لے جا رہا تھا تب اس نے مجھ سے زندہ دلی سے کہا۔ "آپ کا فلیٹ تو بڑے موقع کی جگہ پر واقع ہے۔ ہم یہاں اڈا بنا لیں تو خطرے کی بو تک نہیں آسکتی۔"

میں نے اس کی بات کا جواب دینا مناسب نہیں سمجھا۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اس نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ "اس عمارت میں صرف دو تین فلیٹ ہی آباد ہیں۔ اگر آپ مجھے ایک فلیٹ کرائے پر دلوا دیں تو میں کل ہی یہاں "وی سی آر" کا دھندا شروع کر دوں۔ آپ بھی جب چاہیں مفت میں فلمیں دیکھ لیں۔"

"یہ سارے فلیٹ برائے فروخت ہیں۔" میں نے اسے ٹکا سا جواب دیا۔

نارتھ کراچی پہنچ کر بڑے میاں کے علاقے میں، میں نے اسکوٹر ایک ایسی جگہ روک لی جو ان کے مکان سے خاصی دور تھی لیکن مکان صاف نظر آرہا تھا۔ میں نے اس مکان کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اسے بتایا۔ "بڑے میاں کی ایک ہی بیٹی ہے۔ وہ بارہ بجے دن اپنے گھر سے ملازمت پر جانے کے لیے نکلتی ہے۔ وہ طارق روڈ پر کسی بیوٹی پارلر میں ملازمت کرتی ہے اور اس کی واپسی مغرب کے بعد ہوتی ہے۔"

عبدل پوری توجہ دے کر میری باتیں سنتا رہا۔ اس نے چاروں اطراف کا سرسری جائزہ لیا۔ ہماری نظروں کے سامنے وہ سنسان اور ویران راستہ نمایاں تھا جو بس اسٹاپ کو جاتا تھا۔ اس راستے پر کوئی چہل پہل نہیں تھی۔ اس ویران میں بنی ہوئی چھوٹی سی آبادی میں مکانوں کی تعداد تھی ہی کتنی جو ہمہ وقت لوگوں کی آمد و رفت جاری رہتی۔ عبدل نے اپنا سینہ تان لیا۔ اب اس کے لہجے میں تکبر تھا۔ "صاحب جی! اس علاقے میں جب جی چاہے

گھر سے بھی لڑکی اٹھائی جا سکتی ہے۔ اگر آپ فرمائیں تو آج رات ہی اس کبوتری کو آپ کے دولت کدے پر پہنچا دوں؟"

"آج نہیں۔" میں گھبرا سا گیا۔ کہیں وہ سچ مچ مہ جبیں کو اٹھا کر ہی نہ لے آئے۔ "کل شام ڈھلنے کے بعد۔"

"ایسے مقام پر آپ بھی یہ کارنامہ بڑی آسانی سے انجام دے سکتے ہیں۔" عبدل معنی خیز انداز سے مسکرایا۔ "اس کام کے لیے مجھے صرف چٹکی بجانے کی دیر ہے۔"

میں نے اسے مہ جبیں کے حلیے وغیرہ کے بارے میں بڑی تفصیل سے بتا دیا۔ جیب سے ایک ہزار روپے نکال کر اس کی جانب بڑھا دیے۔ "ایک ہزار روپے پیشگی دے رہا ہوں۔ دو ہزار روپے لڑکی پہنچ جانے پر مل جائیں گے۔"

"جو آپ خوشی سے دیں گے' وہ ہم لے لیں گے۔" عبدل نوٹ جیب میں رکھتے ہوئے خوشامدانہ انداز سے بولا۔ "اگر مجھے تن تنہا یہ کام انجام دینا پڑتا تو آپ سے ایک پیسہ بھی نہ لیتا۔ یہ روپے تو میں اپنے ساتھیوں اور گاڑی والے کو دے دوں گا۔"

"میں کسی کا حق نہیں مارتا ہوں۔" میں نے اسے تسلی دی۔ "میں کل کامیابی پر مزید انعام بھی دوں گا۔ شکار ہاتھ سے جانا نہیں چاہیے۔"

میں نے عبدل کے کہنے پر اسے لیاری کے علاقے میں ایک ہوٹل پر اتار دیا۔ وہ ہوٹل منشیات کے عادی لوگوں اور بدمعاشوں کا اڈا بنا ہوا تھا۔ اسی قماش کے لوگ اندر اور باہر بیٹھے ہوئے نظر آرہے تھے۔ عبدل کو اسی ہوٹل سے اپنے ساتھی اکٹھے کرنے تھے اور ان کے ساتھ مل کر مہ جبیں کے اغوا کا پروگرام ترتیب دینا تھا۔ وہ دو تین آدمیوں کے بغیر کسی منصوبے پر عمل نہیں کر سکتا تھا کیونکہ ایک لڑکی کو سرراہ اٹھا لینا ایسا آسان بھی نہیں تھا جیسے وہ راستے میں پڑی ہوئی کوئی چیز ہو۔

میں اپنے گھر کی جانب لوٹتے ہوئے بہت خوش ہو رہا تھا۔ عبدل بڑے کام کا آدمی لگا۔ اس جیسے بدمعاش کے لیے اغوا کی واردات کامیابی سے نمٹانا کچھ مشکل نہیں تھا۔ یہی حال کبھی قاسم بخش کا ہوا کرتا تھا۔ وہ میرے ایماء پر ہر اس لڑکی کو اغوا کر کے بڑی آسانی سے فلیٹ پر پہنچا دیتا تھا جس کی طرف میں صرف اشارہ کر دیتا تھا۔

رات مجھ پر بڑی بھاری رہی۔ اس سے پہلے کبھی شاید ہی ایسا ہوا ہو۔ میں بستر پر

کروٹیں بدل بدل کر کل کے بارے میں سوچتا رہا۔ میں نے تصور میں مہ جبیں کو پوری طرح اپنی دسترس میں دیکھا اور دیکھتا رہا۔ اسی عالم میں صبح ہو گئی۔ میں نے گھر والوں سے چار دن کی غیر حاضری کا ایک خوبصورت سا بہانہ گھڑ دیا۔ مجھے اس فلیٹ میں چار روز تک مہ جبیں کے ساتھ رات دن گزارنے تھے۔ میں اسے ایک لمحے کے لیے بھی تنہا چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتا تھا۔ اس کی سخت نگرانی کرنے کے لیے چوکس رہنا بے حد ضروری تھا۔ میری ذرا سی بھی کوتاہی اسے فرار کا موقع فراہم کر سکتی تھی۔ وہ میری غرض کا نشانہ بن کے کہیں کی نہیں رہتی' تب میں اسے سمجھانا چاہتا تھا کہ "مہ جبیں حقیقت پسندی کا تقاضا یہی ہے کہ حالات سے سمجھوتا کر کے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے میری ہو جاؤ۔ اس لیے کہ اب تم کسی اور کے قابل نہیں رہی ہو۔ کوئی دوسرا مرد مسلا ہوا پھول اپنے سینے پر سجانا پسند نہیں کرے گا۔"

مجھے ان حالات میں اس خبیث بڈھے سے کوئی خطرہ لاحق نہیں تھا۔ اس بدلی ہوئی صورت میں اسے میرا کچھ بگاڑنے کا حوصلہ نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ اس کی سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ وہ ایک قلاش' غریب اور بوڑھا شخص تھا اور اپنی جوان بیٹی کی روزی پر پل رہا تھا۔ اس عمر میں وہ تھانوں اور عدالتوں کے چکر لگانے سے رہا۔ ان کے اخراجات اٹھانا اس کے بس کی بات بھی نہیں تھی۔ وہ دور اندیش' تجربہ کار اور زمانہ شناس تھا۔ اسے اتنا احساس تو یقیناً ہو گا کہ پولیس میں رپورٹ درج کرانے کا مطلب کیا ہے۔ اس کی حسین بیٹی آئے دن اخبارات کی سنسنی خیز خبروں کا موضوع بنتی رہے گی۔ وہ دونوں کسی محلے میں رہنے اور اپنا منہ دکھانے کے قابل بھی نہیں رہیں گے۔ اسے میرے ساتھ سمجھوتا کرنے میں بہتری نظر آئے گی۔ دوسری جانب مہ جبیں تھی۔ آخر وہ کب تک مجھ سے نفرت کرتی رہے گی۔ میں اسے روپوں میں تول دوں گا اور تولتا رہوں گا تو اس کے دل کی ساری کثافت دھل کر رہ جائے گی۔

گو کہ میرے پاس سارا دن تھا لیکن ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے بہت کم وقت میرے پاس بچا ہوا ہے۔ مجھے شام تک بہت سارے کام انجام دینے تھے۔ میں نے فلیٹ پر پہنچ کر چوکیدار کو ساتھ لیا۔ آخر وہ میرا ہمراز اور پالتو تھا۔ میں نے طارق روڈ سے مہ جبیں کے لیے ایک عروسی جوڑا اور چند جوڑے عام استعمال کے لیے خریدے۔ سینڈلیں' پلنگ کی

چادریں، میک اپ کا سامان اور پھول خرید کر فلیٹ واپس پہنچا۔ ہم دونوں مل کر فلیٹ کی صفائی اور آرائش و پیراستگی میں جٹ گئے۔ باورچی خانے میں کھانے پینے کے لیے اس قدر چیزیں اسٹاک کر دیں کہ چار پانچ دنوں کے لیے کافی تھیں۔ یوں بھی چوکیدار ہمہ وقت خدمت کے لیے ہی حاضر رہتا تھا۔ میں اپنے ایک دوست کے ہاں سے وی سی آر اور ہر قسم کی فلمیں بھی لے آیا کہ میں اور مہ جبیں بور نہ ہوں۔ وہ فلمیں مہ جبیں کی سوچ پر اثرانداز ہو سکتی تھیں۔ ان تمام کاموں سے فراغت کے بعد میں چوکیدار کے ہمراہ عمر خان کے ہاں پہنچا۔ وہ ایک فراڈیہ شخص تھا۔ وہ قاضی کا روپ بدل کے نکاح پڑھوا کر جعلی نکاح نامے جاری کیا کرتا تھا۔ اس سے ایک ہزار روپے میں معاملہ طے ہوا۔ میں نے اسے پیشگی پانچ سو روپے دیتے ہوئے تاکید کی کہ وہ شام چھ بجے کے بعد سے کہیں نہیں جائے گا، اپنے گھر پر رہے گا۔

سہ پہر کو میں نے اپنے حجلۂ عروسی کا جائزہ لیا تو رواں رواں خوش ہو گیا۔ میری لمبی چوڑی مسہری کے خوبصورت اور نرم و نازک بستر پر ایک کلی پھول بن کر کھلنے والی تھی۔ اب تک جتنی کلیاں کھلی تھیں، آج ان سب کا حسن گرد بن کر اڑنے والا تھا۔ اس بستر نے کبھی ایسی نازک سی کلی کی مہک اور اس کا گداز محسوس نہیں کیا تھا۔

میں نے ملاقاتی کمرے میں نکاح پڑھوانے کا بندوبست کر دیا تھا۔ اس کمرے کے قالین پر چاندنی بچھا دی۔ دوسرے کمرے میں مہ جبیں کو سنوارنے اور دلہن بنانے کی ساری ذمہ داری چوکیدار کی بیوی کی تھی۔ میں نے نہ صرف روایتی انداز کو برقرار رکھا تھا بلکہ یہ تقریب خوش اسلوبی سے انجام کو پہنچانا چاہتا تھا۔ یکایک مجھے زیورات کا خیال آیا تو میں دوڑ کر زیورات کا ایک سیٹ بھی خرید لایا۔

میں نے دولہا بننے کی تیاری شروع کر دی۔ جب میں پوری تیاری کے ساتھ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے آپ کو تعریفی نگاہ سے دیکھ رہا تھا، اسی اثناء میں چوکیدار اندر داخل ہوا۔ وہ میری سج دھج کو دیکھ کر زیر لب مسکرایا۔ "بڑے صاحب! آپ نے اس سے پہلے کبھی کسی لڑکی کے لیے گھر میں ایسا شاندار انتظام اور اہتمام نہیں کیا تھا اور آپ نے کبھی دولہا بننے کی کوشش نہیں کی تھی۔ جس لڑکی کے لیے یہ سب کچھ ہو رہا ہے، کیا وہ کوئی پری ہے؟"

میں بے اختیار ہنس دیا۔ "گل خان! تم دیکھ کر بتاتا کہ کبھی ایسی حسین لڑکی تم نے اپنی زندگی میں دیکھی ہے؟ وہ پریوں کی شہزادی ہے!"

"آپ کا انتخاب تو ہمیشہ سے لاجواب ہوتا ہے۔" چوکیدار نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ اپنے انعام کے لیے قبل از وقت منہ کھول رہا ہے۔ تعریف کے پل باندھ کر اپنا الو سیدھا کرنا چاہتا ہے۔ میں اس وقت گل خان کے لالچی پن پر خار کھا کر رہ گیا۔ میں اگر اس پر کسی ناگواری کا اظہار کرتا تو وہ شاید برا مان جاتا۔ میں نے اپنی جیب سے سو کا ایک نوٹ نکال کر اس کی جانب بڑھا دیا۔ "تمہیں میری شادی کے بعد مزید انعام ملے گا۔" میں زبردستی مسکرایا۔ مرتا کیا نہ کرتا' اس کے تعاون کے بغیر ایک قدم آگے بڑھانا ممکن نہیں تھا۔ مجھے اس سے بہت سارے کام لینے تھے۔ وہ اس بساط کا اہم مہرہ تھا۔ ایک سو روپے کا نوٹ دیکھ کر اس کا چہرہ یکلخت کھل اٹھا اور وہ سو روپے کا نوٹ اپنی جیب میں ٹھونستا ہوا تیزی سے باہر نکل گیا۔

دن ڈوبتے ہی شام کے سائے گہرے ہونے لگے۔ عمارت کے بیرونی دروازے پر چوکیدار پوری طرح مستعد تھا کیونکہ مہ جبیں کے یہاں پہنچتے ہی اسے سب سے پہلے اسکوٹر پر جا کر اپنی بیوی کو لے کر آنا تھا۔ قاضی کو لے کر آنا بھی اسی کی ڈیوٹی تھی۔ مجھے اس کار خیر میں ایک لمحے کی تاخیر بھی گوارا نہیں تھی۔ ہر کام تیزی سے نمٹانا دانشمندی تھی۔ میں بالکنی میں مضطرب سا ہو کر کھڑا رہا۔ میری نگاہ اس راستے پر جمی ہوئی تھی جو اونچی اور چھدری جھاڑیوں کے بیچ بل کھاتا ہوا مین روڈ کی جانب چلا گیا تھا۔ اسی راستے سے عبدل کو پہنچنا تھا۔ میری روح ایک انجانی خوشی سے سرشار ہو رہی تھی۔ مہ جبیں کا دلکش سراپا میری نظروں میں رقصاں ہونے لگا۔ کچھ دیر بعد وہ میری ملکیت بننے والی تھی۔

رات کی تاریکی بڑی تیزی سے پھیلتی اور گہری ہوتی جا رہی تھی۔ اجالا کسی سمت بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ جب ہی ایک ایک لمحہ صدی کی مانند طویل ہو کر میرے وجود پر بھاری ہو گیا۔ وہ ساعت ابھی نہیں آئی تھی جس کے لیے میں بے تاب ہو کر کسی زخمی پرندے کی مانند پھڑپھڑا رہا تھا۔ میرا دل بالکنی سے ہٹ کر اور کمرے میں بیٹھ کر انتظار کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ میں وہیں پتھر کی طرح منجمد ہو کر رہ گیا۔ چوکیدار نے ایک دو مرتبہ اوپر آ کر تشویش سے دریافت کیا تھا۔ "بڑے صاحب! خیریت تو ہے نا؟ وہ پریوں کی شہزادی

ابھی تک کیوں نہیں لائی گئی ہے؟" اسے محض اپنے انعام سے غرض تھی' وہ اس لیے بے چین تھا۔ میں نے اسے مناسب جواب دے کر بھیج دیا لیکن اس تاخیر پر میرا ماتھا ٹھنکا۔ میں پریشان اور بے کل ہو کر اپنے آپ کو جھوٹی تسلیاں دینے لگا۔ کتنے ہی وسوسے ذہن میں لہرا کے مجھے پاگل بناتے رہے۔ رات کے نو بج گئے' عبدل کا دور دور تک نام و نشان نہیں تھا۔ میں ناامید ہونے لگا۔ معاً میرے ذہن پر ہتھوڑے برسنے لگے۔ "عبدل کو شاید کسی وجہ سے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا ہوگا یا پھر قاسم بخش نے اپنے ضمیر کی احمقانہ باتوں میں عبدل کو بھی ورغلا دیا ہوگا کہ اس ذلیل کام کو ہاتھ بھی نہیں لگانا' کیوں ایک شریف لڑکی کی زندگی تباہ کرنے کے درپے ہو؟ جب ہی عبدل میرے دیئے ہوئے ایک ہزار روپے ہڑپ کر کے بیٹھ گیا ہوگا یا کسی جوئے کے اڈے پر بڑی شان سے بیٹھا ہوا داؤ پر رقم لگا رہا ہوگا۔ ان خیالات نے میری رگوں میں لہو کو گرما دیا۔ میرا سارا جسم جھن جھنا اٹھا۔ میری کنپٹیاں دہکنے لگی تھیں۔ میں غصے کی آگ میں جلتے ہوئے کمرے کے اندر جانے کی سوچ رہا تھا کہ دفعتاً" تیز اور آنکھوں کو چندھیا دینے والی روشنی سے ویران جھاڑیاں اور راستہ جگمگا اٹھا۔ دور سے ایک گاڑی بڑی تیزی سے فرّاٹے بھرتی ہوئی اسی سمت آرہی تھی۔ میرے دل سے یکلخت ساری کثافت دھل گئی اور غصہ جھاگ بن کر بیٹھ گیا۔

جب وہ گاڑی اس عمارت کے بیرونی دروازے کے پاس رکی تو میں نے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر جائزہ لینے کی کوشش کی۔ ادھر کی بتی آج دانستہ بجھی رہنے دی تھی تاکہ اس عمارت کے ایک دو مکینوں کے علم میں یہ واقعہ نہ آسکے۔ گاڑی کے اگلے حصے کا دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا' جو شخص باہر آیا وہ اپنے ڈیل ڈول سے عبدل لگ رہا تھا۔ عبدل نے پچھلی نشست میں جھانک کر اپنے ساتھیوں سے کچھ کہا لیکن میں دوسری منزل پر کھڑے ہونے کے باعث کچھ بھی نہ سن سکا۔ عبدل وہاں سے ہٹ کر عمارت کے اندر داخل ہو گیا تھا۔ دوسرے لمحے گاڑی کی پچھلی نشست کے دونوں دروازے ایک جھٹکے کے ساتھ کھلے۔ ایک طرف سے ایک بدمعاش باہر آیا تو اس نے مہ جبیں کو قربانی کے جانور کی طرح بے رحمی سے باہر گھسیٹا۔ دوسرے دروازے سے باہر آنے والا بدمعاش جس کے ہاتھ میں چاقو تھا اور اس کی دھار اندھیرے میں چمک رہی تھی' اس نے مہ جبیں کی نظروں کے سامنے چاقو نچایا۔ مہ جبیں کے حلق سے ایک گھٹی گھٹی سی آواز نکلی جو تھرتھرا رہی تھی۔ "خدا کے

لیے مجھے چھوڑ دو۔ مجھ پر رحم کرو۔ میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گی۔" جب اس نے اپنا چاقو مہ جبیں کے دھڑکتے سینے پر رکھا تو وہ خاموش ہو کر ایک دو قدم چلی اور بدمعاش کی گرفت ڈھیلی پا کر اس نے ایک جھٹکے سے اپنے آپ کو چھڑا لیا اور پلٹ کر تیزی سے جدھر منہ اٹھا' بھاگ نکلی۔ وہ سر بہ سر سفید لباس میں ملبوس تھی جب ہی تو اس گھپ اندھیرے میں وہ جگنو کی طرح جگمگا رہی تھی۔ اگر اس کے جسم پر رنگین کپڑے ہوتے تو شاید اندھیرا اسے اپنے اندر نگل لیتا لیکن وہ چاندنی کی طرح نمایاں ہو رہی تھی۔ وہ دونوں بدمعاش اس کے پیچھے دوڑے لیکن مہ جبیں کی رفتار بدمعاشوں کے مقابلے میں کہیں تیز تھی۔ وہ ان کے ہاتھ نہیں آسکی۔ وہ تینوں چھدری جھاڑیوں کے عقب میں چلے گئے۔ ڈرائیور نے جلدی سے گاڑی اسٹارٹ کی اور وہ بھی تعاقب میں چل پڑا۔

عبدل کو اس غیر متوقع اور اچانک پیش آنے والے سنگین واقعے کی خبر نہیں تھی۔ وہ میرے فلیٹ کے اندر داخل ہو کر مجھے آواز دینے لگا تو میں نے اسے بالکنی میں بلا لیا۔ میں نے اسے مہ جبیں کے فرار کا واقعہ سنایا تو وہ بے پروائی سے بولا۔ "آپ فکر نہ کریں' وہ بچ کر کہاں جائے گی؟ احمق کہیں کی۔" اس نے توقف سے کہا۔ "صاحب جی! مجھے آج تک ایسی تیز و طرار عورت سے واسطہ نہیں پڑا۔ وہ تو ہم چاروں کے لیے ناگن بن گئی تھی۔ اس نے کسی کو بھی نہیں بخشا۔ کسی کا منہ نوچ لیا تو کسی کے منہ پر تھوک دیا۔ ایک کے بال پکڑ کر کھینچے تو دوسرے کے منہ پر تھپڑ دے مارا۔ خدا کی قسم! اس نے ہم سب کو ننگی کا ناچ نچا دیا۔ اسے قابو کرنے میں پورا ایک گھنٹہ لگ گیا۔ اگر آپ نے اس کے بارے میں کوئی تاکید نہ کی ہوتی تو میں اس کے چہرے کا نقشہ بگاڑ دیتا۔"

میں نے سراسیمہ ہو کر پوچھا۔ "کہیں تمہارے کسی ساتھی نے اسے زخمی تو نہیں کر دیا؟"

"ہم اسے کیا زخمی کرتے بلکہ خود ہی زخمی ہو کر یہاں پہنچے ہیں۔" عبدل نے جواب دیا۔ "ہمیں اسے چپ کرانے اور دہشت زدہ کرنے کے لیے چاقو اس کے نرخرے پر رکھنا پڑا' تب وہ کہیں جا کر چپ ہوئی۔ اگر ہم ایسا نہیں کرتے تو راستے میں کسی نہ کسی جگہ وہ موقع پا کر چیختی اور چلاتی اور ہم سب دھر لیے جاتے۔"

"کہیں اسے کوئی خراش تو نہیں آئی؟"

"نہیں جی۔" عبدل نے بڑے وثوق سے کہا۔ "اگر اس کے جسم یا چہرے پر کوئی خراش نظر آئے تو جو جی چاہے، سزا دے لیں۔"

میں اور عبدل گاڑی کو دیکھنے لگے جو ہماری سمت تیزی سے آرہی تھی۔ میں نے اطمینان کا گہرا سانس لیا ورنہ میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی تھی۔ مہ جبیں کے ہاتھ سے نکل جانے کا اتنا غم نہیں تھا بلکہ میں پولیس کیس بننے کے پھڈے سے خائف تھا۔ کسی اسکینڈل سے میری برسوں پرانی اور منفعت بخش نوکری ہاتھ سے چلی جاتی۔ عبدل نے کسی فاتح جرنیل کے لہجے میں کہا۔ "صاحب جی! میں نہیں کہتا تھا کہ وہ بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتی ہے۔"

گاڑی کے رکتے ہی دونوں بدمعاش مہ جبیں کو باہر گھسیٹتے ہوئے لائے۔ ان دونوں نے مہ جبیں کی بانہوں پر اپنی گرفت بڑی مضبوط اور سخت کر رکھی تھی۔ جب وہ مہ جبیں کو عمارت کے بیرونی دروازے کی جانب لے جا رہے تھے، مہ جبیں اپنی مزاحمت برابر جاری رکھے ہوئی تھی۔ میں اور عبدل ملاقاتی کمرے میں آگئے۔ عبدل نے فکرمند لہجے میں پوچھا۔ "صاحب جی! آپ تن تنہا اس عورت کو کیسے سنبھالیں گے؟ وہ فتنہ ہے۔ اس سے تو شیطان بھی پناہ مانگے گا۔"

"تم فکر نہ کرو۔ میں سنبھال لوں گا۔" میں نے اسے جواب دیا۔

محشر کی اس گھڑی کے آنے میں چند لمحوں کی بھی دیر نہیں رہی تھی جس کے لیے میں جیسے ایک صدی سے مضطرب اور منتظر ہو رہا تھا۔ زینے پر جیسے جیسے مہ جبیں اور ان بدمعاشوں کے قدموں کا گونجتا ہوا شور قریب آرہا تھا، ویسے ویسے میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہوتی جا رہی تھیں۔ اسی لمحے جانے کیوں یکبارگی مجھے پچھتاوا سا ہونے لگا کہ مجھے مہ جبیں کے ساتھ ایسا ذلیل اور گھٹیا کھیل کھیلنا نہیں چاہیے تھا۔ وہ ایک نفیس، نرم و نازک اور آئینہ جیسی صاف شفاف لڑکی ہے جس پر ایک خراش تک نہیں ہے۔ وہ میرے بارے میں اچھی رائے قائم نہیں کرے گی۔ اس کے دل میں میرے ایک احسان کے باعث جو تھوڑی بہت جگہ ہے، اس سے بھی محروم ہو جاؤں گا۔ وہ مجھے ان بدمعاشوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ذلیل اور کمینہ سمجھے گی۔ اسے میرے منہ پر تھوکتے ہوئے ذرہ برابر بھی دکھ نہیں ہوگا، وہ میرا چہرہ اپنے ناخنوں سے لہولہان کر سکتی ہے۔ اس لیے کہ اسے اپنی زندگی

سے کہیں زیادہ عزت و آبرو کا خیال ہے۔ وہ اس کے لیے مر سکتی ہے اور مر بھی جائے گی لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ کمان سے جو سنسناتا ہوا تیر نکل گیا تھا' وہ میرے دل میں پیوست ہونے ہی والا تھا۔

جب وہ تینوں اندر داخل ہوئے تو سب سے پہلے میری نظر مہ جبیں پر پڑی۔ میں نے اس کی جانب خجالت سے دیکھا۔ جیسے میں اس کا مجرم ہوں' وہ اپنا چہرہ دوپٹے میں ڈھانپے ہوئی تھی اور بلکتی جا رہی تھی۔ وہ ہار جو چکی تھی۔ اس میں مزاحمت کی قوت کہاں سے آتی۔ ا دونوں بدمعاشوں کے چہرے متوحش اور زخمی ہو رہے تھے۔ جابجا خراشیں پڑی ہوئی تھیں اور خون رس کر بند ہو چکا تھا۔ ان کی آنکھیں خوف و ہراس سے سہی ہوئی تھیں۔ انہیں خطرہ تھا کہ کہیں مہ جبیں ایک مرتبہ پھر کسی بپھری ہوئی شیرنی کی مانند ان کے چہروں پر اپنے پنجے نہ گاڑ دے۔ جب ہی دونوں چوکنے اور پریشان ہو رہے تھے۔ عبدل نے تیزی سے آگے بڑھ کر دروازہ بند کر دیا۔ میرے پاس آکر اس نے مہ جبیں پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالی اور فاتحانہ لہجے میں کہا۔ "صاحب جی! اب آپ اپنی امانت سنبھالیں۔"

مہ جبیں نے عبدل کی بات سن لی تھی۔ جب ہی اس نے بلکنا موقوف کر دیا اور اپنے چہرے پر سے دوپٹا ہٹایا۔ میری نظریں اس کی بھیگی بھیگی اور خوف سے پھٹی پھٹی آنکھوں سے چار ہوئیں' میرے پیروں تلے زمین ہلنے لگی اور ایک بھونچال سا آگیا۔ میرا دماغ چکرانے لگا اور آنکھوں کے سامنے کی ہر چیز دھندلا گئی۔ میرے سر کے چکر تھمے تو میں نے آگے بڑھ کر عبدل کا گریباں وحشت میں پکڑ لیا۔ "یہ تم کسے اٹھا لائے؟"

"ایک عورت کو!" عبدل نے بے ساختہ جواب دیا۔

"میں کب کہہ رہا ہوں کہ یہ جانور ہے!" میں غصے سے دھاڑا۔ "یہ وہ لڑکی نہیں ہے؟"

"ایں!" عبدل کا چقندر جیسا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ وہ اپنی جگہ سے اس طرح اچھلا جیسے میں نے اس کے بدن پر کسی تیز دھار والی چیز کی انی چبھو دی ہو۔ چند لمحوں تک اس پر سکتے کی سی کیفیت طاری رہی۔ اس نے یکایک چونک کر اپنے دونوں ساتھیوں کی جانب وحشت اور سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ اس کے ساتھیوں نے بے پروائی سے اپنے دونوں کندھے اچکائے۔ عبدل نے گھبرا کے اس عورت کو غور سے دیکھا اور میری طرف متوجہ ہو

کر بولا۔ "ہم چاروں نے اسے ایک بجے دن اسی گھر سے باہر آتے ہوئے دیکھا تھا اور رات آٹھ بجے وہ بس سے اتر کر اسی مکان کی جانب جا رہی تھی۔ آپ اس سے پوچھ لیں...... یہ وہی لڑکی ہے یا نہیں۔"

میں عبدل پر برس پڑا۔ "ایک تیس سال کی عورت تمہیں لڑکی دکھائی دے رہی ہے۔" میں نے اپنا سر پیٹ لیا۔ "کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ وہ لڑکی اٹھارہ بیس سال کی ہے اور اس قدر حسین ہے کہ لاکھوں میں ایک لڑکی بھی ایسی نظر نہیں آئے گی؟ کیا تم اندھے ہو گئے تھے جو اس عورت کو اٹھا لائے؟"

"صاحب جی! آپ نے کہا تھا کہ وہ لڑکی سفید لباس پہنتی ہے اور دوپہر کے وقت گھر سے باہر نکلتی ہے۔" عبدل نے اپنی صفائی پیش کی۔ "بس جی...... ذرا سی حماقت ہو گئی۔ ہم نے خوبصورت' بدصورت کا کوئی خیال ہی نہیں کیا۔"

"اس کا یہ مطلب تو نہیں ہوا کہ کسی بھی سفید لباس میں ملبوس گزرتی ہوئی عورت کو اٹھا لاؤ۔"

"آپ اس عورت سے پوچھ لیں۔ کیا وہ اس گھر سے باہر نہیں نکلی تھی؟" عبدل اپنی بات پر ڈٹا ہوا تھا۔ "مجھے کیا معلوم کہ اس گھر کی ہر عورت سفید لباس پہنتی ہے۔"

میں نے اس عورت کی جانب متوجہ ہو کر پوچھا۔ "کیا یہ شخص جو کچھ کہہ رہا ہے' وہ سچ ہے؟"

معاً مجھے یہ خیال بھی آیا کہ کہیں یہ عورت مہ جبیں کی بڑی بہن نہ ہو۔ اگر وہ مہ جبیں کی بڑی بہن ہوئی تو سارا معاملہ چوپٹ ہو جائے گا۔ میں اس خیال سے سراسمہ ہو گیا۔ اس عورت نے سسکتے ہوئے اثباتی انداز میں سر ہلایا۔ وہ ہچکیاں لیتی ہوئی کہنے لگی۔ "میں اظہار اسپتال میں نرس ہوں۔ میں ایک بجے دن اس مکان میں ایک بیمار شخص کو انجکشن لگانے گئی تھی اور رات کے وقت اس کو دوسرا انجکشن لگانے جا رہی تھی کہ ان چار آدمیوں نے مل کر مجھے زبردستی گاڑی میں ڈال لیا اور یہاں لے آئے۔"

آج کی رات میرے پروگرام کا ستیاناس ہو گیا تھا۔ میں نے اس پر ایک بھرپور نگاہ ڈالی۔ اگر وہ اپنے اندر کسی قدر دلکشی رکھتی ہے تو میں یہ رات اس کی نذر کر کے بوریت کی تلافی کر لوں ورنہ رات بھر کھولتا رہوں گا لیکن اس عورت کی ڈھلکتی عمر میں دلکشی نام کی

کوئی چیز نہیں تھی۔ اس کے بغیر رات گزار دینا ہی بہتر تھا۔ وہ کوئی خواہش بھی بیدار نہیں کر سکتی تھی۔ عبدل نے اس عورت کے قریب جا کر کہا۔ "معاف کرنا جی ......ہم سے غلطی ہو گئی...... آپ نیچے چل کر بیٹھیں......ہم ابھی آپ کو آپ کے گھر پہنچا دیتے ہیں۔" اس نے اپنے ایک ساتھی کو پاس بلایا۔ "اس عورت کو گاڑی میں لے جا کر بٹھاؤ' میں صاحب جی سے بات کر کے آ رہا ہوں۔"

اس نے سہم کر عبدل کی جانب شاکی نظروں سے دیکھا۔ "کیا آپ مجھے اپنے گھر پہنچا دیں گے؟" اس کی آواز میں خوف بھرا ہوا تھا جیسے وہ بلک بلک کر رو دے گی۔ "میرے بچے میرے انتظار میں پریشان ہوں گے۔ مجھ پر رحم کریں۔ میں ایک بیوہ عورت ہوں۔"

اس عورت کا آخری جملہ میرے کانوں میں گرم گرم سیسہ بن کر پگھلنے لگا۔ میں دہل کر رہ گیا۔ عبدل کی حالت تو ایسی تھی کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں ہوگا۔ اس کا چہرہ تاریک ہو کر اور خوفناک دکھائی دینے لگا۔ "بہن ہم ذلیل آدمیوں کو معاف کر دینا۔" عبدل کی آواز مرتعش ہو رہی تھی۔ "میں سچ مچ بہت شرمندہ ہوں۔"

"آپ اس کی بات کا بھروسا کر سکتی ہیں۔" میں نے عورت کو تسلی دی۔ "لیکن آپ اتنی احتیاط ضرور کریں کہ ......اس واقعے کی کسی کے کان میں بھنک نہ پڑے' یہ نہ صرف آپ کے حق میں برا ہوگا بلکہ یہ لوگ بھی بدک جائیں گے۔"

"میں ایک بیوہ عورت ہوں بابو جی!" اس عورت نے افسردگی سے جواب دیا۔ "اس معاشرے میں ہمیں ایک کنواری لڑکی سے کہیں زیادہ سنبھل کر چلنا اور رہنا پڑتا ہے۔" عورت اپنے رخساروں سے بہتے ہوئے آنسوؤں کو پونچھنے لگی۔

جب وہ عورت دونوں بدمعاشوں کے ہمراہ باہر نکل گئی تو عبدل اپنے چہرے سے پسینے کو پونچھتے ہوئے کہنے لگا۔ "صاحب جی ......یہ تو آج بہت برا ہو گیا......ہم ایک بیوہ عورت کو اٹھا لائے۔ میں جلد سے جلد اسے گھر لے جا کر چھوڑ دوں گا۔" وہ بڑا پشیمان دکھائی دے رہا تھا۔ "کل شام تک کی مہلت دے دیں ......رات ہم اس لڑکی کو ضرور پہنچا دیں گے۔"

میں ساری رات بستر پر کروٹیں بدلتا اور دن بھر آنے والی شام کا انتظار کرتا رہا لیکن میں ایک ایک لمحے جس کرب اور اذیت سے دوچار ہوا' میرا دل ہی جانتا تھا۔ میں پہاڑ سا

دن کاٹ کر مغرب کے وقت، بج دھج کر بالکنی میں کھڑا ہو گیا۔ انتظار کی کیفیت کل سے مختلف نہیں تھی بلکہ اس میں شدت پیدا ہو گئی تھی۔ میں کل رات سے اس احمق اور گدھے کو برابر کوستا اور گالیاں دیتا چلا آ رہا تھا۔ اس لیے بھی اسے بخشتا نہیں۔ رات آٹھ بجے تھے کہ دفعتاً" روشنی کا سیلاب چاروں اطراف پھیل گیا۔ وہی گاڑی بڑی تیزی سے میری سمت آ رہی تھی۔ اس گاڑی کو دیکھتے ہی میری خوشی کا پیمانہ چھلک پڑا۔ میں بے صبری سے گاڑی رکنے کا انتظار کرنے لگا۔ گاڑی جیسے ہی بیرونی دروازے پر رکی، میری سینے میں دل خوشی سے بلیوں اچھلنے لگا۔ اگلی نشست کا درواز بڑی آہستگی سے کھلا، جیسے نیچے اترنے والے کو کوئی جلدی نہیں ہے۔ اندھیرے میں عبدل کا ہی ڈیل ڈول لگ رہا تھا۔ اس نے اپنا سر اٹھا کر بالکنی کی جانب دیکھا اور زینے کی طرف بڑھ گیا۔

میں نے دیکھا کہ گاڑی کے پچھلے دروازے بدستور بند ہیں۔ وہ نہ تو کھلے اور نہ ہی ان میں سے کوئی باہر آیا۔ میرا دل بند ہونے لگا۔ تلملاتا ہوا میں کمرے میں آ گیا۔ میرے دل میں نشتر چبھنے لگے۔ عبدل خالی ہاتھ کیوں آ رہا ہے؟ مہ جبیں ساتھ کیوں نہیں ہے؟ آج کون سا واقعہ پیش آ گیا ہو گا؟

عبدل میرے کمرے میں داخل ہوا تو میں نے اس کے چہرے پر ایک عجیب سی دمک دیکھی۔ اس کی آنکھوں میں جلتے ہوئے قمقموں کی روشنی نے نہ صرف اس کی آنکھوں بلکہ اس کی ذات کو یکسر بدل کر رکھ دیا تھا۔ وہ کوئی بدمعاش نہیں بلکہ ایک آدمی دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے دل میں سوچا کہ کیا یہ بدمعاشوں کے چہرے بھی بدل جاتے ہیں؟ وہ میرے سامنے آ کر کھڑا ہوا تو اس کی بے خوفی چھپی نہیں رہ سکی۔ میں نے اپنے دھڑکتے ہوئے سینے پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔ "خیریت تو ہے عبدل! تم خالی ہاتھ کیسے آ رہے ہو؟ کیا وہ لڑکی تمہارے ہاتھ نہیں لگی؟"

عبدل جواب دینے میں پس و پیش کرنے لگا تو معاً ایک خیال کوندا بن کر لپکا کہ کہیں اس عورت نے مہ جبیں کو باخبر تو نہیں کر دیا کہ بدمعاش اسے اغوا کرنے کے لیے گھات میں بیٹھے ہوئے ہیں؟ شاید جب ہی عبدل کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔

"وہی لڑکی ملی تھی صاحب جی!" عبدل نے پر سکون لہجے میں جواب دیا۔ "آپ نے سچ ہی کہا تھا۔ وہ لڑکی ہزاروں میں نہیں لاکھوں میں ایک ہے بلکہ چاند سے بھی زیادہ حسین

ہے۔"

عبدل یکایک چپ ہو گیا تو میں نے تڑپ کر بے تابی سے دریافت کیا۔ "کہاں ہے وہ؟ کیا ٹیکسی کے اندر بیٹھی ہوئی ہے؟ اسے اوپر کیوں نہیں لائے؟ میں بے قرار سا ہو کر دروازے کی جانب بڑھتا ہوا رک گیا۔ میں نے عبدل کا ارادہ بھانپ لیا تھا' وہ بقیہ دو ہزار روپے وصول کر کے مہ جبیں کو میرے حوالے کرنا چاہتا تھا۔ ایک کمینے شخص سے اور کیا امید کی جا سکتی تھی۔

"وہ چاند تو اس وقت اپنے گھر میں جگمگا رہا ہو گا صاحب جی!" عبدل کے لبوں پر معنی خیز مسکراہٹ ابھر آئی۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" میں بدک گیا۔

"وہ لڑکی جتنی حسین ہے' اس سے کہیں زیادہ بہادر بھی ہے۔" عبدل نے جواب دیا۔ "ہماری کیا مجال کہ ہم ایک نیک سیرت اور بہادر لڑکی پر ہاتھ ڈال سکیں۔ جانے اس میں کون سی ایسی طاقت چھپی ہوئی تھی کہ ہم چاروں اس کے آگے بے بس ہو گئے تھے۔"

"کیا تم مجھے بے وقوف بنا رہے ہو!" میں بھڑک اٹھا۔ "میں تمہاری ان باتوں میں آنے والا نہیں ہوں۔ سچ سچ بتاؤ کہ اصل بات کیا ہے؟ وہ لڑکی کہاں ہے؟"

"وہ لڑکی اپنے گھر میں شاید روٹی پکا رہی ہو گی۔" عبدل کا لہجہ تمسخرانہ تھا۔

عبدل کی گول مول باتیں اور تمسخرانہ لہجہ میری سمجھ سے بالاتر تھا۔ میں نے چونک کے اسے غور سے دیکھا۔ کہیں اس نے ضرورت سے زیادہ پی تو نہیں لی ہے لیکن وہ نشے میں نہیں بلکہ پوری طرح اپنے ہوش و حواس میں تھا۔ دوسری جانب فوراً ہی قاسم بخش کا خیال آیا۔ آخر اس نے میرے خلاف سازش کر ہی دی تھی۔ وہ مہ جبیں کو اپنی منہ بولی بہن بنا کر سگی بہن کی طرح سمجھ بیٹھا تھا۔ میرے ہاتھ میں قاسم بخش کو زیر کرنے کے لیے ایک ترپ کا پتا اب بھی موجود تھا جسے میں کسی وقت بھی کام میں لا سکتا تھا۔ میں نے جزبز ہو کر اسے گھورا اور ترش روئی سے کہا۔ "یہ تم اول فول کیا بک رہے ہو؟"

عبدل پر یکلخت سنجیدگی چھا گئی۔ "کیا آپ میری باتوں کا مطلب بالکل نہیں سمجھے؟"

"نہیں۔" میں نے تعجب سے نفی میں گردن ہلائی۔

"صاحب جی! آپ جانتے ہیں ناں' ہم لوگ کس قدر بدمعاش' لوفر اور لچے لفنگے آدمی

ہیں۔" اس نے پرسکون لہجے میں ٹھہر ٹھہر کے کہنا شروع کیا۔ "جو برے آدمی ہوتے ہیں' وہ برے کام کرتے ہیں اور انہیں جیسے لوگوں کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے ہیں۔ شریف لوگ ہمیں پاس ہی نہیں بیٹھاتے اور نہ ہی پھٹکنے دیتے ہیں۔ ہم ان کے نزدیک اس لیے نہیں جاتے کہ ہمیں اپنے کردار کا احساس ہوتا ہے۔" اس نے توقف سے کہا۔ "ہم کسی مقدس چیز کو اس لیے ہاتھ نہیں لگاتے ہیں کہ نہ صرف بے ادبی ہوگی بلکہ ہاتھ بھی جل جائیں گے۔ آپ ذرا ٹھنڈے دل سے سوچیں صاحب جی! ہم حوروں جیسی حسین اور عفت ماب لڑکی کو کیونکر ہاتھ لگا سکتے ہیں۔ ذلیل اور کمینے سے کمینہ آدمی بھی ایسی حرکت نہیں کر سکتا لیکن صاحب جی!" اس کی آواز کسی انجانے دکھ سے بھرا گئی۔ "آپ کیسے سنگ دل آدمی ہیں۔ ایک چھوٹا سا پیار بھرا گھر اجاڑنے پر تلے ہوئے ہیں۔ جس کی عزت' رونق اور محبت وہ نیک لڑکی ہے۔ ہم برے آدمی ہیں' صرف بری عورتوں پر ہاتھ ڈالتے ہیں۔ اب سمجھ گئے صاحب جی!"

عبدل کی اس لمبی چوڑی اور جذباتی تقریر کا ایک ایک لفظ نیزے کی انی بن کر میرے دل کو چھید کرنے لگا۔ اس نے مجھے چراغ پا کر دیا۔ میں اپنی قوت مجتمع کر کے چیخا۔ "یہ میں جانتا ہوں کہ وہ کیا ہے اور کیا نہیں ہے۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ اسے یہاں پہنچاؤ نہ کہ یہاں آکر وعظ سناؤ۔ میں نے تمہیں جو کام سونپا' وہی کام تمہیں کرنا بھی تھا۔ میں نے اس بات پر تین ہزار روپے اور مزید انعام دینے کا وعدہ کیا تھا۔"

عبدل کے تیور بدل گئے اور اس کے چہرے پر حقارت ابھر آئی۔ "میں آپ پر اور آپ کے روپوں پر لعنت بھیجتا ہوں۔"

"میں قاسم بخش سے تمہاری مکاری اور دھوکے بازی کی شکایت کروں گا۔" میں نے طیش میں آکر مٹھیاں بھینچ لیں۔

"میں مر جاؤں گا صاحب جی...... لیکن اس چاند پر داغ تو کیا ایک خراش تک نہیں آنے دوں گا۔" عبدل نے بڑے طمطراق سے جواب دیا۔

میری نس نس میں چنگاریاں چٹخنے لگی تھیں۔ تن بدن میں ایک آگ سی کیا بھڑکی کہ میں آپے سے باہر ہو گیا۔ میرے منہ سے جھاگ اڑنے لگی۔ میں نے اس لمحے اچھا ہی کیا جو اپنے آپ پر قابو پا لیا ورنہ میں تو عبدل کو بالکنی سے دھکا دے کر نیچے گرانے ہی والا تھا۔

راستہ میرے لیے باقی رہ جاتا تھا جس پر چل کر میں مہ جبیں کو پا سکتا تھا۔

یکایک قاسم بخش کا پھر خیال آگیا۔ قاسم بخش نے مجھے تاکید کی تھی کہ میں دوبارہ اس کی چوکھٹ پر قدم نہیں رکھوں گا لیکن میں عبدل کی غداری کے بہانے جا سکتا تھا۔ مجھے عبدل کی شکایت کرنے کا پورا حق حاصل تھا۔ اسی بہانے میں قاسم بخش کی مدد سے کسی اور بدمعاش کا تعاون حاصل کر سکتا تھا۔ بڑے میاں کو اپنے ہاتھوں سے قتل کرنے سے بہتر یہ تھا کہ مہ جبیں کے اغوا کی ایک اور کوشش کی جائے۔ میں نے سوچا کہ قتل کرنے سے قانون کے ہتھے چڑھ جاؤں گا تو دین اور دنیا سے بھی گیا۔ مجھے اب قاسم بخش کی ناراضگی اور اس کی بندش کی پروا نہیں رہی۔ میں نے اس کے ہاں جانے کے لیے اپنے آپ کو ذہنی طور پر تیار کر لیا۔

اسی وقت چوکیدار ہانپتا ہوا پریشان سا کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے مجھے برہمی کے عالم میں دیکھا تو پوچھا۔ "کیا بات ہے بڑے صاحب! کیا بات نہیں بنی؟"

میں نے اسے عبدل کی باتیں من و عن بتا دیں۔ وہ بڑے انہماک سے سنتا رہا۔ اس نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھا کر پوچھا۔ "کیا آپ نے اس کی بات کا بھروسا کر لیا؟"

"اور نہیں تو کیا کرتا؟" میں نے جل کر جواب دیا۔ "کیا میں اس کا سینہ چیر کر دیکھتا کہ اس کی بات سچ ہے یا غلط؟"

چوکیدار نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ "بڑے صاحب! اگر آپ ناراض نہ ہوں تو ایک بات پوچھوں؟"

"کیا پوچھنا چاہتے ہو؟" میرا لہجہ خشک تھا۔

"کیا وہ لڑکی واقعی بہت حسین ہے؟" چوکیدار نے اٹک اٹک کر پوچھا اور پلکیں جھپکاتے ہوئے بولا۔ "پریوں کی شہزادی کی طرح حسین' جو ہم کہانیوں میں پڑھتے اور سنتے ہیں۔"

"ہاں! ہاں!" اب بھی میرا غصہ ناک پر تھا۔ "میں نے تمہیں دو تین مرتبہ اس کے بارے میں بتایا تھا' جانے کیوں تمہیں یقین نہیں آرہا ہے۔ تم آخری بار سن لو...... وہ ایسی لڑکی ہے کہ تم اسے ایک بار دیکھ لو گے تو تمہاری نیت میں فتور آجائے گا۔ تم کئی راتیں سو نہیں سکو گے۔ اس کے بدن کا گداز......اس کی آواز کا ترنم اور اس کے دہکتے سراپا کی

دلکشی تمہیں ڈستی رہے گی۔ اسے دیکھے تو زاہد بھی بہک جائے، پاگل ہو جائے۔"

چوکیدار کے ہونٹوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ ابھرنے لگی۔ وہ بے اختیار ہنس پڑا۔ "بڑے صاحب ...... آپ بھی عقل مند اور ہوشیار بنتے ہیں لیکن ان بدمعاشوں کے فریب میں آہی گئے۔"

مجھے اس کے ایک ایک لفظ نے مل کر کسی بچھو کی طرح ڈنگ مار دیا تھا۔ "کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"جب ایک زاہد بہک سکتا ہے تو کیا بدمعاش شریف بن جائیں گے؟"

چوکیدار کی بات کچھ کچھ میری سمجھ میں آنے لگی۔ "تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ انہوں نے مجھے جو کہانی سنائی، وہ من گھڑت اور جھوٹی ہے؟"

"جی بڑے صاحب!" چوکیدار نے سنجیدگی سے کہا۔ "آپ کو بے وقوف بنا کر وہ اس لڑکی کو لے اڑے ہیں۔ کیا کبھی ایسا ہوا ہے اور آپ ایسی کوئی مثال دے سکتے ہیں کہ کوئی مرد کسی حسین لڑکی کو دیکھ کر راہ راست پر آگیا ہو؟"

"نہیں......" میرا سر آپ ہی آپ نفی میں ہلنے لگا؟

"اب وہ اس لڑکی کو لے کر اپنے کسی اڈے پر پہنچ گئے ہوں گے۔"

"کیا وہ لڑکی گاڑی میں موجود تھی؟" میں نے بے تابی سے پوچھا۔ "کیا تم نے کسی لڑکی کو اندر بیٹھے ہوئے دیکھا تھا؟"

اس گاڑی کے شیشے چڑھے ہوئے تھے۔ مجھے اس بات پر شک ہوا تھا کہ گرمی ہے اور شیشے چڑھا کر کیوں رکھے گئے ہیں۔" چوکیدار نے کہا۔ "گھپ اندھیرے کے باعث میں اندر بیٹھے ہوئے لوگوں کے چہرے نہیں دیکھ سکا البتہ اندر کسی عورت کا گمان ضرور ہوا تھا۔"

میں انگاروں پر لوٹ گیا۔ "اوہ ...... گدھے آدمی، تم نے فوراً ہی اطلاع کیوں نہیں دی؟"

چوکیدار گل خان نے جیسے میری آنکھوں پر بندھی ہوئی پٹی اتار کے مجھے روشنی میں لا کھڑا کیا تھا۔ اب مجھے ہر چیز صاف نظر آنے لگی تھی۔ میں حیران سا ہونے لگا کہ مجھے اس تاریک پہلو کا خیال کیوں نہیں آیا۔ عبدل کوئی ایسا شخص تو نہیں تھا کہ اس کی پارسائی کی باتوں اور انسانی جذبے پر اعتبار کر کے ایک گھناؤنے رخ کو نظرانداز کر دیا جائے۔ فی

الحقیقت عبدل اور اس کے بدمعاش ساتھی مہ جبیں کے حسن کے اسیر بن کر بھک گئے تھے۔ ان کی نیتوں میں فتور آجانا فطری امر تھا۔ اگر میں عبدل کی جگہ ہوتا تو شاید اس کمینگی سے باز نہیں آتا کیونکہ مہ جبیں کا حسن ہر کسی کو بہکا دینے والا تھا۔ عبدل میرے پاس قاسم بخش کے خوف یا کسی اور وجہ سے آیا تھا۔ اس نے میرے ساتھ محض اس لیے ڈرامے بازی کی تھی کہ میں اس کی نیکی اور جذبے سے متاثر ہو کر اپنی جگہ چپ کر بیٹھ جاؤں گا اور وہ خاموشی سے فائدہ اٹھا کر مہ جبیں کے لے اڑے گا۔ میں اس کی شکایت لے کر قاسم بخش کے پاس بھی نہیں جا سکوں گا۔ اس نے مجھے بڑی خوبصورتی سے ایک غلط راہ پر ڈال کر اندھا بنا دیا تھا۔ چوکیدار کی ذہانت نے مجھے بینائی لوٹا دی تھی۔

عبدل نے مجھے بڑی بے رحمی سے دہکتی بھٹی میں جھونک دیا تھا۔ میں دہکتے شعلوں میں جل اٹھا تھا۔ میرا دماغ سائیں سائیں کرنے لگا تھا۔ میں ایک لمحہ ضائع کیے بغیر کسی بپھرے ہوئے وحشی درندے کی مانند' دندناتا ہوا نیچے آیا۔ اسکوٹر پر قاسم بخش کے گھر کی طرف چل پڑا۔ میری رگوں میں غصے اور نفرت کا ایسا ہیجان بھرا ہوا تھا کہ میں اپنی اسکوٹر کی رفتار پر قابو نہیں رکھ سکا۔ میں نے ایک دو چوراہوں پر سگنل کی بھی پروا نہیں کی جس کی مجھے سزا ملتے ملتے رہ گئی۔ میری زندگی باقی تھی ورنہ مجھے موت کے منہ میں جانے سے کوئی روک نہیں سکتا تھا لیکن پھر بھی میں اپنے آپ پر قابو نہیں پا سکا۔ میں لمحوں میں میلوں لمبی مسافت طے کر کے پہنچ جانا چاہتا تھا۔

جب قاسم بخش کے گھر کی گلی میں داخل ہوا تو مجھے اپنی اسکوٹر کسی قدر دور کھڑی کرنی پڑی کیونکہ سڑک کے کنارے ایک لمبی سی قطار گدھا گاڑیوں اور ٹھیلوں کی تھی جو بڑی دور تک چلی گئی تھی۔ سڑک پر آمد و رفت جاری تھی۔ اسی لیے میں قاسم بخش کے عین مکان کے سامنے اسکوٹر روک نہیں سکتا تھا۔ آمد و رفت میں نہ صرف خلل پڑ سکتا تھا بلکہ میرے اسکوٹر کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ بھی تھا۔ جب میں اسکوٹر پارک کر کے قاسم بخش کے مکان پر پہنچا تو میرا سینہ دھک سے ہو کر رہ گیا۔ اس کے مکان پر پڑا ہوا تالا میرا منہ چڑا رہا تھا۔ میں دروازے کے عین سامنے کھڑی ہوئی گدھا گاڑی کا سہارا نہیں لیتا تو شاید چکرا کے گر پڑتا۔ قاسم بخش کو اس وقت اپنے گھر پہ نہ پا کر میں دل پکڑ کر رہ گیا۔ غصے کی ہیجانی کیفیت اپنی انتہاء کو پہنچ چکی تھی۔

قاسم بخش کے مکان کے سامنے والے مکانوں کی رو میں کسی قدر ہٹ کر ایک ٹیلے پر تین چار نوعمر لڑکے بیٹھے ہوئے آپس میں گپ شپ کر رہے تھے۔ وہ اسی محلے کے لڑکے دکھائی دیتے تھے۔ میں ایک امید سی لے کر ان لڑکوں کے پاس پہنچا اور ان میں ایک لڑکا جو کسی سیانا اور سمجھدار نظر آرہا تھا' میں نے اس سے پوچھا۔ "قاسم بخش کہاں گیا ہے اور کب واپس آئے گا' تمہیں معلوم ہے؟"

"کون! دادا؟" لڑکا میرا مطلب سمجھ کر بولا۔ محلے میں سبھی قاسم بخش کو دادا ہی کہتے تھے۔ جب میں نے اثبات میں اپنا سر ہلایا تو اس نے اپنے ایک ساتھی سے پوچھا۔ "اڑے عمر...... تو نے دیکھا تھا دادا کو...... تو یہاں بڑی دیر سے بیٹھا تھا نی......"

"ہاں ......ہاں......" عمر نے اثباتی انداز میں سر ہلایا۔ "کچھ دیر پہلے یہاں ایک خوبصورت سی گاڑی آئی تھی۔" عمر کا لہجہ شائستہ تھا۔ "وہ بڑی تیزی سے آئی تھی۔ اس میں سے ایک آدمی اتر کے بڑی تیزی سے دادا کے گھر میں داخل ہو گیا۔ پانچ منٹ بھی نہیں لگے۔ دادا ان لوگوں کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر چلے گئے۔"

"گاڑی میں اور کون کون تھا؟" میری آواز حلق میں پھنسنے لگی۔

"گاڑی میں پیچھے دو مرد بیٹھے ہوئے تھے اور ایک لڑکی بھی ساتھ تھی۔" عمر نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔

مجھے یکلخت بجلی کا جھٹکا سا لگا اور سارا جسم جھنجھنا گیا۔ میرا دماغ چکرانے لگا۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنے دماغ کے چکروں پر قابو پانے کے بعد اس لڑکے سے پوچھا۔ "وہ خوبصورت اور جوان سی لڑکی تھی نا؟؟"

"ہاں ......ہاں۔" لڑکے نے جواب دینے میں کوئی تاخیر نہیں کی۔ "وہ ایک دم فلم اسٹار راکھی جیسی تھی۔"

اب کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ یہ سارا چکر قاسم بخش کا ہی چلایا ہوا تھا۔ عبدل نے شاید مہ جبیں کو کہیں اور سے اٹھایا تھا۔ جب ہی اسے اپنے ساتھ لے کر پہلے میرے پاس آیا۔ مجھے فریب دے کر وہ سیدھا قاسم بخش کے پاس گیا۔ قاسم بخش اپنی بہن کو اپنی نگرانی میں اس کے گھر چھوڑنے چلا گیا۔ آخر اس لمبے چوڑے اور مجھے پریشان کرنے والے ڈرامے کی کیا ضرورت تھی؟ عبدل مجھ سے صاف صاف کہہ دیتا کہ میرے

استاد نے منع کر دیا ہے۔ میں اس لڑکی کو اغوا نہیں کر سکتا۔

جب میں وہاں سے نکلا تو مجھ پر وحشت سوار تھی۔ میری رگوں میں کھولن ہونے لگی۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے اور میں کہاں جاؤں۔ میں کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح چل پڑا۔ میرے سینے میں تلاطم اٹھ رہا تھا۔

معاً مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ میں کسی بہانے سے بڑے میاں کے ہاں پہنچ کر یہ تصدیق کرلوں کہ مہ جبیں اپنے گھر میں ہے یا نہیں؟ اس خیال نے میری اسکوٹر کا رخ مہ جبیں کے گھر کی طرف موڑ دیا۔ میں راستے میں بڑے میاں سے ملاقات کے بہانے سوچتا رہا کیونکہ بڑے میاں کو اتنی رات گئے میری آمد بڑی ناگوار لگتی۔ اگر دن میں بھی جاتا تو ان کی پیشانی پر ہزاروں بل پڑ جاتے۔ ایک بہانہ ...... دفعتاً" میرے ذہن میں آیا' وہ اسی کا بہانہ تھا۔ میں نے اسی بہانے کو تراشنا شروع کیا۔ جب میری اسکوٹر اس علاقے میں داخل ہوئی تو میں نے اس بہانے کو اس فنکاری سے تراش دیا تھا کہ میں اپنے ذہن کی اختراع پر اش اش کر اٹھا۔

مہ جبیں کا مکان اندھیرے میں ڈوبا ہوا دیکھا تو میرا ماتھا ٹھنکا۔ جب میں نے گیٹ کے پاس اسکوٹر روک کے دیکھا تو اس پر بڑا سا تالا پڑا ہوا تھا۔ جب ہی پڑوس کے مکان سے ایک عورت نے میرے اسکوٹر کے انجن کا شور سن کر گیٹ کھول کر باہر جھانکا' وہ ایک ادھیڑ عمر کی عورت تھی۔ میں نے فوراً ہی اس کے روبرو پہنچ کر پوچھا۔ "آپ کے پڑوس میں جو اخلاق صاحب رہتے ہیں' کیا آپ جانتی ہیں کہ وہ گھر سے کب اور کہاں گئے ہیں؟"

"یہ تو نہیں معلوم کہ وہ کہاں گئے ہیں۔" عورت نے جواب دیا۔ "میں ایک گھنٹہ پہلے اپنے گھر واپس آرہی تھی تو انہیں راستے میں دیکھا تھا۔ وہ کسی قدر پریشان اور حواس باختہ ہو کر چلے جا رہے تھے۔ انہوں نے میرے سلام کا جواب تک نہیں دیا۔"

"کیا ان کے ساتھ مہ جبیں بھی تھی؟"

"وہ تن تنہا جا رہے تھے۔" عورت نے حیرانی سے جواب دیا۔ "وہ دو دن پہلے سخت بیمار تھے۔ خدا جانے کیا پریشانی تھی کہ اس کمزوری اور نقاہت کے عالم میں بھی آج وہ اپنے گھر سے نکل پڑے۔ میں خود حیران تھی کہ مہ جبیں ان کے ساتھ کیوں نہیں ہے۔ میں سمجھی کہ وہ گھر پر ہوگی' مہ جبیں سے اس کے باپ کی پریشانی کی وجہ پوچھ لوں مگر دیکھا تو اس پر تالا پڑا ہوا تھا۔"

میں نے اس عورت کا شکریہ ادا کر کے ایک لمحے کے لیے بھی رکنا گوارا نہیں کیا اور اس تیزی سے گلی سے باہر نکل آیا جیسے میں یکایک تنور میں گر گیا ہوں اور باہر نکلنے کا کوئی راستہ نظر نہ آرہا ہو۔ میں نے سڑک پر پہنچ کر اسکوٹر روک لیا۔ مجھ میں اتنی سدھ بدھ بھی نہیں رہی تھی کہ اسکوٹر چلا سکوں۔ میری آنکھوں کے سامنے ہر شے گہری دھند میں لپٹی جا رہی تھی۔ ذہن کے ایوانوں میں بجلیاں کوندنے لگی تھیں۔ قاسم بخش پر مجھے بڑا بھروسا اور اعتماد رہا تھا لیکن میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ آخر وہ ایک گندی نالی کا کیڑا ہے اور کیڑا ہی رہے گا۔ یہ میری اپنی بھول اور سوچ کا قصور تھا کہ میں نے اسے ایک اچھا اور قول کا دھنی آدمی سمجھ لیا تھا۔ وہ آج ایک انتہائی ذلیل اور گھٹیا شخص ثابت ہوا تھا۔ قاسم بخش اسی روز سے جب اس نے مہ جبیں کو پری زاد کے گھر سے بازیاب کیا تھا' مہ جبیں پر عاشق ہو گیا تھا۔ اس کے عیار ذہن نے مہ جبیں کے قریب رہنے اور اسے اعتماد میں لینے کی غرض سے منہ بولی بہن کا رشتہ ناطہ جوڑ لیا تھا۔ جب میں نے عبدل کی خدمات اس کے ذریعے سے حاصل کیں تو اسے پچھتانے کا احساس ہوا ہو گا کہ مہ جبیں اب میری دسترس میں آنے والی ہے۔ اس احساس نے اسے ورغلا دیا تھا۔ اس نے عبدل سے مل کر سازباز کی اور ایک منصوبہ بنایا۔ میرے خلاف ایک سازش کا جال بن کر مجھ پر ڈال دیا۔ میں اس میں پھنس کر بے آب ماہی کی طرح تڑپنے اور پھڑپھڑانے لگا تھا۔ ایک جانب قاسم بخش نے مجھے مہ جبیں کے بارے میں یہ تاثر دیا کہ میں نے اسے اپنی بہن بنا لیا ہے جبکہ دوسری جانب عبدل نے اپنے آپ کو انسانی جذبے کے خول میں بند کر کے مجھے احمق بنانے کی کوشش کی لیکن ان دونوں کی مکروہ شکلیں اور کمینی خصلتیں میرے سامنے آگئی تھیں۔

یہ سب کچھ سوچ سوچ کر میرا سینہ پھٹنے لگا۔ میری نسوں میں نفرت کی آگ بھڑکتی جا رہی تھی اور سینے میں دل جیسے حقارت سے ابل رہا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ لوگ مہ جبیں کو کہاں لے گئے ہیں' قاسم کا اڈا اسی علاقے میں ہوا کرتا تھا لیکن اس نے بتایا تھا اور میں نے بھی دیکھا تھا' اب وہ ایک دینی مدرسے میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اگر عبدل اسے اپنے ساتھ اپنے کسی اڈے اور خفیہ ٹھکانے پر لے گیا تھا تو میں اس کے محل وقوع اور علاقے سے ناواقف تھا۔ کراچی جیسے شہر میں عبدل جیسے بدمعاش کا ٹھکانہ معلوم کرنا خطرے سے خالی نہیں تھا اور اس میں دشواری بھی تھی۔ اگر میں اس کے اڈے پر پہنچ بھی جاتا تو وہ

خطرناک اور سفاک بدمعاشوں سے نمٹنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔

میں اس ویرانے میں بڑی دیر تک کھڑا ہوا اپنے سنسناتے دماغ کا جائزہ لیتا رہا۔ فرحت بخش ہواؤں کے جھونکے مجھے تھپکیاں دے کر نارمل کرنے لگے۔ جب میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا تو غیر ارادی طور پر اسکوٹر اسٹارٹ کر کے لمبی چوڑی سڑک پر آگیا۔ سڑک پر پہنچتے ہی یکلخت خیال آیا کہ کھیل کا سارا پانسا پلٹ گیا ہے اور اب بازی میرے ہاتھ میں آگئی ہے۔ میں کسی نہ کسی طرح عبدل کے اڈے کا پتا معلوم کر کے پولیس کو اطلاع دے دوں تو نہ صرف مہ جبیں کی بازیابی ہو جائے گی بلکہ وہ دونوں دھر لیے جائیں گے۔ میرے اس کارنامے کے صلے میں مہ جبیں کسی پکے ہوئے پھل کی مانند میری جھولی میں آگرے گی۔

مجھے جو کچھ بھی قدم اٹھانا تھا' اس میں ایک لمحے کی تاخیر بھی میرے لیے نہیں بلکہ مہ جبیں کی ذات اور آبرو کے لیے خطرے کا باعث بن سکتی تھی۔ وہ دونوں بدمعاش اسے ناگ بن کر ڈسنا شروع کر دیں تو وہ تن تنہا کیا کر سکتی ہے۔ انہی خیالات اور احساسات نے میری رگوں میں خون کی گردش تیز کر دی۔ میں نے پوری رفتار سے اسکوٹر دبا دیا۔ میں لیاری کے اس ہوٹل پر جا کر عبدل کے بارے میں معلوم کرنا چاہا تھا جہاں میں نے اسے دو دن پہلے چھوڑا تھا۔ جب میں گرومندر پر آیا تو میں نے عبدل کی گاڑی کو گزرتے ہوئے دیکھا۔ یہ وہی گاڑی تھی جس میں عبدل دو مرتبہ میرے فلیٹ پر آیا تھا۔ میں اس گاڑی کو ہزاروں گاڑیوں میں با آسانی پہچان سکتا تھا۔ اس گاڑی کے چاروں شیشے چڑھے ہوئے تھے۔ وہ بڑی تیزی سے نیو ٹاؤن کی مسجد کی طرف جاتی ہوئی سوسائٹی آفس کے راستے کی جانب مڑ رہی تھی۔ میں نے اس کے تعاقب میں اپنا اسکوٹر ڈال دیا۔

اب کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں رہی تھی کہ اس گاڑی میں عبدل اور قاسم بخش سمیت مہ جبیں بھی موجود ہے' وہ لوگ اسے زبردستی اغوا کر کے نامعلوم مقام کی طرف لے جا رہے تھے۔ مجھے اس لمحے بڑے میاں پر ترس آیا جو بیماری کے عالم میں بیٹی کے گھر نہ پہنچنے پر حواس باختہ ہو کر اس کی تلاش یا پولیس اسٹیشن میں رپورٹ درج کرانے کے لیے چلے گئے تھے۔ ایک کمزور' بوڑھا اور ناتواں شخص کر بھی کیا سکتا تھا۔ میں اس گاڑی کو دیکھ کر حیران بھی ہوا اور خوشی کی لہر بھی دوڑ گئی۔ حیرانی اس بات کی تھی کہ وہ مہ جبیں کو کہاں لے جا رہے ہیں۔ معاً یہ خیال بھی آیا کہ ان لوگوں کو شاید کوئی موزوں جگہ نہیں ملی ہو گی۔

ہے۔ جب ہی وہ لوگ ایک ڈیڑھ گھنٹے سے ادھر ادھر فرار ہوتے پھر رہے ہیں۔

میں نے دانستہ فاصلہ قائم رکھا۔ میں ان لوگوں کی نظروں میں آنا نہیں چاہتا تھا۔ آمنا سامنا ہونے سے بات بگڑ سکتی تھی۔ وہ لوگ مجھے تعاقب میں دیکھ کر شاید زندہ نہیں چھوڑتے اور اپنی گاڑی سے ٹکر مار کر کچل کر باآسانی فرار ہو جاتے۔ میں اسی لیے کوئی خطرہ مول لینے کو تیار نہیں تھا' تاہم میں نے اس گاڑی کی پچھلی نشست کے عقبی آئینے میں سے پچھلی نشست پر دو مردوں کے درمیان ایک نسوانی سر دیکھا جو سفید ڈوپٹے کی محراب میں چھپا ہوا تھا۔ میں نے مہ جبیں کو جنبش کرتے اور کسماتے ہوئے دیکھا۔ دونوں طرف بیٹھے ہوئے بدمعاشوں نے شاید اسے خنجر اور چاقو کی زد میں رکھا ہوا ہوگا۔ جب ہی اس میں ایک اضطراری کیفیت نمایاں ہو جاتی تھی۔

کوئی پندرہ بیس منٹ کے بعد وہ گاڑی سوسائٹی کے علاقے میں ایک وسیع و عریض کوٹھی کے سامنے رکی تو میں نے اپنا اسکوٹر ایک ایسی جگہ روک لیا جہاں ایک گھنے درخت کے موٹے تنے کی آڑ تھی' جہاں سے میں ان لوگوں کے چہرے باآسانی دیکھ سکتا تھا اور ان کی حرکات و سکنات میری نگاہ سے چھپی نہیں رہ سکتی تھیں لیکن میں ان کی نظروں میں نہیں آسکتا تھا۔ یہ گلی سنسان اور ویران پڑی ہوئی تھی۔ بجلی کے کھمبے کے بلبوں میں روشنی میں کسی قدر زردی سمائی ہوئی تھی۔ گاڑی کے دروازے کھلنے میں تاخیر ہو رہی تھی۔ خدا جانے اندر کیا کھچڑی پک رہی تھی۔ شاید مہ جبیں کسی قیمت پر گاڑی سے اترنے کے لیے تیار نہیں ہو رہی تھی۔ وہ لوگ جبر و زبردستی اور دھمکیوں سے اسے مرعوب کرنا چاہتے ہوں گے۔ یہ سب کچھ سوچ سوچ کر میرے جسم میں سنسنی دوڑ گئی اور اندر اضطراب کی ایسی لہر اٹھی جس نے مجھے تپا کر رکھ دیا۔ میں اپنی بے بسی پر کڑھ کر رہ گیا۔ اگر میں نہتا نہیں ہوتا تو شاید ان لوگوں کے مقابلے پر جا کر ڈٹ جاتا اور مجھے ان مسلح بدمعاشوں کی ذرہ برابر بھی پروا نہیں ہوتی۔

میں نے اپنے تصور میں ایک لرزہ خیز منظر دیکھا۔ وہ مہ جبیں کے منہ کپڑا ٹھونس کر اس کے دونوں ہاتھ پیچھے لے جا کر دوپٹے سے باندھ رہے تھے۔ مہ جبیں کی مزاحمت رفتہ رفتہ دم توڑتی جا رہی تھی۔ جب بدمعاش اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو وہ گاڑی کا دروازہ کھولتے ہیں۔ دفعتاً" گاڑی کا دروازہ کھلا' چند ثانیوں تک کوئی باہر نہیں آیا۔ میرا دل

اور سانسیں اپنی دھڑکنیں بھول کر بے حس و حرکت ہو گئے۔ یہ پہاڑ سے چند لمحے گزرے۔ ایک شخص باہر آیا' چند ثانیے بعد دودھیا چاندنی جیسے لباس میں لپٹا ہوا سراپا باہر آیا۔ چاروں دروازے ایک ایک کر کے کھلے تھے۔ کسی قدر فاصلے پر میری نظروں کے سامنے چار مرد اور ان کے درمیان ایک لڑکی تھی لیکن وہ لڑکی مہ جبیں نہیں تھی اور نہ ہی ان مردوں میں عبدل اور قاسم بخش تھے۔ یہ لوگ کوئی اور تھے۔

میں یہ سب کچھ دیکھ کر چونکا۔ مجھے اپنے آپ پر غصہ آیا' میں نے اپنی جلد بازی اور حماقت سے نصف سے زائد گھنٹہ برباد کر دیا تھا۔ کراچی میں ایسی ایک نہیں سینکڑوں گاڑیاں دندناتی پھرتی تھیں اور ان کے شیشے بھی چڑھے ہوتے تھے۔ میں نے فوراً اپنے اسکوٹر کو اسٹارٹ کیا اور سنسناتے ہوئے تیر کی مانند لیاری کی جانب چل پڑا۔

جب میں لیاری کے اس ہوٹل میں پہنچا تو اسے مقفل پا کر اچنبھا ہوا۔ گرمیوں کے دنوں میں ہوٹل رات گئے تک کھلا رہتا تھا' ہوٹل کا رات گیارہ بجے بند ہو جانا تعجب خیز تھا۔ اتفاق سے اس سے متصل پان کی دکان بھی بند پڑی تھی۔ میں نے خاصے فاصلے پر ایک پان کی دکان پر پہنچ کر سلام کیا۔ اس نے میرے اخلاق کی کوئی پروا نہیں کی اور بڑی سردمہری سے جواب دیا اور اس کی سوالیہ نظریں میری جانب اٹھیں تو میں نے تاڑ لیا کہ موصوف خرانٹ قسم کے واقع ہوئے ہیں۔ میں نے انہیں پہلے تو ایک سونف خوشبو کے پان کا آرڈر دیا۔ پھر میں نے پان منہ میں رکھتے ہوئے اس ہوٹل اور دکان کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ "آج یہ ہوٹل اور دکان کس خوشی میں بند ہے؟"

دکاندار نے چونک کر مجھے دیکھا اور نیچے سے اوپر تک اس طرح جائزہ لیا جیسے میں کوئی عجوبہ ہوں۔ اس کے چہرے پر ناگواری سی چھا گئی۔ "آج ہوٹل اور دکان پر چھاپہ پڑا تھا۔ ان دونوں کے مالکان کو گرفتار کر لیا گیا اور وہ حوالات میں بند ہیں۔"

"ان دونوں کو کس لیے گرفتار کیا گیا ہے؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"آخر گرفتاری کس لیے عمل میں آئی ہے؟" اس نے الٹا مجھ سے سوال کر دیا اور بڑی رکھائی سے کہا۔ "وہ بچوں کے لیے ٹافیاں نہیں بیچتے تھے بلکہ ہیروئن اور چرس کا دھندا کرتے تھے مگر ان کا کیا بگڑے گا' مٹی پلید تو شریفوں کی ہوتی ہے۔ انہیں حوالات میں ٹھہرایا جاتا ہے۔ کل آپ آ کر دیکھ لیں۔ ہوٹل اور دکان چالو ہو جائے گی اور وہ دونوں بھی

نظر آئیں گے' ان کا دھندا بھی پھر سے چالو ہو جائے گا۔"

دکاندار کے لہجے کی تلخی اور اس کے تلخ مزاج سلوک نے میرا حوصلہ پست کر دیا تھا۔ مجھے اپنا سوال زبان پر لانے کی جسارت نہیں ہو رہی تھی۔ جانے وہ کس بات پر خار کھائے بیٹھا تھا' تاہم مجھے مہ جبیں کی زندگی اور اس کی عزت و آبرو کا خیال آیا تو میں نے جی کڑا کر کے نرم لہجے میں انکسار سے پوچھا۔ "کیا آپ عبدل اور اس کے ٹھکانے سے واقف ہیں؟"

"کون عبدل؟" دکاندار کے منہ میں کڑوا بادام آگیا۔ "اس علاقے میں چھ عبدل رہتے ہیں۔ وہ سالے ساری بدمعاش' لٹیرے اور ایک نمبری ہیں۔ میں ان حرام خوروں سے دور بھاگتا ہوں۔"

"اس کا نام عبدل ہے اور وہ بلند قامت اور......" میں اس کو عبدل کی نشانیاں اور حلیہ بتانے لگا کہ دکاندار نے فوراً میری بات کاٹی' اس کے لہجے میں تلخی بھری ہوئی تھی۔ "دیکھیے جناب ......میں اگر کسی کے بارے میں جانتا بھی ہوں تو آپ کو کچھ نہیں بتا سکوں گا۔ آپ خود ہی کسی بدمعاش یا لچے لفنگے کو پکڑ کے پوچھ لیں۔"

دکاندار کی بے رخی اور اس کی باتوں سے دل گرفتہ ہو کر میں غیر ارادی طور پر قاسم بخش کے مکان کی جانب چلا گیا۔ اس کی گلی میں داخل ہو کر مجھے احساس ہوا کہ میں نے یہاں آکر غلطی کی ہے۔ گلی تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ گہرا سناٹا طاری تھا۔ میں نے ایک لمحے کے لیے یہ سوچا کہ جب یہاں آیا ہوں تو قاسم بخش کا مکان جھانکتا چلوں۔ جب میں اس مکان کے قریب پہنچا تو اس کے اندر سے روشنی پھوٹ رہی تھی۔ اس مکان کے دونوں دروازے نیم وا تھے۔ میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگیں۔ جب میں نے گزرتے ہوئے اندر جھانکا تو مجھے عبدل بھی کھڑا ہوا دکھائی دیا۔ میں نے خاصے فاصلے پر اسکوٹر روک دیا۔ میں اس مکان کی جانب دبے دبے پاؤں بڑھنے لگا۔ میرے جسم میں ایک سنسنی بجلی بی ہوئی میرا رواں رواں لرزاں کر رہی تھی۔ پیر رکھتا کہیں تھا اور پڑ کہیں رہے تھے۔ مہ جبیں کی موجودگی کے آثار نظر نہیں آرہے تھے۔ شاید ان دونوں نے مل کر اسے کسی نامعلوم مقام پر قید کر دیا تھا اور شاید اپنی اپنی غرض پوری کر کے چلے آئے تھے۔ میں نے دل میں تہیہ کر لیا تھا کہ میں قاسم بخش کا گریبان پکڑ کے اس کے منہ پر تھوک دوں گا۔ مہ جبیں کی بازیابی

کے لیے اپنی جان پر کھیل جاؤں گا۔ اب مجھے نتائج کی پروا نہیں رہی تھی۔ میرے دل سے ہر قسم کا خوف نکل چکا تھا۔

میں دروازے کے پاس پہنچ کر رکا۔ اپنی سانسیں اور حواس قابو میں کر کے اندر جانا چاہتا تھا کہ میرے کانوں میں عبدل کی آواز اندر سے باہر آتی ہوئی سنائی دی' ایک ایک لفظ صاف سنائی دے رہا تھا۔ عبدل بڑی سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔ "جب ہم چاروں اپنے ہاتھوں میں کھلے چاقو لیے ہوئے اس کے گرد گھیرا تنگ کرنے لگے تو وہ لڑکی ایک دم سے ٹھٹک کر اپنی جگہ رک گئی' اس کی آنکھوں میں خوف چھا گیا تھا اور چہرہ بجھ کر رہ گیا لیکن اس نے جلد ہی اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ وہ بڑے سکون سے کھڑی ہوئی' ہم لوگوں کی جانب ایسی نظروں سے دیکھنے لگی جیسے ہم لوگ اس کے نزدیک انتہائی حقیر اور بے ضرر کیڑے ہوں' ہم اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے ہیں۔ اس کے پاس بجلیاں بھری ہوئی ہیں جسے وہ ہم پر گرا کے ہمیں خاکستر کر سکتی ہے۔" عبدل نے شاید سانس لینے کے لیے توقف کیا تھا۔ اس نے اپنی بات جاری رکھی۔ "اگر اس کی جگہ کوئی اور عورت ہوتی تو وہ گھبرا جاتی اور اس کے اوسان خطا ہو جاتے جیسا کہ اکثر ہم نے دیکھا اور ہمارا تجربہ بھی ہے۔ یہ موقع بھی تو دہلانے والا ہوتا ہے' وہ چاروں طرف دیکھتی ہے' مدد کے لیے پکارتی ہے اور بھاگنے کی کوشش کرتی ہے لیکن اس حور صفت لڑکی نے حیران کر کے رکھ دیا۔ میں اس کے قریب پہنچا تو میرے دیدے پھٹ گئے۔"

"کیوں؟" قاسم بخش نے درمیان میں سوال کیا تو اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

"میں نے اس لڑکی کو دوپہر کے وقت بہت دور سے دیکھا تھا۔" عبدل نے جواب دیا۔ "جب ہم نے اسے ویرانے میں گھیرا تو اس وقت گھپ اندھیرا تھا۔ دور سے اس کی حسین اور کھلی آنکھیں چمک رہی تھیں لیکن جیسے جیسے میں اس کے قریب ہوتا گیا تو میری آنکھیں اس چہرے کے جمال کی تاب نہ لا پا رہی تھیں۔ جب اس کے اور میرے درمیان چند انچ کا فاصلہ رہ گیا تو مجھے یوں محسوس ہوا کہ میں کوئی حور دیکھ رہا ہوں' جیسے اس نے اسی وقت آسمان سے اتر کر زمین پر قدم رکھا ہے' خدا کی قسم...... قاسم بھائی......میں نے اپنی زندگی میں ایسی حسین لڑکی نہیں دیکھی۔ اس کے حسین چہرے پر ایک ایسا جلال نظر آیا کہ میری آنکھیں چکنے لگی تھیں۔ اس نے مجھ پر ایک عجیب سی نگاہ ڈالی۔ اس نگاہ میں کوئی جذبہ تھا'

خلوص تھا اور ایسی اپنائیت تھی کہ میں نے کبھی کسی کے محبت بھرے لفظوں میں نہیں پائی۔ مجھے اس وقت معلوم ہوا کہ نگاہوں کی بھی کوئی زبان ہوتی ہے۔ وہ زبان دل کی گہرائیوں میں امرت بن کر اتر جاتی ہے۔ میری رگوں میں خون کی جگہ امرت نے لے لی تھی۔ اس کے نازک ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ ابھر آئی۔ اس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بڑی طمانیت سے پوچھا' کیا بات ہے بھائی جان؟ کیا آپ لوگ مجھے اپنے ساتھ زبردستی لے جانا چاہتے ہیں؟ میں اس کی بات کا جواب کیا دیتا' مجھ پر اس نے جادو کر دیا تھا۔ میرے ساتھیوں کی بھی ایسی ہی کیفیت تھی۔ ان سب پر سکتہ چھا گیا تھا۔ وہ مجھے خاموش پا کر بولی' اگر آپ کسی کے اشارے پر مجھے ساتھ لے جانا چاہتے ہیں تو میں آپ لوگوں کے ساتھ خاموشی سے چلنے کے لیے تیار ہوں۔ کسی ہنگامے اور خون خرابے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ اگر خدا کی اس میں کوئی رضا شامل ہے تو میں اپنے آپ کو آپ لوگوں کے حوالے کرتی ہوں ...... لیکن میری چند باتیں ٹھنڈے دل سے سن لیں۔ میری بڑی بہن آج اچانک ایک حادثے میں زخمی ہو کر اسپتال میں داخل ہو گئی ہے' اس کی زندگی خطرے میں ہے۔ مجھے اپنے بوڑھے اور بیمار باپ کو اطلاع دے کر اور انہیں سمجھا کر اسپتال جانا ہے۔ کیا معلوم میری بہن کو میرے خون کی ضرورت پڑ جائے ...... اگر آپ مجھے اپنے ساتھ لے گئے تو آپ کی گردن پر دو جانوں کا خون ہو گا...... ایک میرا بوڑھا باپ جو میرا انتظار کر رہا ہے' وہ روز میرا انتظار کرتا رہے گا۔ میرے انتظار میں اس کی آنکھیں پتھرا جائیں گی۔ پھر وہ ایک روز میرے غم میں مر جائے گا۔ اگر میری بہن کو بروقت خون نہیں ملا اور وہ مر گئی تو ...... میں حشر کے دن ان دونوں کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گی...... اس دنیا میں میرے لیے یہی دونوں سہارے اور بیش بہا دولت ہیں ...... لیکن میں آپ سے رحم کی بھیک نہیں مانگوں گی ...... میں آپ کے حکم کی منتظر ہوں......"

عبدل نہ جانے کس لیے یکلخت چپ ہو گیا تھا۔ کمرے کے اندر قبرستان جیسا سناٹا طاری ہو گیا۔ چند ثانیوں کے بعد اس کی آواز گونجی تو وہ جذباتی ہو رہا تھا۔ "قاسم بھائی! یکایک میرے ہاتھ سے چاقو چھوٹ کر زمین پر گر پڑا۔ مجھ میں اتنی ہمت بھی نہیں رہی کہ میں جھک کر اسے اٹھا لوں۔ اس کے ایک ایک لفظ نے میرے ساتھیوں پر جیسے جادو کر دیا تھا۔ ان کے پیروں میں ایسی آہنی بیڑیاں پڑ گئی تھیں کہ وہ ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ

سکتے تھے۔ ایسے موقعوں پر عورتیں اور لڑکیاں گالیاں بکتی ہیں لیکن اس نے مجھے بھائی جان کہہ کر پکارا تھا۔ میرے علاقے کی عورتیں اور لڑکیاں بھی مجھے بھائی جان کہتی ہیں لیکن اس کے لہجے میں جانے کیا تاثیر اور کیسا جذبہ تھا کہ عبدل کا سینہ اس لفظ نے چیر کر رکھ دیا۔ میرے دل پر نیزے چبھنے لگے۔ مجھے زندگی میں پہلی بار اس لمحے یوں محسوس ہوا کہ میں انتہائی ذلیل آدمی ہوں۔ چند روپوں کی خاطر محض ایک ہوس پرست کی خواب گاہ سجانے کے لیے ایک شریف' دکھی اور پریشان حال لڑکی کو تباہ و برباد کرنے پر آمادہ ہوں۔ مجھے اس لڑکی کو جہنم میں جھونک کر کیا ملے گا؟" عبدل پل بھر کے رکا' وہ کھانسا اور بولا۔ "قاسم بھائی! اکثر جو لڑکیاں اور عورتیں میں نے اٹھائی ہیں' ان میں بہت ہی کم شریف اور ایسے چال چلن کی تھیں کہ ان پر ہاتھ ڈالتے ہوئے دل میں ذرہ برابر بھی دکھ نہیں ہوتا تھا۔ جانے اس لمحے کیا ہوا تھا کہ میرا دماغ گھوم گیا۔ میں نے اس لڑکی کے آگے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔ میں نے اس لڑکی سے کہا۔ بہن معاف کرنا' ہمیں غلط فہمی ہو گئی۔" میں اپنے ساتھیوں کو وہاں سے لے کر چل دیا۔ میرے ساتھیوں نے بھی مجھ سے کہا۔ "استاد تم نے بہت اچھا کیا اس لڑکی پر ہاتھ نہیں ڈالا۔ ہمیں خالی ہاتھ اور ناکام لوٹتے ہوئے جتنی خوشی ہو رہی ہے' اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ میں حیران سا رہ گیا۔ ہر کوئی اپنے اندر ایک ہی جذبہ اور احساس لیے ہوئے تھا۔ ان لوگوں نے میری طرح ہی سوچا تھا۔ میں وہاں سے سیدھا تمہارے دوست کے ہاں پہنچا اور اس کا پیسا اس کے منہ پر مار آیا۔"

"عبدل!" قاسم بخش کے لہجے میں حیرت اور خوشی کے ملے جلے جذبات امڈ آئے تھے۔ "آج تو نے ایک اچھائی کر کے جو خوشی محسوس کی کیا وہ تو نے کبھی کسی اور چیز میں پائی تھی؟"

"نہیں۔" عبدل کی آواز گھمبیر تھی۔

"زندگی میں ایک لمحہ ایسا آتا ہے جو ہر شخص کو یکسر بدل دیتا ہے۔" قاسم بخش اسے سمجھا رہا تھا۔ "تو اس لمحے سے فائدہ اٹھا لے گا تو آدمی بن جائے گا ورنہ تیری زندگی ہمیشہ کتوں سے بھی بدتر رہے گی۔"

"اگر تمہارا جگری دوست میری شکایت لے کر پہنچا تو؟" عبدل خوفزدہ ہو رہا تھا۔ "اس نے مجھے بڑی دھمکیاں بھی دی ہیں کیونکہ میں نے اس کے سارے پروگرام کا ستیاناس جو کر

دیا ہے۔ وہ بڑا چراغ پا ہو رہا تھا۔"

"وہ تمہاری شکایت لے کر یہاں آئے گا تو میں اس کی گردن مروڑ کر رکھ دوں گا۔" قاسم کا لہجہ سنگدلی لیے ہوئے تھا۔ "اب جبکہ میں اچھائی کے راستے پر چل پڑا ہوں تو پیچھے کی طرف پلٹ کر دیکھنا بھی نہیں چاہتا ہوں۔ تم اس کی دھمکیوں کی فکر نہ کرو' میں اس کمینے سے خود ہی نمٹ لوں گا۔"

قاسم بخش کا پہلا اور آخری جملہ زہریلے تیروں کی مانند میرے دل میں پیوست ہو گئے۔ میرا سینہ چھلنی ہو گیا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ قاسم بخش مجھ سے اس انتہا تک نفرت کرنے لگا ہے۔ میں اس کی نظروں میں انتہائی حقیر اور ذلیل شے ہوں۔ اب میرے لیے اس شخص سے کوئی امید رکھنا اور کسی قسم کے تعاون کی توقع کرنا فضول تھا۔ اس گھر کے دروازے مجھ پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند ہو چکے تھے۔ میرے لیے یہاں ایک لمحے بھی رکنا بیکار تھا۔ میں تیزی سے اپنی اسکوٹر کی جانب لپکا میں غصے میں تلملا گیا اور دل میں ان دونوں گدھوں کے احمقانہ جذبوں کو کوسنے لگا۔ وہ جانے کس دنیا میں رہ رہے تھے جو ایسی بچگانہ باتیں کر رہے تھے۔ ایسے خیالات اس دور میں کام نہیں دیتے۔

بڑے میاں کی بدحواسی اور پریشانی کا معمہ عبدل اور قاسم بخش کے درمیان ہونے والی گفتگو سے حل ہو گیا تھا۔ مہ جبیں پر کوئی آنچ نہیں آئی تھی اور وہ اپنی زخمی بہن کی تیمارداری کی غرض سے چلی گئی تھی۔ اس اطلاع نے ایک طرح سے میرے اندر طمانیت سی بھر دی تھی لیکن دوسری طرف میرے سینے میں پھانس چبھی ہوئی تھی۔ میں اپنی جیتی ہوئی بازی غیر متوقع طور پر ہار جانے پر دل گرفتہ ہو گیا۔ میں اس نتیجے کے لیے ذہنی طور پر تیار نہیں تھا۔ میں نے اسکوٹر کے پاس پہنچتے پہنچتے دل میں یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ سب سے پہلے اپنے فلیٹ پر پہنچ کر بستر پر لیٹ کر کسی بچے کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو پڑوں گا۔ جانے کیوں میرا دل رونے کو چاہ رہا تھا۔ یہ ایک ایسی صورت تھی جس سے میرے دل کی پوری بھڑاس نکل جاتی اور جی کا غبار ہلکا ہو جاتا۔ میں نے فلیٹ پہنچ کر رونا چاہا تو رو بھی نہیں سکا۔ میں نے بستر پر لیٹ کر بڑی سنجیدگی سے اپنے حالات کا جائزہ لیا۔ بڑے میاں کو اب قتل کر کے بچ جانا بڑا مشکل تھا کیونکہ قاسم بخش اور عبدل مجھے قانون کے حوالے کرنے میں ذرہ برابر بھی پس و پیش نہیں کرتے۔ قتل کی اطلاع ملنے پر سب سے پہلے ان کا خیال میری

طرف جاتا۔ وہ دونوں بڑے بے رحم اور سنگدل انسان تھے' وہ مجھے کس لیے بخشتے؟ میں کسی بدمعاش یا لچے لفنگے سے مدد لینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ مجھے آگے بڑھ کر اپنی آرزو پوری کرنی تھی۔ مہ جبیں جو میری زندگی کا سویرا تھی' مجھے اسے خود حاصل کرنا تھا۔ میں اکیلا ہی کوئی منصوبہ بنا کر مہ جبیں کو اپنی زندگی کی زینت بنا سکتا تھا۔ دیر تک میں سوچتا رہا' یکایک میرے ذہن میں ایک خیال بجلی کی طرح آیا۔ ایک آسان سی راہ سجھائی دی۔ کیوں نہ میں مہ جبیں سے سرراہ مل کر اسے کسی بہانے سے بہلا پھسلا کر فلیٹ پر لے آؤں۔ تب اس کے ساتھ زبردستی نکاح بھی کیا جا سکتا ہے۔ مجھے اپنی من مانی کرکے شرطیں منوانے میں دشواری پیش نہیں آئے گی لیکن یہ کام اس قدر سہل نہیں تھا۔ جیسا میں نے سوچا تھا۔ کیونکہ مہ جبیں کوئی نادان لڑکی نہیں تھی۔ وہ ایک ذہین اور تیز طرار لڑکی تھی' زمانہ شناس تھی۔ اس کے اعصاب چٹان کی طرح مضبوط تھے۔ وہ حالات سے گھبرا کے بھاگنے کی بجائے اس کے مقابلے میں ڈٹ سکتی تھی۔ اس نے عبدل پر اپنے حسن اور ذہانت سے کام لے کر ایسا گہرا نفسیاتی وار کیا تھا کہ عبدل جیسا شقی القلب شخص اور اس کے ساتھی جو چھٹے ہوئے ایک نمبری بدمعاش تھے' وہ الوؤں کی طرح واپس چلے گئے۔ اس کا سراپا میری نظروں میں لہرانے لگا۔ وہ مجھے ایک ناقابل تسخیر چٹان دکھائی دے رہی تھی۔ میرا ہر منصوبہ' تدبیر اور ارادہ متزلزل ہونے لگا۔

میں رات بڑی دیر سے سویا تھا' اس لیے دن چڑھے تک سویا رہا۔ دن نکلنے پر میری آنکھ کھلی تھی لیکن مجھ پر نیند کا ایسا غلبہ طاری تھا کہ سونے کو جی چاہ رہا تھا اور میں سو گیا۔ جانے کب سے اطلاعی گھنٹی بج رہی تھی۔ میں جھلا سا گیا۔ چوکیدار کی خوشامد بسا اوقات مجھے بری طرح کھل جاتی تھی۔ اس کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا۔ میں لڑکھڑاتا ہوا دروازے کے پاس پہنچا اور دروازہ کھول دیا۔

میں چونک پڑا' میری نیند اڑ گئی۔ میرے سامنے فخرو بھائی کھڑے ہوئے تھے۔ ان کا متوحش چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ اچھی خبر نہیں لائے ہیں ورنہ وہ بلاوجہ کسی کے گھر پر جا کے دھمکتے نہیں تھے۔ میں نے انہیں صوفے پر بٹھا کر سراسیمگی سے پوچھا۔ "خیریت تو ہے فخرو بھائی؟"

"خیریت کہاں ہے ہماری قسمت میں۔" فخرو بھائی نے بجھے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

"تم نے کل کا اخبار دیکھا؟"

میں نے نفی میں اپنا سر ہلایا۔ "نہیں تو!" میں نے حیران ہو کر کہا۔ "اخبار سے ہماری خیریت کا کیا تعلق ہے؟"

"بڑا گہرا تعلق ہے فرید بھائی!" فخرو بھائی الجھ سے گئے تھے۔ "ایک لرزہ طاری کر دینے والی خبر ہے۔ پری زاد خانم' کنول' اس کے ماموں نصیر' آنٹی اور ان کے تمام ساتھیوں کو رہا کر دیا گیا ہے۔ صرف ایک شخص جو پری زاد خانم کا مہمان بنا اور قاتل تھا' اس کی ضمانت منظور نہیں کی گئی۔ اخبار کی خبر کے علاوہ ایک اور خبر بھی لایا ہوں۔"

"لیکن ان کی رہائی سے ہم پر کیا فرق پڑے گا؟" میں نے تعجب کا اظہار کیا۔ "دوسری خبر کیا ہے؟"

"مجھ پر نہیں بلکہ آپ اور مہ جبیں' ان لوگوں کی لپیٹ میں آجائیں گے۔" فخرو بھائی تاسف سے بولے۔ "میں کل رات کنول کے ہاں تھا۔ ابھی بھی ان کے دلوں میں ٹھنڈک نہیں پڑی ہے۔ انہیں تو اس بات کا غم ہے کہ تم ان کے ہاتھ سے نکل گئے۔ دوسری خبر یہ ہے کہ آنٹی اس شخص کا پتا لگانے کی سرتوڑ کوشش کر رہی ہے کہ ان کے ہاں کس نے چرس چھپائی تھی؟ آنٹی کے منہ بولے بھائی اور کنول کے ماموں کا خیال ہے کہ یہ حرکت کاروباری رقابت کا نتیجہ ہے۔"

"کیا یہ بات پری زاد خانم یا آنٹی کے علم میں ہے کہ مہ جبیں کی بازیابی میں میرا ہاتھ ہے؟"

"نہیں۔" فخرو بھائی کے چہرے پر فکرمندی چھا گئی۔ "پری زاد خانم کے کانوں میں تمہاری بھنک بھی پڑ جاتی تو وہ تمہیں اب تک زندہ نہیں چھوڑتی۔ میں نے سنا ہے کہ پری زاد خانم اس روز والے واقعے سے بڑی برہم ہے۔ ایک تو اس کے ہاں سے نہ صرف سونے کی چڑیا اڑ گئی بلکہ اس کے پرانے' وفادار اور بااعتماد اور جانثار ساتھیوں کے ساتھ اس وحشیانہ سلوک کیا گیا کہ وہ دونوں مرتے مرتے بچے ہیں۔ اس کے علاوہ اسے لاکھوں' کروڑوں روپے کا نقصان پہنچا ہے۔ نامعلوم شخص نے اس کے بارے میں مخبری کر کے اسے کنگال کر کے رکھ دیا ہے۔ میرے خیال میں وہ نہ صرف اپنے انجانے دشمن سے انتقام لینے پر تلی ہوئی ہے بلکہ مہ جبیں کے اغوا کی بھی کوشش کرے گی کیونکہ مہ جبیں کے حسن و

ہو تو سے اس کے وارے نیارے ہو سکتے ہیں۔"

فخرو بھائی ہوش اڑا دینے والی سنگین خبریں لے کر آئے تھے۔ انہوں نے جن خدشات کا تذکرہ کیا تھا' میں اس سے انکار نہیں کر سکتا تھا۔ پری زاد خانم کو واقعی ایک دہکتی ہوئی بھٹی میں جھونک دیا گیا تھا۔ اس عرصے میں وہ بھٹی کی آگ میں جلتی ہوئی تڑپ تڑپ کر انتقام لینے کے لیے بے قرار ہو رہی ہوگی۔ وہ اپنے ارادوں کی تکمیل میں کوئی تاخیر برداشت نہیں کرے گی۔ وہ مہ جبیں کے حصول کے لیے پنجے جھاڑ کر پیچھے پڑ جائے گی۔

یہ سب کچھ سوچ کر میرا کلیجہ لرز گیا اور بدن میں سنسنی دوڑ گئی۔ اگر مہ جبیں کا اغوا ہو جاتا تو میرے لیے جان لیوا حادثہ ثابت ہوتا۔ پری زاد خانم جیسی سفاک عورت سے ٹکر لینا میری طاقت سے باہر تھا۔ وہ ایک جرائم پیشہ گروہ کی سردار تھی اور اسی ذہنیت کی مالک تھی۔ اس کے پاس بے حساب دولت تھی۔ اس دور میں اس کی طاقت' اثرو رسوخ اور جادو سے کون انکار کر سکتا ہے۔ میں اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں مہ جبیں کو کس طرح تحفظ دے سکتا ہوں۔ مجھے پریشان پا کر فخرو بھائی نے پوچھا۔ "کیا تم مہ جبیں کے لیے پریشان ہو رہے ہو؟"

میں نے اپنا سر ہلا کے اقرار کیا۔ "آپ کا اندازہ درست ہے۔"

"میں ایک دوستانہ مشورہ دوں۔" فخرو بھائی نے کسی خیال کے زیر اثر رک کر کہا۔ "جتنی جلدی ہو سکے مہ جبیں سے شادی کر لو۔ اس طرح مہ جبیں کو تحفظ مل جائے گا۔ پری زاد خانم بھی سوچ میں پڑ جائے گی' اس کے لیے مہ جبیں پر ہاتھ ڈالنا آسان نہیں رہے گا۔"

میں نے فخرو بھائی کو بتایا کہ میرے ساتھ سب سے بڑی مجبوری کیا ہے۔ "مہ جبیں کو کانوں کان یہ خبر تک نہیں ہے کہ اس کی بازیابی میں میرا کتنا ہاتھ ہے۔ میں نے کسی وجہ سے اس پر اپنا یہ کارنامہ ظاہر نہیں کیا اور اس پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ میں اس لیے بھی بتانا نہیں چاہتا ہوں کہ میرا کردار اور مشتبہ ہو جاتا ہے۔"

میں اور فخرو بھائی بڑی دیر تک سر جوڑ کر بیٹھے رہے لیکن ایسی کوئی صورت نظر نہیں آئی کہ مہ جبیں فوراً ہی میرے ساتھ شادی کرنے پر تیار ہو جائے کیونکہ بڑے میاں میرے کردار سے بڑے نالاں تھے اور انہیں مجھ سے بے حد نفرت تھی۔ میں جانتا تھا' وہ شخص

کسی قیمت پر مجھے اپنی بیٹی نہیں دے گا۔ فخرو بھائی کسی اور دن ملنے کا وعدہ کرکے رخصت ہو گئے لیکن میں سوچ سوچ کر پاگل ہوا جا رہا تھا۔ یکبارگی مجھے پچھتاوا ہوا کہ کاش کتنا اچھا ہوتا کہ میں نے مہ جبیں کو دیکھا ہوتا نہ اس سے ملا ہوتا۔ میری زندگی جو ایک ڈھرے پر سکون سے گزر رہی تھی' وہ گزرتی جاتی۔ میں ایک ذہنی اذیت' کربناک لمحات اور دہلا دینے والے حالات میں تو نہیں گھرتا۔

مجھے دوسرے روز یکلخت اپنی پریشانیوں کا حل نظر آگیا۔ میں جو ہر وقت مہ جبیں کے حسن و شباب کے خواب دیکھتا آرہا تھا' اس کی تعبیر جیسے پوری ہونے والی تھی۔ میں دن کے بارہ بجے مہ جبیں کے رہائشی علاقے میں ایک ایسی جگہ اپنے آپ کو چھپا کر کھڑا ہو گیا کہ اگر اس کا گزر ہو تو وہ مجھے نہ دیکھ سکے لیکن میں اسے اپنی نظروں کی گرفت میں لے سکوں۔ انتظار اور بڑی بے تابی کے بعد وہ لمحہ آہی گیا۔ میں نے دور سے مہ جبیں کو بس اسٹاپ کی طرف جاتے دیکھا۔ میرا دل سینے میں دھڑک اٹھا۔ میرے خوابوں کی پری' سر بہ سر سفید لباس میں ملبوس تھی' چہرہ سفید دوپٹے کی محراب میں چاند بن کر دمک رہا تھا۔ جیسے جیسے اس کے اور میرے درمیان فاصلہ کم ہوتا جا رہا تھا' ویسے ویسے اس کے تیکھے تیکھے خدوخال اور سفید چادر میں دہکتا ہوا سراپا مجھ پر بجلیاں گرائے جا رہا تھا۔ میں نے اپنی سانسیں روک لیں۔ میں پلکیں جھپکائے بغیر اسے دیکھتا رہا۔ میں نے بڑا ضبط کیا' میں یہاں پر اس سے کوئی بات کرنا نہیں چاہتا تھا۔ یہ جگہ موزوں بھی نہیں تھی۔ میرے ذہن میں تو دوسرا منصوبہ تھا۔

وہ بڑی تمکنت سے چلتی ہوئی بس اسٹاپ پر پہنچ کر عورتوں اور لڑکیوں کی بھیڑبھاڑ میں شامل ہو گئی تھی۔ اس پر صرف مردوں کی نگاہیں ہی مرکوز نہیں تھیں بلکہ لڑکیاں اور عورتیں بھی مہ جبیں کو حیرت بھری اور تعجب خیز نظروں سے اس طرح دیکھ رہی تھیں جیسے آسمان سے چاند اتر کے ان کے درمیان آگیا ہو۔ سادگی کا ایسا پروقار مجسمہ انہوں نے جیسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس علاقے کے لوگ اسے روز دیکھتے تھے تو آج بھی دیکھ رہے تھے' بالکل اسی طرح جیسے اسے پہلی بار دیکھ رہے ہوں۔ مہ جبیں ان ساری نگاہوں کو اپنی طرف متوجہ پا کر الجھن میں پڑ گئی تھی اور وہ بار بار کسمسانے لگتی تھی۔ جب کچھ دیر بعد بس آئی تو چاندنی بس میں سمٹ گئی۔ میں بھی بس کے تعاقب میں چل پڑا۔ میرا خیال تھا کہ وہ کسی

حسن کے بس اسٹاپ پر اتر کے وہاں سے طارق روڈ جانے والی ویگن پکڑے گی لیکن وہ بس اسٹاپ پر نہیں اتری بلکہ ریگل کے بس اسٹاپ پر اتری اور بوہری بازار جانے کی سمت جانے لگی۔ مجھے اسکوٹر پر اس کا تعاقب جاری رکھنا دشوار اور بے حد مشکل سا لگا۔ اس کے پلٹ کر دیکھنے سے میرا بھانڈا پھوٹ سکتا تھا۔ میں نے بڑی احتیاط سے اپنا تعاقب جاری رکھا۔

جب وہ صدر پوسٹ آفس کی عمارت میں داخل ہوئی تو میرا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا۔ میں اسکوٹر پوسٹ آفس کی عمارت کے سامنے پارک کر دیا۔ جانے کیا بات تھی کہ میں اندر جا کر مہ جبیں سے کسی بہانے مل کر بات کرنے کا حوصلہ نہیں پا رہا تھا۔ مجھ پر رعب حسن کچھ ایسا طاری ہوا کہ میں اپنی ساری چوکڑیاں بھول گیا' مجھے اس لمحے اپنے آپ پر بڑی حیرت ہوئی اور میں نے اپنی ذات سے پوچھا۔ "فرید یہ تم ہو؟" میں لڑکیوں سے بات کرنے کے معاملے میں بے حد ڈھیٹ' گستاخ اور ایک طرح سے بدمعاش ہی واقع ہوا تھا۔ میں موقع محل دیکھ کر راہ چلتی لڑکیوں سے چھیڑ چھاڑ کرنے سے چوکتا نہیں تھا بلکہ اکثر ایسا بھی ہوتا تھا کہ میں بڑی بے باکی سے ان کے بالکل پاس لے جا کر اپنا اسکوٹر روک لیتا' بڑی جرات سے انہیں لفٹ کی پیشکش کرتا۔ کبھی سنسان راستے میں کوئی لڑکی میرے ساتھ بدتمیزی سے پیش آتی تو میں دست درازی کرنے سے بھی باز نہیں آتا تھا۔ اس کے علاوہ جس دشت کا میں سیاح تھا' وہاں ایک مرد کے لیے لڑکی اور عورت دال برابر ہی تھی۔ اس کا حسن و شباب' شوخی' تیزی و طراری اور پندار حسن مجھے کسی طرح مرعوب اور متاثر نہیں کر سکتا تھا لیکن اب ایک لڑکی کے جمال کے جلال کے آگے اس قدر ہیچ ہو کر رہ گیا تھا کہ اس کا سامنا کرتے ہوئے پسینے آ رہے تھے۔

میں نے بہت سوچ بچار کے بعد ذہن میں ایک پروگرام ترتیب دیا کہ مجھے جلد از جلد مہ جبیں سے ملاقات کرنی چاہیے۔ میں ہوٹل یا تنہائی میں اس کے ساتھ دل کی باتیں کرنا چاہتا تھا۔ میں اس سے صاف صاف کہہ دینا چاہتا تھا کہ مہ جبیں میں لاکھ برا سہی لیکن ایک اچھا آدمی بن کر دکھا سکتا ہوں۔ آپ مجھے ایک موقع دیں' دیکھیں کہ آزمائش پر پورا اترتا ہوں یا نہیں۔ اس طرح میں مہ جبیں پر اپنا نفسیاتی اور جذباتی دباؤ ڈالنا چاہتا تھا۔ مہ جبیں کا لفظوں کے ہیر پھیر کے جھانسے میں آ کر میری ذات سے متاثر ہو جانا یقینی تھا' اس لیے کہ

مہ جبیں نے بڑی سادگی اور خوبصورتی سے ٹال دیا تھا۔ وہ اندر سے کس قدر گہری ہے' بظاہر اندازہ نہیں ہوتا تھا۔ اس نے عبدل اور اس کے ساتھیوں جیسے بدمعاشوں کو بڑی فنکاری سے زیر کر دیا تھا۔ میں اس کے داؤ میں آنے والا نہیں تھا۔ میں اسے ہر قیمت پر اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا' مجھ میں اتنا حوصلہ نہیں رہا تھا کہ فراق کی سولی پر لٹکتا رہوں اور اسے پری زاد خانم کے ہاتھوں میں کھلونا بنتے ہوئے دیکھوں۔ "میں آپ سے' صرف آپ سے باتیں کرنا چاہتا ہوں!"

اس نے فوراً ہی میری بات کا جواب دینے سے گریز کیا۔ اس کے بشرے پر اس کا اندرونی اضطراب ابھر آیا تھا۔ وہ متذبذب ہونے لگی تو میں نے بے اختیار پوچھ لیا۔ "کیا آپ کو میری باتیں ناگوار لگی ہیں؟"

"جی' جی۔" مہ جبیں کی گھنیری پلکیں اوپر اٹھیں۔ "آپ کوئی دن اور وقت مقرر کر لیں' مجھے بوہری بازار سے خریداری کر کے ملازمت پر پہنچنا ہے۔"

مہ جبیں ٹالنے پر تل گئی تھی۔ حسینوں کے وعدوں کا کیا بھروسا۔ میں نے لجاجت سے کہا۔ "میں صرف دس منٹ لوں گا۔ کیا آپ میری خاطر دس منٹ بھی نہیں دے سکتیں؟"

اس نے بڑی بے چارگی کے عالم میں ہتھیار ڈال دیئے۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ میں آسانی سے اس کا پیچھا نہیں چھوڑوں گا۔ "چلئے لیکن ایک منٹ' میں یہ خط پوسٹ کر دوں۔"

میں مہ جبیں کو اپنے اسکوٹر پر بٹھا کر شیزان ریستوان لے آیا۔ مہ جبیں نے شاید زندگی میں پہلی مرتبہ ایک شاندار قسم کے ریستوران میں قدم رکھا تھا لیکن اس نے اپنے چہرے سے کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا' اس پر گہری سنجیدگی طاری رہی۔ دو رویہ سجی سجائی میزوں پر جوان لڑکیاں' عورتیں اور مرد جو بیٹھے ہوئے تھے' ان کی نگاہیں حیرت و استعجاب سے اس دلکشی کے مجسمے کو دیکھ رہی تھیں جو بڑے وقار سے کسی شہ زادی کی مانند گزر رہا تھا۔ میں نے چلتے چلتے سنا' ایک لڑکی نے کہا تھا۔ "چاند سے بھی کہیں زیادہ پیاری ہے۔"

دوسری نے جواب دیا تھا۔ "میک اپ تو بالکل نہیں ہے۔ شاید آسمان سے کوئی حور اتر آئی ہے۔"

میں یہ ریمارکس سنتا ہوا ایک کونے میں آخری میز پر جا کر رکا۔ یہ گوشہ خالی پڑا ہوا تھا۔ میں نے پلٹ کر مہ جبیں کی جانب دیکھا' وہ سبک خرامی سے چلی آ رہی تھی۔ لڑکیوں

کے فقروں نے اسے بیربہوٹی بنا دیا تھا۔ وہ میرے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی' میں جیسے خوشبوؤں میں نہانے لگا۔

مجھے اپنی نظروں پر یقین نہیں آتا تھا۔ میں مہ جبیں کے لیے کتنی دور چلا گیا تھا۔ اگر مجھے پہلے ہی خیال آجاتا تو میں کب کی یہ راہ اختیار کرلیتا۔ میں نے مہ جبیں پر ایک اچٹتی نگاہ ڈالی' اس کی جھکی جھکی نظریں زمین پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ کرسی پر سمٹ کے بیٹھی ہوئی تھی۔ میں اپنی خوش نصیبی اور اس قربت کے لمحات پر نازاں ہونے لگا۔

میں نے چائے اور ناشتے کا آرڈر دے دیا' چائے آنے تک ہم دونوں کے درمیان رسمی باتوں کا سلسلہ چلتا رہا۔ وہ بڑی محتاط ہو کر میرے ہر سوال کا جواب دیتی رہی۔ اس نے مجھ سے اور میرے بارے میں ایک سوال بھی نہیں پوچھا۔ میں نے اسے اس قدر قریب سے دیکھ کر اور اس کی باتوں سے اندازہ لگایا کہ وہ عام لڑکیوں سے قدرے مختلف' بلند اور سلجھی ہوئی لڑکی ہے۔ اس کی اپنی ایک گمبھیر سی شخصیت تھی۔ وہ سنجیدگی میں ڈوبی رہی' کبھی کبھی کسی بات پر وہ مسکرائی تھی۔ بیرا چائے اور ناشتا رکھ کے چلا گیا۔ مہ جبیں کے نرم و نازک اور حسین ہاتھوں نے چائے بنائی اور ایک پیالی میرے آگے رکھ دی۔ میں نے چائے کا ایک گھونٹ لے کر اس کے چہرے پر ایک نظر ڈالی' اس عرصے میں' میں حسن کے دربار میں کسی در کھل سا گیا تھا۔ میری بے باکی لوٹ آئی تھی۔ میں وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے کسی قدر متذبذب ہو کر کہا۔ مس مہ جبیں! میں آپ سے ایک عرض کرنا چاہتا ہوں' کیا آپ میری جسارت کو معاف فرمائیں گی؟"

مہ جبیں میرے لہجے کے انداز پر چونکی تھی' اس کی غزالی آنکھیں سوالیہ نشان بن کر میرے چہرے پر مرکوز ہو گئیں' اس نے میرے بشرے سے اندازہ لگا لیا تھا' وہ آہستگی سے بولی۔ "فرمایئے۔"

میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔ "آپ نے میرے بارے میں کیا فیصلہ کیا؟"

"کیسا فیصلہ؟" وہ انجان سی بن گئی۔

"وہی فیصلہ جو میری زندگی اور موت سے تعلق رکھتا ہے۔" میں بے ساختہ بول اٹھا۔

مہ جبیں کے رخساروں پر اضطراب کی لہر دوڑ گئی اور وہ اپنی جگہ پر کسمسا کر رہ گئی۔ اس کی نظریں جھکی جھکی پیالی پر جمی رہیں۔ مہ جبیں نے شاید سوچا نہیں تھا کہ میں اس سے

ایسا غیر متوقع سوال کروں گا۔ جب ہی وہ تذبذب اور سراسیمگی کی کیفیت کا شکار ہو رہی تھی۔ اس کے لبوں کی پتیاں آپس میں پیوست ہو رہی تھیں۔ وہ اس طرح سے خاموش تھی جیسے اس کے ہونٹ سی دیئے گئے ہوں۔ میں نے اس کی چپ، کا فائدہ اٹھاتے ہوئے پوچھا۔ "کیا میں یہ سمجھوں کہ میرے حق میں فیصلہ ہو گیا ہے؟"

"آپ کو بابا ہی جواب دیں گے۔" مہ جبیں کی نگاہیں بدستور جھکی رہیں۔

"میں نے تو سنا ہے کہ آپ کے بابا نے فیصلہ آپ پر چھوڑ دیا ہے۔"

"لیکن میرے بابا تو زندہ ہیں۔" مہ جبیں کا چہرہ تمتما سا گیا' وہ تڑپ کر بولی۔ "کیا آپ ہمارے معاشرے کی ایک لڑکی کو اس حد تک آزاد اور بے شرم تصور کرتے ہیں کہ وہ سر راہ اپنی زندگی کے فیصلے سناتی پھرے؟"

"میں مہ جبیں! میں۔" میری آواز حلق میں پھنسنے لگی' وہ میری بات کاٹتی ہوئی تند لہجے میں کہنے لگی۔ "میں آپ کے ساتھ بات کرنے اس لیے چلی آئی کہ آپ ہمارے محسن ہیں' کیا آپ اپنے احسان کا فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں؟ آپ کو اس کے صلے کی تمنا ہے؟"

میں سناٹے میں آگیا۔ مہ جبیں اس قدر بولڈ لڑکی ثابت ہو گی' میرے وہم و گماں میں بھی نہیں تھا۔ میں تو یہ سمجھا تھا کہ وہ میرا مدعا جان کر شرما اور لجا جائے گی لیکن اس کے صاف جواب نے مجھ پر اوس ڈال دی۔ بات بگڑ گئی تھی' مجھے اپنی جلد بازی کا بڑا شدید احساس ہوا۔ یہ بات مجھے دو چار ملاقاتوں میں کہنا تھی لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ مجھے یکایک خوف سا ہوا کہ کہیں مہ جبیں اٹھ کر چلی نہ جائے' میں نے ندامت سے کہا۔ "میں اس دل آزاری کے لیے معافی چاہتا ہوں۔ پلیز آپ مجھے معاف کر دیں۔"

مہ جبیں نے میری بات کا جواب نہیں دیا' اس کے بشرے پر ناگواری چھائی ہوئی تھی۔ میں نے اس کی خاموشی سے فائدہ اٹھا کر کہنا شروع کیا۔ "میں سچے دل سے اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ میں واقعی بہت برا آدمی ہوں' مجھے حالات نے بگاڑ دیا۔ ناجائز آمدنی کی ریل پیل نے مجھے اندھا بنا دیا۔ ایک برائی نے میرے اندر بہت سی برائیاں پیدا کر دیں۔ میں اتنی دور نکل گیا کہ مجھے کبھی واپسی کا خیال بھی نہیں آیا۔"

میں نے توقف کر کے مہ جبیں کی جانب دیکھا۔ اس نے جیسے میرے ایک ایک لفظ پر دھیان دیا ہوا تھا' اس کی توجہ پا کر میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ "میں ایک اچھا آدمی بھی

بن سکتا ہوں' اگر آپ نے میری زندگی کا ہمسفر بننا قبول کر لیا تو میں یکسر بدل جاؤں گا۔ آپ ہی مجھے کندن بنا سکتی ہیں۔ آپ میری آزمائش کر کے دیکھیں تو سہی۔" میں نے توقف کر کے گہرا سانس لیا۔ دلدل میں ڈوبتے ہوئے شخص کو کوئی سہارا ملے تو کیا وہ دلدل سے نکل کر باہر نہیں آسکتا؟ کیا اسے دلدل میں اس لیے چھوڑ دینا چاہیے کہ وہ دھنس رہا ہے تو اسے دھنس ہی جانے دو؟"

مہ جبیں کا خوشنما سر جو جھکا ہوا تھا' وہ اوپر نہیں اٹھا' میں نے اس کے رخساروں پر ایک ہلکی سی سرخی ابھرتی ہوئی دیکھی۔ وہ خاموشی کے طلسم میں ڈوبی ہوئی شاید اپنے دل کی دھڑکنوں کی صدا سن رہی تھی۔ "مس مہ جبیں! میری آواز جیسے تھرتھرانے لگی تھی۔ "میں ایک ایسی بات کہنے جا رہا ہوں جس کے اظہار کا یہ موقع نہیں ہے۔ جانے کیوں میں دل کے ہاتھوں مجبور ہوا جا رہا ہوں۔ جب سے میں نے آپ کو دیکھا ہے' تب سے میں اپنی ذات کو فراموش کر بیٹھا ہوں۔ میں جس آگ میں جل رہا ہوں' آپ اس کا اندازہ نہیں کر سکتی ہیں۔ آپ کو ہو بھی کیسے سکتا ہے جبکہ آپ نے مجھے اس عالم میں دیکھا ہی نہیں۔ آپ میری ایک بات صاف صاف سن لیں۔ "میرے سینے میں دل بے حس و حرکت ہو کر رہ گیا ہے۔ یکلخت جیسے سانسیں رک گئیں۔ میں آپ کے بغیر یہ کٹھن اور کربناک زندگی نہیں گزار سکتا۔ اگر آپ نے میرے حق میں بے رحمی سے کوئی فیصلہ کیا تو میں برا آدمی بن جاؤں گا۔ ایک ایسا بدترین شخص جس کی مثال اس معاشرے میں نہیں ملے گی۔"

مجھے خود نہیں معلوم تھا کہ میں بے خودی کے عالم میں اس سے کیا کچھ کہہ گیا۔ جب میں ے اپنی بات ختم کی تو یوں محسوس ہوا کہ میرے سر سے منوں بوجھ اتر گیا ہے۔ مہ جبیں پر سکتے کی کیفیت طاری تھی۔ وہ پتھر کا منجمد مجسمہ بن کر رہ گئی تھی' سرتاپا اس میں ذرا سی بھی جنبش نہیں ہوئی۔ میں نے اپنی بات میں ایک گرہ اور لگائی۔ "مجھے اَب اس موضوع پر ایک لفظ بھی نہیں کہنا ہے۔ مجھے جو کچھ کہنا تھا' وہ میں نے کہہ دیا۔" میں نے ٹھنڈی چائے سے اپنا حلق تر کر لیا۔

یکبارگی اس کے رخسار دہک اٹھے۔ اس کے جسم میں ارتعاش پیدا ہوا۔ اس نے پلکیں جھپکا کر میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں اور چہرے پر خفگی یا ناگواری بالکل نہیں تھی۔ وہ میری خالی پیالی دیکھ کر مسکرائی اور شیریں لہجے میں پوچھا۔ "کیا آپ کے لیے چائے اور بنا

دوں؟"

"جی!" میں اسے خوش دیکھ کر سرشار ہو گیا۔ "آپ چائے بنا کر پلاتی رہیں' میں پیتا جاؤں گا۔"

"اچھا!" وہ کھل اٹھی' اس کی آنکھوں میں ہزاروں بلب جل اٹھے۔ "اتنی ساری چائے کی پتی کہاں سے آئے گی؟"

مہ جبیں کی پیالی اور کیتلی میں چائے ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ میں نے ایک خالی کپ اور چائے منگوا لی۔ مہ جبیں نے چائے پیتے ہوئے یکلخت جھجکتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔ "کیا آپ رشوت لینا بند نہیں کر سکتے؟"

میں نے زیرلب مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "کیوں نہیں۔ آپ یہ سمجھ لیجیے کہ میں نے آج سے رشوت لینا چھوڑ دیا ہے۔"

"اس کی کیا ضمانت ہے؟"

"یہ ایک مرد کا قول ہے۔"

"قول نبھانا بڑا مشکل ہے۔" مہ جبیں نے مترنم لہجے میں کہا۔ "ابو کہتے ہیں کہ جسے ایک بار یہ مرض لاحق ہو گیا' وہ دائمی مریض بن جاتا ہے۔ ابو خفیہ پولیس میں انسپکٹر رہے ہیں' وہ اپنے اصول اور قول و فعل کی وجہ سے اپنے محکمے میں اپنی مثال آپ تھے۔ وہ بتاتے ہیں کہ ان کے کسی ساتھی نے کسی مجبوری کے تحت صرف ایک مرتبہ رشوت کیا لی' وہ ہمیشہ کے لیے اس لعنت کا شکار ہو گیا۔ جب ہی ابو نے کڑے سے کڑے وقت میں رشوت لینے سے احتراز کیا۔"

مجھے یوں محسوس ہوا کہ بے خبری کے عالم میں میرے جسم پر ڈنک لگا ہے۔ میں اچھل پڑا۔ اب میری سمجھ میں آگیا کہ بڑے میاں نے میرے بارے میں اتنا سب کچھ کیسے اور کیونکر معلوم کر لیا۔ کوئی اور ہوتا تو میرے ماضی اور حال کی اس قدر چھان پھٹک نہیں کر سکتا تھا۔ مہ جبیں نے اپنی چائے ختم کی اور اپنی دستی گھڑی میں وقت دیکھتی ہوئی اپنے آپ کو سمیٹنے لگی۔ "مجھے دیر ہو رہی ہے' اجازت دیں۔"

میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی پوچھ لیا۔ "کیا میں آپ کی زبان سے اپنے بارے میں کوئی فیصلہ سن سکتا ہوں؟"

مہ جبیں کے لبوں پر ایک دلکش تبسم پھوٹنے لگا۔ وہ پلکیں جھپکاتی ہوئی میٹھے لہجے میں بولی۔ "آپ نے کچھ دیر قبل کہا تھا کہ میں اب اس موضوع پر ایک لفظ بھی نہیں کہوں گا۔" اس نے مجھ سے نظریں چار کیں۔ "کیا ایسے شخص سے ثابت قدم رہنے کی توقع کی جا سکتی ہے؟"

مہ جبیں نے میری طبیعت صاف کر دی تھی۔ میں بغلیں جھانکنے لگا' میں نے اپنی خفت مٹانے کے لیے دور کھڑے ہوئے بیرے کو اشارہ کرکے اسے بل لانے کے لیے کہا۔ جب ہم بیرونی دروازے پر پہنچے تو میں ٹھٹک کر رک گیا۔ کنول اپنے ماموں' آنٹی اور ایک موٹے تازہ مرغے کے ساتھ اندر داخل ہو رہی تھی۔ میری اور کنول کی نظریں چار ہوئیں۔ میں ان لوگوں کو دیکھتے ہی سٹپٹا گیا کیونکہ مہ جبیں میرے ساتھ تھی۔ کنول مجھے دیکھتے ہی یکبارگی خوشی سے کھل اٹھی لیکن اس کی نگاہ جیسے ہی مہ جبیں پر پڑی' اس کا چہرہ بجھ گیا اور اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں حسد و رقابت کی چنگاریاں بھڑک اٹھی تھیں۔ معاً میری نگاہ آنٹی پر پڑی تو میں نے انہیں اپنی جانب قہر آلود نظروں سے دیکھتے ہوئے پایا۔ اگر اعلیٰ قسم کا ریستوران اور ان کے ساتھ موٹی آسامی نہ ہوتی تو شاید آنٹی میرا گریبان پکڑ لیتیں۔ میں مہ جبیں کو اپنے ساتھ لے کر تیزی سے باہر نکل آیا۔

میں نے مہ جبیں کو بوہری بازار کی نکڑ پر اتار دیا۔ اسے اپنی دکان کے لیے آرائش کی اشیاء خریدنی تھیں۔ میں اسے رخصت کرتے وقت اپنی عادت سے باز نہیں آیا۔ "کل میں اپنی امی کو آپ کے ہاں بھیج رہا ہوں۔"

مہ جبیں گلابی گلابی ہو گئی۔ اس کے لبوں پر حیاء آلود تبسم ابھر آیا۔ وہ تیزی سے خدا حافظ کہتی ہوئی گلی کی جانب بڑھ گئی۔

میں اس جگہ اس وقت تک کھڑا ہوا دیکھتا رہا جب تک وہ میری نظروں سے اوجھل نہیں ہو گئی۔ وہ اپنی مہک اور اپنا وجود میری ذات میں تحلیل کر کے گئی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ میں نے جاگتے میں کوئی رنگین سا سپنا دیکھا تھا۔ یہ سپنا میری رگوں میں امرت بن کر اترتا جا رہا تھا۔ میں نے اپنے تئیں ایک ایسی دولت پا لی تھی جس کا اندازہ کوئی دوسرا نہیں لگا سکتا تھا۔

دوسرے دن امی جان کی طبیعت ناساز تھی۔ انہوں نے دو تین روز کے بعد جانے کا

وعدہ کر لیا۔ میں جب اپنے دفتر میں لفٹ سے آٹھویں منزل پر پہنچا تو میں نے راہداری میں عجیب سی ہلچل اور افراتفری مچی ہوئی دیکھی۔ دس بج رہے تھے‘ اس وقت لوگوں کی آمد و رفت شروع ہو جاتی تھی لیکن ایسی بدنظمی اور اس قدر ہجوم میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ میرے شناسا دفتری لوگ مجھے معنی خیز نظروں سے دیکھتے اور زیر لب مسکراتے چلے جا رہے تھے۔ یہ سب کچھ میرے لیے نیا اور حیرت انگیز تھا۔ جانے ایسی کیا بات ہو گئی تھی کہ ہر شخص مجھے گھورتا دکھائی دے رہا تھا جیسے میں پاگل ہو گیا ہوں۔ میں نے اپنے کمرے کے سامنے بھیڑ بھاڑ دیکھی تو میں چونک پڑا اور تیز تیز قدموں سے وہاں جا پہنچا۔ پیچھے کھڑے ہوئے لوگ اچھل اچھل کر اندر جھانک کر اس طرح دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے جیسے اندر کوئی تماشا ہو رہا ہو۔

جب میں ہجوم کو چیرتا ہوا کمرے کے اندر داخل ہوا تو میں اپنی جگہ بھونچکا ہو کر رک گیا۔ کمرے میں جیسے بھونچال آگیا تھا۔ میں نے کمرے کی ہر چیز چکر کھاتی ہوئی محسوس کی۔ میری میز پر کنول کسی راجکماری کے سے انداز میں بیٹھی ہوئی تھی۔ میرے دفتر کے دو تین ساتھی اس سے ہنس ہنس کر باتیں کیے جا رہے تھے اور وہ بڑی مستانہ اداؤں اور تیکھی تیکھی نظروں سے دیکھتی ہوئی جواب دے رہی تھی۔ اس کے لہجے میں ضرورت سے زیادہ شوخی اور بے باکی جھلک رہی تھی۔ نفیس میک اپ‘ بھینی بھینی خوشبو اور خطرناک حد تک نیچی تراش خراش کے لباس میں وہ نگاہوں اور دلوں کو گرما رہی تھی۔ میرے دفتر میں کنول کے عاشقوں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ اکے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ کبھی یہاں بھی آسکتی ہے۔ انہی لوگوں کی معنی خیز نگاہیں مجھ سے کہہ رہی تھیں۔ ”یار! تم تو بڑے چھپے رستم نکلے۔“

کنول مجھے دیکھتے ہی کھل اٹھی اور اس کی آنکھوں میں میرے لیے چراغ جل اٹھے لیکن میں اندر ہی اندر کھول کر رہ گیا اور میرا دماغ ماؤف ہونے لگا۔ میں تو اپنی دانست میں یہ سمجھا تھا کہ یہ باب ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا ہے۔ گو فخرو بھائی نے خطرے کی گھنٹی بجنے کا اندیشہ ظاہر کیا تھا لیکن آج کنول بلا بن کر میرے سر پر سوار ہونے کیسے آگئی؟ وہ اس وقت ایک چڑیل سے کم نہیں لگ رہی تھی۔ میں نے اس کی جانب بڑی ناگواری سے دیکھا تھا لیکن میری اس سرد مہری کا کنول نے ذرہ برابر بھی اثر نہیں لیا۔ اس نے محبوبانہ دلربائی کے

انداز سے مجھے کھڑے ہو کر سلام کیا۔

میں نے اس کے سلام کا جواب دینا بھی گوارا نہیں کیا۔ جب میں اپنی کرسی پر بیٹھا تو کمرے کے باہر گلی میں بھیڑ بھاڑ میں ایک بھنبھناہٹ اور ارتعاش پیدا ہوا۔ ہوٹل کے دو ملازمین' ایک دوسرے کے پیچھے پیچھے اپنے ہاتھوں میں ٹرے لیے اندر داخل ہوئے۔ ان میں سینڈوچ' پڈنگ' بسکٹ اور چائے تھی۔ یہ سب کچھ کنول کے عاشقوں نے اس کی خاطر مدارت کے لیے کیا تھا۔ ہر ایک نگاہ حیرت سے مجھ پر جمی ہوئی تھی۔ سب لوگ میرے سفاکانہ' بے رخی کے برتاؤ کو دیکھ رہے تھے جو میں نے کنول سے روا رکھا تھا۔ باقر جو لیڈر بنا ہوا تھا' اس نے کنول کو بڑے چاؤ سے ناشتے کے لوازم پیش کیے۔ کنول نے پڈنگ کا پیالہ اٹھا کر باقر کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اس کا شکریہ ادا کیا تو باقر صاحب کی روح جیسے قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔

میں نے بڑے تحمل اور سپاٹ لہجے میں کنول کو مخاطب کیا۔ "فرمایئے' آپ نے کیسے زحمت کی؟"

اس نے میرے رویے کا کوئی اثر نہیں لیا' وہ اٹھلا کر کرسی میں کسماتی ہوئی ایک ہاتھ میں پڈنگ کا پیالہ پکڑے' دوسرے ہاتھ سے ساڑھی کا پلو' آنکھوں کو چندھیا دینے والا نظارہ دکھا کر اسے شانے پر درست کرتی ہوئی گنگنانے کے انداز میں بولی۔ "امی نے آپ کو ابھی اور اسی وقت بلایا ہے۔ میں آپ کو اپنے ساتھ لے جانے کے لیے آئی ہوں۔" اس نے چمچے سے اپنے منہ میں پڈنگ ڈالی۔ "میں کوئی آدھے گھنٹے سے آپ کا انتظار کر رہی ہوں۔"

میں نے سوچا کہ کنول کے اس احسان کے لیے ایسے الفاظ میں شکریہ ادا کر دوں کہ اسے دن میں تارے نظر آجائیں۔ میں نے بڑا ضبط کیا۔ آنٹی نے شاید ہمارے خلاف کوئی ناپاک سازش تیار کی تھی۔ وہ کنول کو مہرہ بنا کر کوئی گہری چال چل رہی تھیں۔ کل آنٹی نے مجھے مہ جبیں کے ساتھ کیا دیکھا تھا' ان کے سینے پر سانپ لوٹ گئے تھے۔ کنول کو شاید سب سے زیادہ دکھ اور رنج ہوا ہوگا۔ اس کے دل کے زخم ہرے ہو اٹھے تھے۔ وہ اپنی ناکامی کا بھرپور انتقام لینے پر تل گئی تھی کیونکہ اس کے دل کی حسرت پوری نہیں ہوئی تھی۔ مہ جبیں کے پری زاد خانم کے ہاتھوں اغوا ہونے پر کنول کے سینے میں جو ٹھنڈک پڑی تھی'

اس کے فرار نے وہاں گہرا گھاؤ ڈال دیا تھا جسے صرف میری ذات مرہم بن کر مندمل کر سکتی تھی۔ کنول اور آنٹی میں سے کسی نے مہ جبیں کو دیکھا نہیں تھا۔ محض اس کا نام فخرو بھائی کی زبانی سنا تھا۔ شاید اس کے حسن کی تعریف پری زاد خانم نے ان دونوں سے بیان کی ہو۔ کل یقیناً ان لوگوں نے مہ جبیں کو پہچان لیا تھا' جب ہی میرے خلاف کوئی منصوبہ بنا کر مجھے بلایا گیا تھا۔ وہ مجھے خاموش اور سوچتا ہوا دیکھ کر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ "آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟"

میں نے اسے ٹالنے کی غرض سے سرد مہری سے جواب دیا۔ "میں کسی اور وقت حاضر ہو جاؤں گا۔ میں دفتر ابھی پہنچا ہوں۔ مجھے بہت سارے کام نمٹانے ہیں۔"

"پلیز ڈیئر!" اس نے بڑی بے تکلفی سے کہا تو میری نس نس میں لہو ابلنے لگا۔ "دیکھیے نا!" اس نے شکایت کے انداز میں کہا۔ "آخر تم کس لیے ناراض ہو؟ پہلے تو تم ہر روز رات کو گھر آیا کرتے تھے لیکن آج کل جانے کہاں غائب رہتے ہو!"

"آپ کے فرید صاحب تو دفتر سے بھی غائب رہنے لگے ہیں۔" باقر صاحب نے بیچ میں لقمہ دیا۔

"اچھا!" کنول نے مجھے معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ "جانے کس خوش نصیب کی قسمت جاگی ہوئی ہے۔"

میں کنول کے لہجے کا طنز برداشت نہیں کر سکا' تاہم میں نے بڑا ضبط کیا اور تیز و تند لہجے میں کہا۔ "سنو کنول! یہ دفتر ہے' تمہارا اس طرح چلے آنا مناسب نہیں تھا۔ فخرو بھائی کے ہاتھ سے پیغام بھیج دیا ہوتا۔"

"اچھا بابا!" اس پر میرے غصے کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ ڈھیٹ پن سے پڈنگ کے پیالے کے ساتھ ہاتھ جوڑ کر نمسکار کرتی ہوئی مسکرائی۔ "آئندہ خیال رکھوں گی' بس تم اپنا غصہ تھوک دو اور میرے ساتھ چلو۔"

"یار چلے بھی جاؤ نا!" باقر نے میرے قریب آ کر شانے پر ہاتھ رکھ کر شوخی سے کہا۔ "اگر کنول صاحبہ ہم سے کہیں کہ آٹھویں منزل سے چھلانگ لگا دو میں شاید ایک منٹ کی دیر بھی نہ کروں۔"

"تم باقر صاحب کو ساتھ لے جاؤ۔" میں نے تلخی سے کہا۔ "باقر صاحب گھر کے کام

کالج میں بڑے ماہر ہیں۔"

کنول بڑی دیر تک مجھ سے الجھتی رہی' چائے پیتی رہی۔ میں کسی قیمت پر اس کے ساتھ جانے کو تیار نہیں ہوا تو آخرکار اس نے مجھے اس بات پر رضامند کرلیا کہ میں نیچے تک چل کر اسے ٹیکسی میں سوار کرا دوں۔ جب میں اسے نیچے لے کر آیا تو بیرونی صدر دروازے سے بہت دور ایک خالی ٹیکسی کھڑی نظر آئی۔ میں کنول سے باتیں کرتے ہوئے ٹیکسی کے پاس پہنچا۔ ٹیکسی ڈرائیور کنول کو دیکھ کر سواری لے جانے پر رضامند ہو گیا۔ کنول اگلی نشست کا دروازہ کھول کر بیٹھی تو مجھے حیرت ہوئی۔ میری حیرت دور بھی نہیں ہوئی تھی کہ میری پشت پر دو آدمیوں نے پہنچ کر مجھے گھیر لیا۔ ایک آدمی نے میری کمر پکڑ کر اس انداز سے ٹیکسی کے اندر دھکیلا جیسے وہ میرے ساتھ دوستانہ مذاق کر رہا ہے۔ میں چونکہ اس غیر متوقع حملے کے لیے تیار نہیں تھا' لہٰذا اس کی طاقت کے آگے میں اپنا توازن برقرار نہیں رکھ سکا۔ میں سمٹ کر منہ کے بل جا گرا' دوسرا شخص سرعت سے ٹیکسی کی دوسری طرف کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا تھا۔ اس نے ٹیکسی کے اندر کپڑے سے ڈھکا ہوا خنجر اٹھا کر میری نظروں کے سامنے نچایا۔ جس شخص نے مجھے اندر دھکا دیا تھا' وہ مجھے سیدھا کرتا ہوا اندر گھس کر بیٹھ گیا۔ یہ سب کچھ اس تیزی سے اور آناً فاناً ہوا کہ میں دیکھتا رہ گیا۔ راہ گیروں نے بھی اس حادثے کو ایک مذاق ہی سمجھا ہوگا کیونکہ کنول جس انداز سے ہنس رہی تھی' اس سے ہر شخص یہی تاثر لے سکتا تھا۔ دوسرے شخص کے بیٹھتے ہی ٹیکسی فوراً چل پڑی۔ میں نے اپنی دونوں پسلیوں میں خنجر اور چاقو کی نوک محسوس کی' میرے بائیں ہاتھ پر بیٹھے ہوئے شخص نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔ "تم یہ مت سمجھنا کہ دن کی روشنی میں کوئی تمہاری مدد کو آجائے گا۔ اگر کسی نے تمہارے چیخنے چلانے پر مدد کی کوشش کی تو سب سے پہلے تم اوپر پہنچ جاؤ گے' کیا سمجھے؟"

"فرید ڈیئر!" کنول کے لہجے میں زہر بھر گیا۔ "کہنے والے نے درست ہی کہا ہے کہ سیدھی انگلی سے گھی نہیں نکلتا ہے۔ تم میرے ساتھ شرافت سے کیوں نہیں چلے آئے؟"

"تم میرے ساتھ جو کچھ کرنے والی ہو' اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔ "تم میرا کچھ بگاڑ نہیں سکتیں۔"

"میں تم سے بگاڑ کرتے نہیں بلکہ تباہ کرنے کو پیدا ہوئی ہوں۔" کنول تمسخر سے بولی۔

"تم تو دیوتا ہو' تمھیں ہر لڑکی پوجنا چاہتی ہے۔"

کنول نے ہر جملے میں مہ جبیں کی طرف اشارہ کیا تھا۔ میں نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا بلکہ خاموشی سے باہر جھانکنے کے بہانے میں نے ان دونوں بدمعاشوں کے چہروں کا جائزہ لیا۔ وہ مضبوط جسم کے اور تندرست و توانا تھے۔ چہرے مہرے سے پیشہ ور دکھائی دے رہے تھے۔ اگر میں رہائی اور ان کے نرغے سے نکلنے کی کوشش کرتا تو میں ان کی درندگی کا شکار ہو جاتا۔ میں نے دانشمندی اسی میں سمجھی کہ اپنے آپ کو حالات کے سپرد کر دوں' کنول اور آنٹی مل کر میرے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہتی ہیں' میں اس کا مقابلہ اور سامنا کرنے کے لیے خود کو ذہنی طور پر تیار کرنے لگا۔

ٹیکسی جب پری زاد خانم کی وسیع و عریض کوٹھی کے احاطے میں داخل ہو کر برساتی کے نیچے رکی تو دہشت سے میرے بدن میں جھرجھری آگئی۔ میری رگ و پے میں برف بجنے لگی۔ جب میں ان دونوں بدمعاشوں کی گرفت میں اس عمارت کے اندر داخل ہونے لگا تو میرے قدم ڈگمگانے لگے۔ مجھے اپنی موت سامنے نظر آرہی تھی۔ پری زاد خانم نے جانے کس طرح معلوم کر لیا تھا کہ مہ جبیں کی بازیابی' اس کے ساتھیوں کا حشر نشر کرنے اور منشیات کے بارے میں رپورٹ دینے میں میرا ہاتھ ہے۔ پری زاد خانم کے دونوں ساتھیوں نے مجھے اور قاسم بخش کو دیکھا ہوا تھا۔ ان کا مجھے پہچان لینا مشکل نہیں تھا۔ قاسم بخش کی اطلاع کے مطابق وہ دونوں بدمعاش گرفتار ہو کر پولیس کی نگرانی میں زیر علاج تھے۔ شاید وہ صحت یاب ہو گئے تھے اور پری زاد خانم نے ان دونوں کو بھی ضمانت پر رہا کرا لیا تھا۔ یہ میرا خیال تھا جو غلط بھی ہو سکتا تھا۔

میں ان تینوں کے گھیرے میں بالائی منزل پر پہنچا۔ یہ ایک بڑے مستطیل کمرہ تھا جس کی کھڑکیوں پہ گہرے رنگ کے پردے پڑے ہوئے تھے۔ یہ ملاقاتی کمرے کی مانند تھا۔ اس میں کرسیاں' صوفے اور ایک کونے میں لکھنے پڑھنے کی میز پڑی ہوئی تھی۔ اس کمرے سے گزر کر مجھے ایک کمرے میں لے جا کر دھکیل دیا گیا۔ میں فرش پر گرتے گرتے بچا' دیوار کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا تو کنول استہزائیہ انداز سے ہنس کر کہنے لگی۔ "فرید صاحب! آپ فی الحال شام تک آرام کریں۔ دوپہر کو کھانا' سہ پہر کو چائے مل جائے گی۔ رات کے کھانے کے بارے میں آنٹی ہی کوئی فیصلہ کر سکیں گی۔ اس کمرے میں کتابیں' پلنگ' بستر اور کرسی

موجود ہے' لہٰذا آپ اس پر تکلف آسائش والی جیل میں آرام کریں۔ شام تک کے لیے مجھے بھی اجازت دیں۔ خدا حافظ۔"

کنول نے میرے جواب کا انتظار کیے بغیر دونوں پٹ بند کر کے باہر سے کنڈی لگا دی۔

میں سن ہو کر اسی جگہ برف کے مانند جم سا گیا۔ میں اس وقت تک دروازے کی جانب دیکھتا رہا جب تک ان تینوں کے پیروں کی چاپ اور باتیں کرنے کی آوازیں گہرے سناٹے میں ڈوب نہیں گئیں۔ جانے کس امید پر میں کھڑا رہ گیا تھا۔ ناامید سا ہو کر میں پلٹا اور ایک آرام دہ کرسی میں اپنے آپ کو ڈھیر کر دیا۔ میری آنکھیں آپ ہی آپ بند ہو گئیں اور بڑی دیر تک بے سدھ ہو کر بے ترتیبی سے پڑا رہا۔ میرے سینے میں ایک آتش فشاں دہک رہا تھا۔ میں جس قدر اس سنگین واقعے کے بارے میں سوچتا' میرا سنسناتا ہوا دماغ اتنا ہی پریشان ہو جاتا۔ یکبارگی مجھے یوں محسوس ہونے لگا کہ میری شریانوں میں جسم کا سارا خون سمٹ آیا ہے اور وہ اب بس پھٹنے ہی والی ہیں۔ میں نے گھبرا کے فوراً ہی آنکھیں کھول دیں۔ میں نے ذہنی دباؤ کو کم کرنے کی غرض سے کمرے میں ٹہلنا اور کمرے کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ فرش پر ایرانی قالین چاروں کونوں تک بچھا ہوا تھا۔ اس کمرے میں ضرورت کی ہر وہ چیز موجود تھی جس کا تذکرہ کنول نے کیا تھا۔ یہ آراستہ و پیراستہ کمرہ شاید مہمانوں کے لیے مخصوص ہوتا تھا۔ جب ہی اس کی آرائش و زیبائش پر پوری توجہ دی گئی تھی۔ مجھے یہاں کسی شاہی قیدی کی طرح رکھا گیا تھا۔ معاً میری نگاہ کھلی ہوئی کھڑکی سے باہر گئی تو میں چونک گیا۔ مجھے پیپل کا گھنا اور تناور درخت دکھائی دیا۔ یہ وہی کمرہ تھا جس میں مہ جبیں قید تھی۔

مجھے حالات کی ستم ظریفی پر بے اختیار ہنسی آگئی اور رونا بھی آیا۔ میں نے مہ جبیں کو اغوا کر کے فلیٹ میں قید کر کے اس سے اپنی غرض پوری کرنے کا منصوبہ بنایا تھا لیکن وہ کسی وجہ سے ناکام ہو گیا۔ اب حالات نے مجھے پری زاد خانم کا اسیر بنا دیا۔ میں اندھیرے میں تھا۔ میں یہ فیصلہ نہیں کر پایا کہ میں کس کا مجرم ہوں۔ کنول کا یا پری زاد خانم کا؟ جس کا بھی اسیر تھا' برا پھنسا تھا۔ چھٹی کا دودھ یاد آنے میں کوئی کسر نہیں رہ گئی تھی۔

جب میں نے اس کمرے سے ملحق غسل خانے میں جا کر آئینے میں اپنی شکل دیکھی تو اپنے آپ کو پہچان نہ سکا۔ موت کے خوف نے ایک گھنٹے میں میری صورت یکسر بدل کر رکھ

دی تھی۔ میں اپنے بستر پر نڈھال ہو کر گر پڑا۔ میں سوچتا رہا' موت صرف ایک بار آتی ہے' اس کا وقت معین ہے۔ ہزاروں آنٹی اور پری زاد خانم مل کر بھی میرا بال بیکا نہیں کر سکتی ہیں۔ یہ احساس اس قدر فرحت بخش تھا کہ میں گہری نیند میں ڈوب گیا۔ جانے کتنی دیر تک سوتا رہا۔ جب میری نیند ٹوٹ رہی تھی' تب میں نے اپنے نتھنوں میں بھینی بھینی خوشبو محسوس کی جس کی مہک نے مجھے بڑا سرور بخشا۔ میں نے اپنے شانے پر نرم و نازک ہاتھ کے لمس کا گداز پایا۔ جب میں نے اپنے آنکھیں کھولیں تو کنول کو جھکا ہوا پایا۔ ہم دونوں کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں رہا تھا۔ ایک دوسرے کی گرم گرم سانسیں آپس میں مل رہی تھیں۔ میں زیرلب مسکرایا' میرے ہونٹوں نے کچھ کہنے کے لیے جنبش کی تو کنول کے لبوں نے اسے مقفل کر دیا۔ اگر میں جدائی میں پہل نہیں کرتا تو لمحات شاید گھڑیوں میں تبدیل ہو جاتے' کنول کے تیور ہی کچھ ایسے تھے۔

میں نے ایک چھوٹی سی میز پر کھانا چنا ہوا دیکھا۔ "چلو اٹھو!" کنول کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ "تم واقعی ایک بہادر آدمی ہو؟ بزدلوں کو ایسی گہری نیند نہیں آتی ہے۔"

اس نے مجھے بڑے چاؤ اور اصرار سے اس طرح کھانا کھلایا جیسے میں مہمان ہوں' قیدی نہیں۔ جب اس نے بڑی سی ٹرے میں برتن رکھ دیئے تو میں تکیے کے سہارے نیم دراز ہو گیا۔ وہ میرے پاس ہی بیٹھ گئی' اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر پیار سے اپنے رخساروں پر رکھا تو مجھے یقین ہو گیا کہ یہ لوگ میرا کیا حشر کرنے والے ہیں۔ پھانسی دیئے جانے والے مجرم کے ساتھ آخری دنوں اور لمحوں میں بڑی فیاضی سے رحم دلی کا سلوک کیا جاتا ہے۔ میں نے کنول کے رخسار پر اپنی نگاہ مرکوز کر کے پوچھا۔ "کیا تم یہ بتانا پسند کرو گی کہ مجھے یہاں زبردستی کس لیے لایا گیا ہے؟"

کنول نے میری جانب دیکھا اور آنکھوں میں جھانکتی ہوئی آہستگی سے بولی۔ "تمہیں یہاں پری زاد کے حکم پر لایا گیا ہے۔ اسے تم پر شک ہے۔"

"کیسا شک؟" میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

"کل رات پری زاد خانم ہمارے یہاں آئی ہوئی تھی۔" کنول نے میرے ہاتھ کو سینے پر آہستگی سے رکھ دیا۔ "آنٹی نے کل تمہارا اور مہ جبیں کا تذکرہ کیا کہ تم دونوں کو ایک ہوٹل میں دیکھا گیا ہے۔ پری زاد خانم یہ سن کر چونکی' اس کا خیال ہے کہ تم اور تمہارا

دوست مل کر نہ صرف مہ جبیں کو یہاں سے لے کر فرار ہوئے بلکہ اس کے آدمیوں کے ساتھ وحشیانہ سلوک کیا اور پولیس کو مخبری بھی کر دی کہ اس کے ہاں ایک سیاسی لیڈر کا قاتل' شراب اور ہیروئن کا اسٹاک موجود ہے۔ وہ اپنے آدمیوں سے تمہاری شناخت کروائے گی' اگر اس شخص نے تمہارے حق میں فیصلہ کر دیا تو تمہاری جان بخشی ہو جائے گی لیکن تم پھر بھی کسی اور کے قیدی بن جاؤ گے۔"

میں دل ہی دل میں پری زاد خانم کی ذہانت اور اس کی سوچ کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔ اس کا اندازہ اپنی جگہ درست تھا۔ میرے رگ و پے میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ پری زاد خانم کے دو آدمیوں میں سے ایک شخص مجھے شناخت کر لے گا۔ اس کا مجھے شناخت کر لینا کچھ مشکل نہیں تھا۔ میں تو ہزاروں میں منفرد تھا۔ میں نے سراسیمہ ہو کے پوچھا۔ "اگر اس شخص نے میرے خلاف فیصلہ دے دیا تو پری زاد خانم میرے ساتھ کیسا سلوک کرے گی؟"

"سزائے موت؟" کنول تڑپ کر بولی اور اس نے گھبرا کر پوچھا۔ "کیا تم اور تمہارے کسی ساتھی نے مل کر ایسی کوئی حرکت کی تھی؟"

"تمہارا کیا خیال ہے؟" میں نے انجان بن کر کہا۔ "مجھے مہ جبیں ایک عرصے کے بعد کل ہی ملی تھی۔ اس نے مجھ سے اپنے اغوا کے کسی واقعے کا کوئی تذکرہ تک نہیں کیا' اس کا اغوا کس لیے کیا گیا تھا؟"

"میرا دل کہتا تھا کہ تم ان لوگوں میں سے نہیں ہو۔" کنول نے پریشان ہو کر جواب دیا۔ "تم ایک معصوم اور فرشتہ صفت انسان ہو۔ تم دیوتا ہو' دیوتا۔" کنول نے میرے سوال کا جواب نظرانداز کر دیا تھا۔

"میں پری زاد خانم کی عدالت سے بری ہونے کے بعد آخر کس کا قیدی بن جاؤں گا؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"میرے دل کی دنیا کے قیدی۔" کنول کے رخساروں پر سرخی ابھر آئی۔ "میں تمہیں اپنے دل کے نہاں خانوں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھپا لوں گی۔ میں تم سے شادی کر لوں گی۔"

"لیکن میں تم سے شادی نہیں کر سکتا۔" میں چونک کر اٹھ بیٹھا۔ "آخر تم کس لیے مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہو؟"

کنول نے جھک کر میرے سینے پر اپنا سر رکھ دیا۔ "فرید! مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے۔ اس روز سے جب تمہیں پہلی بار دیکھا تھا۔ اس رات جب میں نے اپنا سب کچھ تمہارے سپرد کر دیا تھا۔"

"محبت!" نفرت سے میرا منہ بن گیا۔ "تم محبت کو جیب سے مشروط کرتی ہو۔ پہلے تم شادی کے لیے بھی اس لیے تیار ہوئی تھیں کہ کوئی غرض پوری کرنا تھی ورنہ تمہاری شہرت اور حسن کے آگے میری حیثیت ہی کیا تھا' اس شہر کے بڑے بڑے رئیس تمہارے پیچھے دیوانے ہو رہے تھے۔ میری ان لوگوں کے درمیان وقعت ہی کیا تھی۔ آج بھی تم ایک تراشیدہ اور نایاب ہیرے کے مانند ہو' اپنی قیمت بھرے بازار میں جا کر طلب کرو۔"

"وہ تو آنٹی کی غرض تھی۔" کنول نے تڑپ کر میرے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ "لیکن میں تم سے واقعی محبت کرنے لگی تھی اور آج بھی اسی جذبے سے محبت کرتی ہوں۔ کاش! تمہیں بتا سکوں کہ میں کیسی آگ میں جل رہی ہوں' میں روز ہی تمہارے خواب دیکھتی رہتی ہوں۔ آج بھی اور اس وقت بھی ایک سندر سپنا دیکھ رہی ہوں جیسے میں نے تمہیں ہمیشہ کے لیے پا لیا ہے۔"

میں نے بے رخی کے انداز میں اس کا نازک سا ہاتھ اپنے ہونٹوں پر سے ہٹا لیا۔ "سنو بے بی!" میرے لہجے میں تمسخر ابھر آیا۔ "ہم دونوں ایک ہی ناؤ کے سوار ہیں۔ تم ہر اس مرد کو اپنی خواب گاہ میں ایک ڈیکوریشن پیس کی طرح سجا لیتی ہو جس کی جیب بھاری ہوتی ہے۔ اسی طرح میں بھی ہر اس لڑکی اور عورت کے پیچھے اندھا دھند بھاگتا ہوں جو حسن و شباب کا نمونہ اور تر و تازہ کلی کی مانند ہوتی ہے۔ ہم دونوں کبھی بھی ایک دوسرے یا کسی سے محبت نہیں کر سکتے۔ محبت ہمارے بس کی بات اس لیے نہیں کہ وہ ایثار' قربانی اور جذبوں کا مجموعہ ہے۔"

"تم کچھ بھی کہہ لو۔" اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ "تم میری زندگی میں پہلے شخص ہو کہ جس کی جیب سے نہیں بلکہ اس کی ذات سے محبت کی ہے۔"

"تم نے یہ محبت بھرا جملہ ہر اس مرد سے کہا ہوگا جو تمہاری زندگی میں داخل ہوا ہوگا۔" میں نے استہزائیہ نظروں سے دیکھا۔ "جب ہی ایک مرد اپنی ساری جیب خالی کر دیتا ہے۔"

"میری محبت کو الزام مت دو فرید!" وہ تڑپ کر بولی۔ "میں نے کبھی بھی تمہارے سوا کسی اور مرد سے اظہار محبت نہیں کیا بلکہ مرد مجھ سے اپنی محبتوں کا اظہار کرتے رہے ہیں۔ یہ تم کیوں بھول رہے ہو کہ میں کنول ہی نہیں ایک عورت بھی ہوں۔ میری پہلی اور آخری محبت صرف تم ہو۔"

میں بے ساختہ زیر لب مسکرا دیا۔ "کنول! ہم دونوں اسٹیج پر کوئی ڈرامہ کھیلنے کے لیے ریہرسل نہیں کر رہے ہیں۔ میں عمر کے اس دور میں نہیں ہوں کہ تمہاری باتوں کے فریب میں آجاؤں۔ یہ تم نے محبت کا سبق کہاں سے پڑھ لیا۔"

"فرید! کنول نے وحشت میں میرا گریبان پکڑ لیا۔ "تمہیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ میری محبت کا مذاق اڑاؤ۔" اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔ "میں جانتی ہوں تم اس لڑکی کے حسن میں گرفتار ہو گئے ہو' وہ لڑکی واقعی بہت حسین ہے۔ اتنی حسین کہ میں نے کبھی ایسے بے مثل حسن کا تصور بھی نہیں کیا لیکن وہ لڑکی تم سے محبت نہیں کر سکتی ہے۔ صرف میں تم سے محبت کرتی ہوں اور مرتے دم تک کرتی رہوں گی۔ کوئی طاقت مجھ سے تمہیں چھین نہیں سکتی ہے۔" وہ یکایک بستر سے نکل کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے جذباتی لہجے میں تپیدہ آواز میں کہا۔ "اگر تم میری محبت کا امتحان لینا چاہتے ہو تو وہ حسرت بھی پوری کر لو۔ میں ایک قدم پیچھے نہیں ہٹوں گی۔ میں اسٹیج' آنٹی اور دولت کو ٹھکرا کے تمہارے پاس آسکتی ہوں۔ میں زندگی بھر کے لیے تمہیں اپنا آنچل بنانا چاہتی ہوں۔"

میں کنول کی محبت کے اس انکشاف پر حیران و ششدر رہ گیا۔ مجھ پر سناٹا طاری ہو گیا۔ میرے سامنے یکسر بدلی ہوئی کنول کھڑی تھی' میرے لیے اس کا یہ روپ نیا اور اچھوتا تھا۔ اس کا لہجہ اور آنکھیں سچائی میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ مجھ پر یہ نئی افتاد آن پڑی تھی کہ اس شوریدہ سر لڑکی کو مجھ سے محبت ہو گئی تھی۔ یہ محبت کیسے اور کیونکر ہو گئی' میری سمجھ سے باہر تھا۔ وہ اس راستے میں اتنی دور جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی کہ وہ میری خاطر اپنی بنائی ہوئی جنت کو اپنے ہی ہاتھوں تباہ و برباد کرنے پر تلی ہوئی تھی۔

وہ مجھے خاموش پا کر میری قریب آئی اور دوزانو ہو کر فرش پر بیٹھ گئی۔ اس نے التجا بھری نگاہوں سے دیکھا۔ "کیا تمہیں اب بھی میری محبت پر کوئی شک ہے؟"

میں سٹپٹا کر رہ گیا کہ اسے کیا جواب دوں۔ دفعتاً" دروازے پر دستک ہوئی۔ کنول نے

دروازے کی جانب گھوم کر پوچھا۔ "کون ہے؟"

"میں ہوں جی!" ایک بھونڈی مردانہ آواز گونجی۔ "خانم بی بی کا ٹیلی فون آیا ہے' وہ آپ سے بات کرنا چاہتی ہیں۔"

"دروازہ کھول دو۔" کنول کا لہجہ تحکم آمیز تیور لیے ہوئے تھا۔

باہر سے کنڈی ہٹا دی گئی' دروازہ کھل گیا۔ میرے سامنے وہی دونوں بدمعاش کھڑے ہوئے تھے جو مجھے اغوا کر کے لائے تھے۔ ایک کے ہاتھ میں کھلا ہوا چاقو تھا' دوسرا نہتا تھا۔ میرا ان دونوں پر قابو پانا یا ان سے لڑبھڑ کر نکل جانا کوئی مشکل نہیں تھا۔ میں اپنی جگہ ہی بیٹھا رہا۔ ایک بدمعاش نے اندر آ کر برتن اٹھائے اور باہر نکل گیا۔ کنول نے باہر نکلتے ہوئے کہا۔ "تم میرے بارے میں اچھی طرح سوچ لو۔"

کنول کے باہر نکلتے ہی باہر سے دروازہ بند کر لیا گیا۔ میں کمرے میں تن تنہا رہ گیا' مجھے کنول سے زیادہ اپنی فکر تھی۔ مجھے یہاں سے اپنی رہائی اور فرار کے لیے سوچنا تھا کیونکہ پری زاد خانم کے عتاب سے میں کسی طرح نہیں بچ سکتا تھا۔ اس کا آدمی مجھے ہر صورت میں پہچان لیتا' میرا جو حشر ہونا تھا' وہ ڈھکا چھپا نہیں تھا۔ میں نے بڑی تیزی سے سوچنا شروع کر دیا۔ ایک خیال کوندا بن کر ذہن کے گوشوں میں لپک گیا تو میں بستر سے نکل آیا۔ کنول کی محبت کا خیال آیا' میرے لیے یہ محبت تائید غیبی تھی۔ میں کنول کی محبت سے فائدہ اٹھا کر فرار کی راہ نکال سکتا تھا۔ میں اپنے ذہن میں ایک منصوبہ ترتیب دے کر اس کی نوک پلک درست کرنے لگا۔

میں کنول کی آمد کا بے چینی سے انتظار کرنے لگا۔ میرے پاس کنول کو بلانے کا کوئی ذریعہ بھی نہیں تھا۔ میں نے دروازے کو کئی مرتبہ پیٹا' کھٹکھٹایا لیکن کوئی بھی اوپر نہیں آیا۔ کوئی ایک گھنٹے بعد کنول ان بدمعاشوں کے ساتھ اوپر آئی۔ وہ میرے لیے چائے بنا کر لائی تھی۔ بدمعاش کنول کو کمرے میں چھوڑ کر باہر سے کنڈی لگا کر چلے گئے۔ میں نے اپنی محبت کے ڈرامے کا آغاز کر دیا۔ محبت کا قرار' عہد و پیماں' مستقبل کے خواب اور مہ جبیں کی ذات سے نفرت کا اظہار کرتے ہوئے میں نے کنول کو اپنی محبت کے فریب میں اس بری طرح جکڑ لیا کہ وہ اسٹیج کی ایک ماہر اداکارہ ہونے کے باوجود میری اداکاری کو نہ سمجھ سکی۔

کنول بہت خوش تھی' جیسے اس نے کوئی معرکہ سر کر لیا ہے۔ میں اس لیے سرشار ہو

رہا تھا کہ میں نے کنول کو پوری طرح اپنے شیشے میں اتار لیا تھا۔ مجھے اپنی زندگی اور رہائی کے لیے بہت کچھ کرنا تھا۔ کنول نے مجھے فریب دے کر پھانسا اور اغوا کروایا تھا اور میں بھی اسی طرح کنول سے بدلہ لینا چاہتا تھا۔ میرے لیے اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔ خون کا بدلہ خون تو فریب کا بدلہ فریب ہی تھا۔

جب شام کے سائے گہرے ہونے لگے تو یوں لگا جیسے دروازے پر دستک سی ہوئی' میں کسی قدر تھکن سی محسوس کرکے آرام دہ کرسی پر بیٹھ گیا تو غنودگی طاری ہوگئی۔ ایک دستک پر میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ میں نے کسی وجہ سے اندر سے دروازہ بند کر لیا تھا لیکن مجبوراً دروازہ کھولنا پڑا۔ باہر وہی دونوں بدمعاش چاقو اور خنجر سے مسلح کھڑے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک نے بے رحمی سے کہا۔ "نیچے چلو' خانم بی بی تمہارا انتظار کر رہی ہیں۔"

جب میں ان دونوں کی معیت میں نیچے آیا تو وہاں جیسے عدالت لگی ہوئی تھی۔ پری زاد خانم اور آنٹی ایک بڑے صوفے پر دھنسی ہوئی تھیں۔ کنول ان کے عقب میں ایک کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ پری زاد خانم مجھے دیکھتے ہی چونکی۔ جب میں اس کے سامنے جا کھڑا ہوا تو وہ دونوں بدمعاش میری پشت پر چوکنا کھڑے ہو گئے۔ پری زاد خانم نے مجھے نیچے سے اوپر تک دیکھا۔ اس کے لبوں پر زہر آمیز مسکراہٹ ابھر آئی۔ اس نے سفاک لہجے میں پوچھا۔ "گویا تم ہو مہ جبیں کے عاشق بہادر۔"

"تھا لیکن اب نہیں ہوں۔" میں نے زیرلب مسکرا کے کنول کی جانب دیکھا۔ کنول بھی جواباً مسکرا دی۔ میں نے سنجیدہ ہو کر پوچھا۔ "آخر مجھے کس جرم کی پاداش میں یہاں لایا گیا ہے؟"

"شاید تمہیں کنول نے بتا دیا ہوگا!" پری زاد خانم نے کنول کی جانب دیکھا تو اس نے اثباتی انداز میں سرہلایا۔ "اب اس کی تصدیق رہ گئی ہے۔ اگر تم بے گناہ نکلے تو میں تمہیں اسی وقت رہا کر دوں گی۔" پری زاد خانم نے میرے پیچھے کھڑے ایک شخص کو اشارہ کیا۔ "تم جا کر شرفو کو بلا لاؤ۔"

ایک بدمعاش بڑی تیزی سے باہر نکل گیا۔ دفعتاً ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ پری زاد خانم جیسے اس ٹیلی فون کی منتظر ہی تھی۔ جب ہی وہ اپنی جگہ سے بجلی کی تیزی سے اٹھی اور

ٹیلی فون کی جانب بڑھی۔ وہ ٹیلی فون پر کسی سے باتیں کرتے ہوئے ہنس رہی تھی لیکن اچانک اس کی ہنسی کافور ہوگئی اور چہرہ زرد پڑ گیا۔ چند لمحوں تک اس پر سکتے کی سی کیفیت طاری رہی۔ جب وہ بولی تو اس کی آواز مرتعش ہو رہی تھی۔ "میں اپنے دونوں آدمیوں کو بھیج رہی ہوں۔ ان دونوں کے پہنچتے ہی لانچ لے کر دوبئی چلے جاؤ۔ کوئی تاخیر نہ کرنا ورنہ مصیبت گلے پڑ جائے گی۔"

پری زاد خانم صوفے پر آکر کسی ٹوٹی شاخ کی طرح گر کر بے ترتیبی سے بیٹھ گئی' اس کے حواس منتشر تھے اور چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔ سانسیں الجھ رہی تھیں۔ اس کی یہ کیفیت دیکھ کر آنٹی نے پوچھا۔ "کیا ہوا خانم! تم اتنی پریشان کیوں ہو رہی ہو؟"

پری زاد خانم نے میرے سامنے جواب دینے سے شاید گریز کیا کیونکہ اس نے میری جانب پرشکوک نظروں سے دیکھا تھا۔ اس نے سانسوں کے زیرو بم پر قابو پاتے ہوئے آنٹی کے پاس اپنا منہ لے جا کر سرگوشی کی۔ "میں نے اپنی ساری پونجی داؤ پر لگا دی ہے۔ میں ہیروئن کی سب سے بڑی کھیپ لانچ سے باہر بھیج رہی ہوں۔ ایک نیا افسر تنگ کر رہا ہے۔ اسے رشوت میں وہ ماڈل گرل دردانہ ہے نا' اسے پیش کرنا ہے۔ دردانہ پندرہ ہزار روپے مانگ رہی ہے اور وہ کہیں انگیج ہے۔ وہ کسی اور ماڈل گرل کے لیے تیار نہیں ہو رہا ہے اور اس نے لانچ پر چھاپہ مارنے کی دھمکی دے دی ہے۔ میرے آدمی کا کہنا ہے کہ وہ کوئی جعلی افسر ہے۔ بہت بڑا جعلساز ہے۔ اس وقت ہر کس و ناکس سے خطرہ اور دھڑکا لگا رہتا ہے۔ بہرحال اسے جھانسا دے کر لانچ میں لے جا رہے ہیں۔ وہ اصلی ہو یا نقلی' اسے مچھلیوں کی نذر کرنا ہے۔"

میرے دماغ میں سنسناہٹ کی جو لہر اٹھی تھی' وہ میری ریڑھ کی ہڈی کو چھو گئی۔ اس کی سفاکی کے انداز نے مجھے لرزا دیا۔ مجھے اس کی بے رحمی کا اندازہ نہیں تھا لیکن میں اس کی کمینی فطرت سے واقف ہوتا جا رہا تھا۔ پری زاد نے میرے عقب میں کھڑے ہوئے بدمعاش کو اشارے سے اپنے پاس بلایا۔ "شرفو کے یہاں آتے ہی تم چودھری کو ساتھ لے کر کیماڑی پہنچ جاؤ' بڑی احتیاط سے کام لینا۔ جہاں ضرورت پڑے وہاں پیسہ پانی کی طرح بہا دو۔ اس کی کامیابی تمہاری اپنی کامیابی ہے' میں تم سب کو دولت میں تول دوں گی۔"

اس بدمعاش کا سپاٹ چہرہ آنے والے شیریں لمحات کے تصور سے دمک اٹھا۔ اس نے

بڑی فرمانبرداری سے اثبات میں اپنا سر ہلایا اور دوبارہ میری پشت پر آ کے کھڑا ہو گیا۔ یکلخت حالات بڑی تیزی سے بدلنے لگے تھے۔ مجھے چاروں طرف سے امید کی کرنیں پھوٹتی دکھائی دے رہی تھیں۔ ایک بدمعاش کی موجودگی سے میری ذات کو کوئی خطرہ نہیں تھا۔ باآسانی نہ سہی لیکن کسی نہ کسی طرح اس پر قابو پایا جا سکتا تھا۔ میں نے کنول کی محبت اور ہمدردی سے فائدہ اٹھانے کے لیے ایک نفسیاتی حربہ بھی سوچ رکھا تھا۔ اب دوسرے ایکٹ کا انتظار تھا۔

حقیقی زندگی کے اسٹیج کا پردہ اٹھا۔ شرفو اندر داخل ہوا۔ اسے دیکھ کر میرے منہ سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ یہی کیفیت آنٹی اور کنول کی تھیں۔ یہ وہی شخص تھا جس پر میں نے کھولتا ہوا پانی ڈال دیا تھا۔ اس کی دائیں آنکھ پر پٹی بندھی ہوئی تھی' اس کا نصف سے زائد چہرہ اس بری طرح جھلسا ہوا تھا کہ اس کی صورت انتہائی مکروہ دکھائی دے رہی تھی' شاید شیطان کا چہرہ بھی اس قدر بھیانک نہیں ہوگا۔ جیسے جیسے میری نگاہ اس پر پڑتی' میرے بدن میں جھرجھری سی آجاتی اور میں انجانے خوف سے لرزنے لگتا۔ اس کے پیچھے چودھری نام کا وہی بدمعاش داخل ہوا تھا۔ وہ اپنے ہاتھ میں ایک ہنٹر لیے ہوئے تھا۔ اس نے وہ ہنٹر پری زاد خانم کے حوالے کر دیا۔ پری زاد خانم نے ہنٹر لے کر اس سے کہا۔ "تم دیپو کے ساتھ اسی وقت کیماڑی چلے جاؤ' میں نے اسے پروگرام بتا دیا ہے۔"

چودھری اور دیپو نے ایک لمحے کی تاخیر بھی نہیں کی۔ وہ دونوں باہر نکل گئے۔ معاً میری نگاہ کنول پر پڑی' اس کا چہرہ متغیر تھا اور وہ پھٹی پھٹی نظروں سے کبھی شرفو اور کبھی میری جانب دیکھ لیتی تھی۔ آنٹی کے چہرے پر کراہت ابھر آئی تھی۔ پری زاد خانم نے شرفو کو اپنے پاس بلا کر اس کی توجہ میری جانب مبذول کروائی۔ "کل یہی شخص مہ جبیں کے ساتھ دیکھا گیا تھا۔ یہ اس لڑکی کے عاشقوں میں سے ہے۔ میرا دل کہتا ہے کہ یہ وہی شخص ہے جو تمہاری اور میری بربادی کا باعث بنا ہے اور اپنی محبوبہ کو بھی لے اڑا تھا۔"

"اچھا!" شرفو مجھے ایک آنکھ سے دیکھتے ہوئے غرایا۔ "اس روز دو کتوں نے مل کر مجھ پر حملہ کیا تھا۔ اگر ایک ایک میرے مقابلے میں آتا تو آج ان کا کفن بھی میلا ہو چکا ہوتا اور لاشیں گل سڑ کے پہچانی نہیں جاتیں۔ کیا دوسرا آدمی نہیں ملا؟"

"اگر یہ وہی شخص ہے تو اس کا وہ ساتھی بھی مل جائے گا۔" پری زاد خانم سنگدلی سے

ہنسنے لگی۔ "پھر تم ان دونوں کا قورمہ بنا لینا۔"

شرفو کسی خونخوار کتے کی مانند غراتا ہوا میری جانب بڑھا۔ میری حالت اندر سے غیر ہونے لگی تھی۔ دل تھا کہ سینے سے پھڑپھڑاتا ہوا باہر نکلنا چاہتا تھا۔ میرا چہرہ پسینے میں تر ہونے لگا اور جسم پر بوندیں ابھر آئی تھیں۔ میں چند ثانیوں میں پسینے میں نہا گیا تھا۔ میرے لیے فرار کی راہ نہیں رہی تھی' تاہم میں نے اپنے دل کو بڑا مضبوط کیا۔ میں تیزی سے سوچنے لگا کہ شرفو کے پہچانتے ہی جو بھی اس کا ردعمل ہو' اس کے مقابلے پر سینہ سپر ہونا ہے ورنہ خبیث مجھے زندہ نگل لے گا۔ میں دوسری طرف اس پر حملے کے لیے تیار تھا' اس لیے کہ وہ نہتا تھا۔ جب اس نے میرے قریب پہنچ کر ایک آنکھ سے مجھے سرتاپا دیکھا اور میرے چہرے پر اسے گاڑ دیا تو میں اپنے جسم کا ارتعاش چھپا نہیں سکا۔ اس بھیانک اور مکروہ شکل کو اپنی نظروں سے اس قدر قریب پا کر میرے دل کو ہول آنے لگا۔ یکایک اس کے بدنما چہرے پر مسکراہٹ ابھری جو اس کے چہرے سے کہیں زیادہ خوفناک تھی۔ اس نے پری زاد خانم کی جانب پلٹ کر نفی میں اپنا سر ہلایا۔ "یہ نہیں ہے بی! یہ تو بڑا سیدھا اور خوبصورت لونڈا ہے۔"

میری جان میں جان آئی۔ میں نے ایک گہرا سانس لیا اور کنول کی جانب دیکھا' اس کا حسین چہرہ بھی دمک اٹھا تھا۔ اس کی بڑی بڑی حسین آنکھوں میں ہزاروں بلب روشن ہونے لگے۔ آنٹی خوش تو نہیں ہوئیں البتہ ان کے چہرے پر دمک ضرور ابھری۔ آنٹی کا چہرہ بتا رہا تھا کہ اسے میری جان بخشی سے کوئی خوشی نہیں ہوئی۔ شاید کنول نے اپنی محبت کے بارے میں انہیں کچھ نہیں بتایا تھا ورنہ وہ ضرور کھل اٹھتی۔

شرفو پلٹ کر پری زاد خانم کی جانب بڑھا۔ اس نے تین چار قدموں کا فاصلہ طے کیا تھا کہ وہ یکایک بجلی کی سی تیزی اور پھرتی کے ساتھ میری جانب پلٹا' اس کے ہاتھ میں کھٹاک سے ایک چاقو کھل گیا۔ وہ چاقو لے کر میری جانب جارحانہ انداز سے بڑھا تو میں گھبرا کے ایک دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ چاقو سے کہیں زیادہ خوفناک اس کا چہرہ تھا۔ یکایک پری زاد خانم پوری قوت سے چیخ پڑی۔ "شرفو...... کیا کر رہے ہو؟ رک جاؤ۔ میری بات تو سنو۔"

شرفو' پری زاد خانم کی آواز سن کر رک گیا۔ اگر پری زاد خانم چیختی نہیں تو شرفو میرا کام تمام کر دیتا۔ اس نے پلٹ کر پری زاد خانم کی جانب دیکھا۔ "خانم بی بی! میں نے اس

ذلیل آدمی کو پہچان لیا ہے۔ یہ وہی شخص ہے جس نے میرے سر پر کھولتا ہوا پانی ڈالا تھا۔ میں اس کی اور اس کے ساتھی کی صورت زندگی بھر نہیں بھول سکتا۔ میں اپنا بدلہ ضرور لوں گا۔ آج اسے چھوڑوں گا نہیں۔"

"یہ جھوٹ ہے۔" میں نے چیخ کر کہنا چاہا تو میری آواز حلق میں پھنس گئی۔ "مجھ پر سراسر بہتان ہے۔" میں پری زاد خانم سے مخاطب تھا۔ "کیا آپ کے آدمی کو غلط فہمی نہیں ہوئی ہے؟"

"کس چیز کی غلط فہمی؟" شرفو طیش میں آکر دہاڑا۔ "میں کسی کا چہرہ کبھی نہیں بھولتا ہوں' چاہے وہ دوست ہو یا دشمن۔"

پری زاد خانم نے اپنا ہنٹر کھول کر لہرایا اور وہ میری طرف غیظ و غضب کے عالم میں بڑھی تو کنول بھی کسی ارادے سے اٹھ کھڑی ہوئی' کنول کا چہرہ فق تھا۔ میں نے پری زاد خانم کی جانب ہاتھ اٹھا کر التجا سی کی۔ "پلیز! آپ پہلے میری بات سن لیں' مجھے صفائی کا موقع دیں۔ اگر آپ میری بات سے مطمئن نہ ہوئیں تو پھر آپ کو سزا دینے کا پورا پورا حق حاصل ہے۔"

"کس بات کی صفائی۔" شرفو وحشی درندے کی مانند بپھر گیا۔ "کیا یہ کوئی عدالت لگی ہوئی ہے؟ نہیں! یہ عدالت نہیں ہے۔ تم میرے مجرم ہو' میں تمہیں سزا دوں گا۔"

پری زاد خانم بڑی سرعت سے شرفو کے پاس پہنچ کر رکی اور اسے ایک طرف ہٹاتی ہوئی اسے سمجھانے لگی۔ "شرفو اتنی جلد بازی بھی اچھی نہیں ہوتی' اسے اپنی صفائی پیش کرنے کا موقع دینا چاہیے' یہ اس کا حق ہے۔" پری زاد خانم توقف کر کے مسکرائی۔ "یہ شخص صرف تمہارا دشمن ہی نہیں بلکہ میرا بھی مجرم ہے۔ مجھے بھی تو اس کی کھال ادھیڑ کے اس میں بھس بھروانا ہے۔" پری زاد خانم نے غصے میں اپنا ہنٹر فضا میں لہرا کے فرش پر پوری قوت سے دے مارا' فضا میں دل دہلا دینے والی شڑپ کی آواز گونج اٹھی۔

میرے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میرا جسم جیسے تھرانے لگا۔ میں نے بہ وقت تمام اپنی دگرگوں حالت کو سنبھالا اور اپنی آواز کی تھرتھراہٹ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "مجھے فی الحقیقت آج تک مہ جبیں کے اغوا کا پس منظر معلوم نہیں تھا۔ مہ جبیں نے بھی مجھے اپنے اغوا اور بازیابی کی کہانی نہیں سنائی ہے۔ مجھے سارا قصہ یہاں آکر کنول کی زبانی معلوم ہوا

ہے۔" میں نے بہ وقت اپنے حواس پر قابو پایا۔ "میرے فرشتوں کو خبر نہیں تھی کہ مہ جبیں کس نے کس لیے اغوا کیا ہے؟ اگر یہ واقعہ اسی روز کسی دوسرے شخص کے علم میں آیا اور اسی دن نہ صرف مہ جبیں کو چھڑا لیا گیا بلکہ آپ کے بارے میں پولیس کو اطلاع دے دی گئی تھی تو اس میں میرا نہیں بلکہ آپ کے اس آدمی کا قصور ہے جو آپ کے کسی دشمن سے ملا ہوا تھا اور ہے' اسی لیے آپ کے دشمن نے آپ کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر آپ پر بھرپور ضرب لگائی ہے۔" میں نے ٹھہر کر ایک گہرا سانس لیا۔ "کیا آپ مجھ جیسے ایک معزز شہری سے اس دیدہ دلیری اور درندگی کی توقع کر سکتی ہیں جو ایک مرغی بھی ذبح نہیں کر سکتا ہے؟"

میرا تیر عین نشانے پر جا لگا تھا۔ پری زاد خانم جو میری باتیں بڑے انہماک سے سن رہی تھی' اس پر اسے یقین آگیا تھا۔ وہ کسی خیال کے زیر اثر چونکی اور متفکر سی ہوگئی۔

اس کے بشرے پر ابھری ہوئی سوچ کی پرچھائیاں بتا رہی تھیں کہ وہ اپنے کسی دشمن کے بارے میں سوچ رہی ہے لیکن شرفو کو میری کسی بات کا یقین نہیں آیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں غیر یقینی جھلک رہی تھی۔ یکبارگی اس کا چہرہ تمتما اٹھا' وہ غصے سے بھڑک کے بولا۔ "خانم بی بی! آپ اس کتے کی باتوں میں نہ آئیں' یہ شخص صاف جھوٹ بول رہا ہے۔"

میں شرفو کی بات پر پری زاد خانم کو سوچنے کی مہلت دینا نہیں چاہتا تھا' میں نے فوراً ہی نفسیاتی حربہ استعمال کیا۔ "اگر آپ کسی بے گناہ شخص کو محض اس لیے سزا دینا چاہتی ہیں کہ اس کا تعلق مہ جبیں سے ہے تو میں آپ کی ہر سزا بھگتنے کے لیے تیار ہوں۔"

پری زاد خانم میرے ایثار کے جذبے پر چونکی اور تیز نظروں سے گھورنے لگی۔" تمہاری باتیں میری سمجھ میں آرہی ہیں لیکن شرفو مطمئن نہیں ہو رہا ہے۔ میں اس شخص کو دس سال کے عرصے سے جانتی ہوں۔ یہ شخص جھوٹ نہیں بول سکتا اور نہ ہی اس کی آنکھیں کبھی دھوکا کھا سکتی ہیں۔"

"کیا اس دنیا میں ایسا ایک شخص بھی نہیں ہوگا جس کی شکل مجھ سے ملتی جلتی ہوگی۔" میں نے اب بھی حوصلہ نہیں ہارا تھا۔ "آپ لوگ میرے ساتھ جو سلوک کرنا چاہیں کر لیں' دل کی بھڑاس نکال لیں لیکن آپ کا وہ دشمن جو آپ کو نیچا دکھا گیا ہے' کل اس بے

انصافی پر آپ کو طعنہ دے گا۔ آپ کی بزدلی کا تذکرہ کرتا پھرے گا۔"

"تم نے مجھے عجیب مخمصے میں ڈال دیا ہے۔" وہ پریشان اور متذبذب ہو گئی۔ "مجھے کچھ سجھائی نہیں دے رہا ہے کہ تمہارے بارے میں کیا فیصلہ کروں؟"

"یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔" شرفو نے کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے درندگی سے کہا۔ "میں اس سے ایسا انتقام لوں گا کہ یہ زندہ رہے گا تو زندگی بھر یاد کرتا رہے گا۔ اس نے مجھ پر کھولتا پانی ڈالا تھا' میں اس پر کڑکڑاتا ہوا تیل ڈال دوں گا۔"

میں لرز اٹھا۔ میرے رگ و پے میں برف جمنے لگی۔ میرے جسم میں جان ہی نہیں رہی تھی۔ میں پاس والی کرسی کا سہارا نہیں لیتا تو شاید گر پڑتا۔ جب ہی پری زاد خانم نے اپنا ایک ہاتھ فضا میں لہرا کے باہر جاتے ہوئے شرفو کو روکا۔ "شرفو! ایک منٹ کے لیے رکو۔" پری زاد خانم ذہن پر زور دے کر سوچنے لگی اور بے ساختہ مسکرائی۔ "شرفو!" اس کے لہجے میں شگفتگی الڈ آئی تھی۔ "تم ایسا کرو۔ ابھی اور اسی وقت جاؤ' کہیں سے کسی قیمت پر آدمیوں کا بندوبست کر لو' مہ جبیں کو یہاں اٹھا لاؤ۔ مہ جبیں بڑی آسانی سے یہ معمہ حل کر دے گی۔ اصلی چہرہ سامنے آجائے گا۔"

"مہ جبیں!" میں تحیر زدہ ہو گیا۔ "آخر آپ اس لڑکی کے پیچھے ہاتھ دھو کر کیوں پڑی ہوئی ہیں۔ ایک معصوم اور سیدھی سادی لڑکی نے آپ کا کیا بگاڑا ہے؟"

"وہ معصوم ہے!" پری زاد خانم کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ "جو کچھ بھی ہوا ہے' اس کمینی کی وجہ سے ہوا ہے۔ آخر میرے دشمن کو اس سے ایسی کیا ہمدردی تھی کہ اسے یہاں سے نہ صرف نجات دلا دی بلکہ میرے کاروبار کا ستیاناس کر کے رکھ دیا' میں اس سے معلوم یہ کروں گی کہ میرا دشمن کون ہے۔ میں اپنے اس دشمن سے نمٹ لوں گی اور مہ جبیں سے اپنے نقصان کی مکمل قیمت بھی وصول کر لوں گی۔"

"وہ غریب آپ کا نقصان کیونکر ادا کر سکتی ہے؟" میری آواز میرا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

"وہ غریب ہے۔" پری زاد خانم کاروباری انداز میں بولی تو اس کے لہجے میں زہر بھرا ہوا تھا۔ "وہ غریب نہیں بلکہ سونے کی چڑیا ہے۔ وہ غریبوں کو ایک رات میں امیر بنا سکتی ہے' مجھے اس نایاب اور تراشیدہ ہیرے کی قدر و قیمت معلوم ہے۔ جب میں اس کا جبن

الاقوامی نیلام کروں گی تو میرے قدموں میں ریالوں کا ڈھیر ہو گا۔"

"یہ سراسر زیادتی اور ظلم ہے۔" میں چیخا۔

آنٹی جو اپنی جگہ بیٹھی یہ سارا تماشہ دیکھ رہی تھیں' وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر پری زاد خانم کے پاس آئیں۔ مجھے غضبناک آنکھوں سے دیکھا اور پری زاد خانم کے شانے پر ہاتھ رکھ کے کہنے لگیں۔ "تم نے جو فیصلہ کیا ہے' اس سے میرے سینے میں بڑی ٹھنڈک پڑ گئی ہے۔ اس کتیا کی بچی نے ایک روز میرا حق چھینا تھا۔ کنول سے فرید کی شادی کی بات چیت طے ہو گئی۔ اچانک جانے یہ کہاں سے بیچ میں ٹپک پڑی' سارا معاملہ چوپٹ ہو گیا۔"

میں تپ کر رہ گیا۔ میرے جی میں تو آیا تھا کہ آنٹی کے منہ پر ایک بھرپور تھپڑ رسید کر دوں لیکن پری زاد خانم کے ہاتھ میں ہنٹر اور قریب کھڑے شرفو کے ہاتھ میں کھلا چاقو دیکھ کر ہمت نہیں ہوئی۔ اگر میں کسی ارادے سے بھی اپنی جگہ سے ہلتا تو شرفو مجھ پر حملہ کرنے سے چوکتا نہیں' دوسری جانب کنول کی ناراضگی مول لینے کا خطرہ تھا جسے میں نے بڑی مشکل سے اپنے شیشے میں اتارا ہوا تھا۔ وہ میرے لیے ترپ کا ایک ایسا پتا تھا جو کسی آڑے وقت میں ہاری ہوئی بازی جتانے کے کام آسکتا تھا۔ وہ مجھے مہ جبیں کی حمایت میں بولتا پا کر مشتعل سی ہو رہی تھی۔ مجھے جلد ہی حالات کی نزاکت کا احساس ہوا' صبر و ضبط اور خاموشی میرے حق میں مفید ثابت ہو سکتی تھی کیونکہ شرفو' مہ جبیں کو اغوا کر کے لانے کے لیے باہر جا رہا تھا۔ اتنے بڑے بنگلے میں کسی اور مرد کی موجودگی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ صرف تین عورتیں رہ جاتی تھیں۔ میں کنول کو اپنی محبت کا شکار بنا کر یہاں سے بہ آسانی فرار ہو سکتا تھا۔ جب ہی میں نے پینترا بدلا "خانم صاحبہ۔" میری آواز سینے میں دم توڑ رہی تھی۔ "آپ مہ جبیں کے ساتھ جو سلوک چاہیں کریں' مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ اب مجھے اس کی ذات سے اس لیے بھی دلچسپی نہیں رہی کہ اس کی شادی کسی اور شخص سے ہو رہی ہے۔"

میری نگاہ آپ ہی آپ کنول کی جانب اٹھ گئی' میری بات سن کر اس کا چہرہ گلاب کی طرح کھل اٹھا تھا۔ اس نے اپنی پلکیں جھپکا کر مجھے آنکھوں کے اشارے سے تسلی دی۔

پری زاد خانم نے مجھ پر ایک معنی خیز نگاہ ڈالی اور کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ "کیا تم نے مجھے نری گاؤدی سمجھ رکھا ہے جو میں تمہاری باتوں میں آجاؤں گی؟"

"میں آپ کو بے وقوف تو نہیں بنا رہا ہوں۔" میں انجان بن گیا۔

"مسٹر! میں نے کوئی کچی گولیاں نہیں کھیلی ہیں۔" اسے یکبارگی غصہ آگیا۔ "میں تمہیں ادھر رہا کر دوں اور تم ادھر فوراً پولیس اسٹیشن پہنچ کر ہمارے خلاف رپورٹ درج کرا دو...... کیوں تم نے یہی منصوبہ بنایا ہے نا؟"

"جی نہیں!" میں نے سادگی سے جواب دیا۔ "میں کسی کے معاملات میں ٹانگ پھنسانا نہیں چاہتا ہوں۔"

"تم پھر جھوٹ بول رہے ہو۔" وہ تنک کر بولی۔ "کہاں تو تم مہ جبیں کی حمایت میں اپنا گلا پھاڑ رہے تھے اور اب ایک منٹ بھی نہیں گزرا کہ فوراً ہی اس کے خلاف ہو گئے ہو۔ کیا میں ایسی شاطرانہ چالوں کو نہیں سمجھتی ہوں۔"

میں نے واقعی سنگین غلطی کی تھی جو فوراً ہی پکڑی گئی تھی۔ میں اپنی اس حماقت پر جزبز ہو کر خاموش ہو گیا۔ شرفو نے تیزی سے جھپٹ کر میرا گریبان پکڑ کر میرے دھڑکتے ہوئے سینے پر چاقو کی نوک رکھ دی۔ "تم سیدھے سیدھے ساری بات اگل دو' نہیں تو حلق سے ناف تک چیر کے رکھ دوں گا۔ تم مجھے نہیں جانتے' میں سینکڑوں کا خون پی چکا ہوں۔"

"شرفو!" پری زاد خانم مجھے ہونق دیکھ کر چیخی۔ میں نے شرفو کے چہرے پر درندگی کو ابھرتے ہوئے دیکھا تو یوں محسوس ہوا کہ موت میری نظروں کے سامنے آکھڑی ہوئی ہے۔ یکایک میرا جسم کانپنے لگا تھا۔ میں بڑی بے بسی کے عالم میں رحم طلب نگاہ سے پری زاد خانم کی جانب دیکھنے لگا' وہ بڑی عجلت سے شرفو کے سر پر پہنچ گئی۔ "تمہاری عقل تو نہیں ماری گئی ہے۔" پری زاد خانم نے اپنا ہاتھ بڑھا کر میرے گریبان پر سے شرفو کا ہاتھ کھینچ لیا۔ تب میری جان میں جان آئی۔ میں پاس والی کرسی پر ڈھیر ہو گیا اور اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ میں اپنے آپ کو ضرورت سے زیادہ ڈرپوک' بزدل اور کمزور ثابت کرنا چاہتا تھا تاکہ وہ مجھ سے غافل ہو جائیں اور میں وقت آنے پر ان کی خوش فہمی سے فائدہ اٹھا سکوں۔

میری اداکاری اپنے عروج پر جا رہی تھی۔ پری زاد میری حالت دیکھ کر گھبرا سی گئی تھی۔ اس نے چیخ کر کنول سے کہا۔ "جلدی سے ایک گلاس پانی لے آؤ۔" میں اسی طرح اپنا سر جھکائے اور ہاتھوں سے سر تھامے بیٹھا رہا۔ کنول جانے کہاں سے ایک گلاس لے

آئی۔ اسے میں نے ایک ہی سانس میں خالی کر کے کنول کی طرف بڑھا دیا۔ کنول کا چہرہ متوحش سا تھا۔

جب میں نے اپنے آپ کو قدرے پرسکون ظاہر کرنے کے لیے گہرا سانس لیا تو پری زاد خانم میرے روبرو آ کے کھڑی ہو گئی۔ "سنو مسٹر!" وہ نخوت سے بولی۔ "تمہارا بھرم کھل چکا ہے۔ تمہیں اب زیادہ چالاک اور ہوشیار بننے کی ضرورت نہیں' شرفو نے تمہیں پہچان لیا ہے۔ میں اس کی بات جھٹلا نہیں سکتی ہوں۔ وہ شخص تم ہی ہو جس نے مجھے تباہ کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی' لہٰذا میں بھی تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔ میں تم سے ایک ایسا بھیانک انتقام لوں گی کہ جس کا خمیازہ مرتے دم تک بھگتتے رہو گے۔ جو لڑکی بھی تمہاری زندگی میں قدم رکھے گی' وہ بھی اس عذاب کا شکار ہو جائے گی۔"

اس کی کچھ باتیں سمجھ میں آئیں' کچھ نہیں آئیں۔ مجھ پر سکتہ سا چھا گیا۔ میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی شکل دیکھنے لگا تو وہ سفاکی سے بولی۔ "میں تم سے ایک انوکھا انتقام لینے والی ہوں۔" اس کے لبوں پر زہر آمیز مسکراہٹ ابھر آئی۔

میں نے شکستہ دل سے کہا۔ "آپ کے دل میں جو بھی حسرت ہے' اسے پوری کر لیں۔ میں کسی سزا سے ڈرتا نہیں ہوں۔"

یکایک پری زاد خانم ہنس پڑی۔ "میں تمہیں نہ تو قتل کروں گی اور نہ ہی کوئی اذیت دوں گی بلکہ......" وہ جملہ ناتمام چھوڑ کر تیکھی تیکھی نظروں سے میری آنکھوں میں جھانکنے لگی۔ "میں تم سے شادی کروں گی۔"

"شادی!" میں تحیر زدہ رہ گیا۔

پری زاد خانم کے اس غیر متوقع اور ناقابل یقین اعلان سے نہ صرف میں بھونچکا ہو کر رہ گیا تھا بلکہ سبھی چونک پڑے تھے۔ کنول کے حسین چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ آنٹی کو بھی ناگوار گزرا تھا۔ صرف ایک شرفو تھا جس کے ہونٹوں پر اس کے چہرے سے کہیں زیادہ مکروہ مسکراہٹ ابھر آئی تھی۔ میں اس انتقام کی تہ تک پہنچ گیا میں۔ میں اسے ایسی دہشت زدہ نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے وہ کوئی خارش زدہ کتیا ہے اور میرے وجود پر کچوکے لگاتی جا رہی ہے اور اپنے نوکیلے پنجوں سے مجھے نوچ کھسوٹ رہی ہے۔

"آپ مجھ سے شادی کریں گی؟" میں نے سٹپٹائی آواز میں پوچھا۔

"ہاں!" پری زاد خانم نے اثباتی انداز میں سر ہلایا۔ "تم میرے آئیڈیل ہو' میں جانے کب سے تم جیسے شہزادے کا خواب دیکھتی آرہی ہوں' آج محض ایک انسان نے میری دلی حسرت پوری کر دی۔ میں مذاق نہیں کر رہی ہوں۔" وہ سنجیدہ ہو گئی۔ "فرید! آج سے تم میری ملکیت ہو۔ تمہیں دنیا کی کوئی طاقت مجھ سے چھین نہیں سکتی ہے۔"

میں نے کنول کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا' وہ سفید پڑ گئی تھی۔ اس کے بدن میں ارتعاش ابھر رہا تھا۔ جیسے وہ اندر ہی اندر غصے سے کانپ رہی ہے' اس کی حسین آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ میں نے چیخ کر کہنا چاہا تو میری آواز حلق میں پھنس گئی تھی۔ "میں آپ سے شادی نہیں کروں گا۔"

"کیوں؟" پری زاد خانم نے تمسخر سے پوچھا۔

"میں تم جیسی ذلیل اور اوباش عورت سے شادی کرنے سے مرنا زیادہ پسند کروں گا۔"

شرفو اپنی مالکہ کی شان میں گستاخی برداشت نہیں کر سکا تھا۔ وہ میری جانب اپنا چاقو لہراتا ہوا بڑھا تو پری زاد خانم تیزی سے ہم دونوں کے درمیان آگئی۔ وہ شرفو کو پکارنے لگی۔ "تم پھر غصے میں آگئے؟"

"میں اس ذلیل شخص کی زبان کاٹ لوں گا۔" شرفو پھنکارنے لگا۔ "یہ اپنی حد سے مسلسل بڑھتا جا رہا ہے۔"

"شرفو!" پری زاد خانم نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ "دشمن کو ایک ہی وار میں موت کی نیند سلا دینے سے خاک لطف آئے گا۔ اسے تو سسکا سسکا کر مارنا ہے۔ آخر تم یہ سب کچھ کیوں بھول جاتے ہو۔"

"میں انتقام کے جوش میں اندھا ہو رہا ہوں۔ میرے سینے میں جو آگ بھڑک رہی ہے' اسے کس طرح بجھاؤں؟"

"تم اپنا انتقام کسی اور دن بھی لے سکتے ہو۔" پری زاد خانم نے شرفو کا شانہ تھپتھپایا۔ "میں کل ہی اپنے شہزادے سے شادی رچا لوں گی۔ ری کی تقریب بڑے اہتمام اور روایتی طریقے سے منائی جائے گی۔ کل شام ایک قاضی کا بندوبست کر لینا اور فوٹوگرافر کو بھی لیتے آنا لیکن ان دونوں سے پہلے یہاں مہ جبیں کا ہونا اشد ضروری ہے۔" اس نے توقف کر کے مجھے چبھتی ہوئی نگاہ سے دیکھا۔ "مہ جبیں کے خوبصورت ہاتھ مجھے سنواریں گے اور دلہن

بنائیں گے۔ ڈھولک پر گیت گانے کے لیے کنول موجود ہے اور ہم سب اس کا خوبصورت رقص بھی دیکھیں گے۔ کیوں کنول؟" پری زاد خانم نے پلٹ کر کنول کی جانب دیکھا۔ کنول غائب تھی۔ وہ کنول کو غائب پا کر چونکی۔ اس نے آنٹی سے شکایتی لہجے میں کہا۔ "نذیرن! کنول ہمارے فیصلے سے ناراض لگتی ہے!"

آنٹی' پری زاد خانم کی بات سن کر چونکیں' پل بھر کے لیے ان کا چہرہ متغیر ہو گیا لیکن جلد ہی وہ اپنے آپ کو سنبھال کر بولیں۔ "اس میں ناراضگی کی کیا بات ہے؟ یہ شخص تمہارا مجرم ہے' اسے جس قدر کڑی سزا دینا ہے' دے لو۔ مجھے یا کنول کو کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔"

پری زاد خانم نے شرفو سے کہا۔ "تم دولہا میاں کو اوپر کے کمرے میں لے جا کر بند کر دو۔ ہمارے لیے پینے پلانے اور کھانے کا بندوبست کر کے تم مہ جبیں کے مشن پر روانہ ہو جاؤ۔ آج میں اور نذیرن جی بھر کے پینا چاہتے ہیں۔"

"شرفو!" جب شرفو مجھے لے کر چلنے لگا تو اس نے آواز دے کر روکا۔ "اپنی آنکھیں کھلی رکھنا اور محتاط ہو کر لے جانا۔ اس شخص نے دو آدمیوں کا حشر برا کیا ہے۔"

پری زاد خانم کو اس ہدایت کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ شرفو پہلے ہی چوکنا اور محتاط تھا۔ اس نے مجھے کمرے میں بند کر کے باہر سے کنڈی لگا دی اور نیچے چلا گیا۔ میں اوپر جاتے ہوئے اس موقع کی تاک میں لگا ہوا تھا کہ شرفو پل بھر کے لیے غافل ہو تو اس پر ٹوٹ پڑوں لیکن وہ شیطان مجھ سے کہیں زیادہ چوکنا تھا اور اس کی کڑی نظر میری حرکات و سکنات کو اپنی گرفت میں لیے ہوئی تھی۔ اس کے جاتے ہی میں نے اپنے آپ کو بستر پر گرا دیا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ میں اس وقت کچھ سوچنا نہیں چاہتا تھا لیکن ذہن میں جو کھلبلی سی مچی ہوئی تھی' اس پر قابو پانا آسان نہیں تھا۔ پری زاد خانم کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ شادی کے معاملے میں واقعی سنجیدہ ہے اور اپنا انوکھا انتقام لینے پر تلی ہوئی ہے۔ اس بدکار عورت نے اپنی ساری زندگی میں عیاش مردوں سے جو کچھ حاصل کیا تھا' ان سب کا نچوڑ مجھے دینے والی تھی۔ شاید اپنے سینے کی آگ ٹھنڈی کرنے کے بعد مجھے شرفو کے حوالے کر دے۔ شرفو ان لوگوں میں سے تھا جو اپنے دشمن کو معاف کرنا نہیں جانتے تھے۔ وہ یقیناً مجھے کسی ستون سے باندھ کر مجھ پر کھولتا ہوا تیل انڈیل دے گا۔ جہاں یہ سارے خیالات

مجھ پر لرزہ طاری کر رہے تھے' وہاں مہ جبیں کا دوبارہ اغوا اس سے کہیں لرزہ خیز تھا۔ وہ مہ جبیں کو ریالوں اور ڈالروں کے عوض فروخت کر کے اس کے حسن اور زندگی کو دیمک لگانا چاہتی تھی۔ اس مرتبہ مہ جبیں' پری زاد خانم کے چنگل میں پھنس کر نکل نہیں سکتی تھی کیونکہ دشمن ایک مرتبہ کڑی چوٹ کھانے کے بعد ہوشیار ہو گیا تھا۔

اگر میں کسی جیل کی کوٹھری میں بند ہوتا تو شاید فرار کی راہ تلاش کر لیتا لیکن یہ کمرہ تو تہہ خانے سے کم نہیں تھا۔ میں یہاں سے رہائی کے لیے اس لیے بھی بے چین تھا کہ مہ جبیں کو ہر قیمت پر بچا لوں لیکن میں کچھ بھی تو نہیں کر سکتا تھا۔ ایک بے بس پنچھی کی طرح پھڑپھڑا کر رہ گیا۔ کنول سے بھی کسی مدد کی امید نہیں رہی تھی کیونکہ وہ پری زاد خانم سے براہ راست ٹکر نہیں لے سکتی تھی۔ میں نے آنٹی اور پری زاد خانم کے تعلقات سے جو اندازہ قائم کر رکھا تھا' اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ آنٹی کسی وجہ سے اس عورت سے خوفزدہ رہتی ہیں اور گھبراتی ہیں ورنہ کنول اس وقت اپنی محبت کا خون ہوتے دیکھ کر ہی پری زاد خانم کے سامنے ڈٹ جاتی نہ کہ میدان چھوڑ کر کھسک لیتی۔

دولہا میاں کے لیے رات کا کھانا بھی نہیں آیا۔ میں رات گیارہ بجے تک ٹہل ٹہل کے' سوچ سوچ کر پریشان ہوتا رہا۔ آخر کار تنگ آ کر بستر پر لیٹ گیا' آنکھ لگ گئی۔ جب میری آنکھ کھلی تو میں نے اپنے اوپر کنول کو جھکا ہوا پایا۔ اس کا چہرہ متوحش ہو رہا تھا۔ پھٹی پھٹی آنکھوں میں خوف و ہراس جھلک رہا تھا۔ اس نے زبردستی مسکرانے کی کوشش کی۔

"دولہا میاں! جو سوتا ہے' وہ کھوتا ہے۔"

میں ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا تو وہ سوجی ہوئی دکھائی دیں' جیسے وہ کسی تنہا گوشے میں بیٹھ کر بڑی دیر تک روتی اور اپنے آپ کو سمجھاتی رہی ہے۔

"سنو فرید!" اس کی آواز میں ایک عجیب تھرتھراہٹ تھی۔ "پری زاد خانم کو تم نہیں جانتے' میں اس وقت سے جانتی ہوں جب میں بارہ سال کی معصوم بچی تھی اور ایک غریب باپ کا ہاتھ بٹاتی تھی جو موٹر کینگ تھا۔ ایک روز پری زاد خانم اپنی گاڑی لے کر وہاں کیا آئی' میری زندگی یکسر بدل گئی۔ میرے باپ نے حالات سے سمجھوتہ کر کے مجھے پری زاد خانم کے حوالے کر دیا کیونکہ اس کی سات بیٹیاں اور تھیں' اسے خوشحالی مل گئی اور میں نے بھی ایک نئی زندگی دیکھی۔ پری زاد خانم نے مجھے نذیرن کے ہاتھ' وحیدہ سے کنول بنا کر بیچ دیا۔

نذیرن پڑھی لکھی تھی' اس لیے وہ آنٹی بن گئی- میں نے پری زاد خانم کو بہت قریب سے دیکھا ہے- میں نے اپنی زندگی میں کسی مرد کو بھی اس قدر سنگدل اور بے رحم نہیں پایا- آج اس عورت نے میری محبت پر ڈاکا مارا ہے- میرے ارمانوں کا خون کیا ہے- جب میں نے اس سے اپنی محبت کی بھیک مانگی تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی- میں نے کنول کو اپنے بازوؤں میں بھر لیا' مجھے اس وقت ایسا ہی کرنا تھا کیونکہ لوہا گرم تھا- ایسے ہی وقت چوٹ لگائی جاتی ہے- مجھے اپنی رہائی کا راستہ نظر آگیا تھا- دروازہ کھلا ہوا تھا- باہر کوئی کھڑا ہوا پہرہ بھی نہیں دے رہا تھا- کنول نے میرے سینے پر اپنا سر رکھ دیا' وہ اپنی سسکیوں پر قابو پاتے ہوئے بولی- "فرید! کیا تم میرا انتظار کرو گے؟"

میں اس کا مطلب نہیں سمجھا' پھر بھی میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا- "میں زندگی بھر تمہارا انتظار کرتا رہوں گا-"

"تم میرے ساتھ آؤ' میں تمہیں اس زنداں سے نجات دلا دوں-" کنول نے مجھ سے الگ ہوتے ہوئے کہا- "میں پری زاد خانم کو بتانا چاہتی ہوں کہ محبت کے جذبے کے آگے بڑے سے بڑا طوفان بھی ٹھہر نہیں سکتا ہے-"

میں نے گھبرا کے پوچھا- "پری زاد خانم اور آنٹی کہاں ہیں؟ شرفو کیا کر رہا ہے؟"

"وہ دونوں اس قدر پی چکی ہیں کہ وہ اپنے ہوش میں نہیں ہیں بلکہ میں خود انہیں پلا کر آرہی ہوں-" کنول کے لبوں پر مردہ مسکراہٹ ابھری- "شرفو کار لے کر مہ جبیں کو اغوا کرنے گیا ہے-"

کنول نے میری جانب دیکھا- وہ میرے ردعمل کی منتظر تھی کہ میں مہ جبیں کے بارے میں کس قسم کا تاثر دیتا ہوں لیکن میں اپنا اندرونی اضطراب چھپا نہیں سکا- میں نے کنول کی بانہہ پکڑ لی- "جان من! مہ جبیں میری نہیں کسی اور کی ہونے والی ہے' وہ کسی اور سے محبت کرتی ہے- یہ بات اس نے مجھے کل ہی بتائی تھی اور میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ میں اس کے راستے سے ہٹ جاؤں اور تمہاری محبت کے در پر فقیر بن کر کھڑا ہو جاؤں- آج تمہیں دفتر میں دیکھا تو مجھے اس لیے تم پر غصہ آیا کہ میرے ساتھی تمہاری موجودگی اور اس طرح آجانے پر میرا جینا حرام کر دیں گے-" سفید جھوٹ بولتے ہوئے مجھے اپنی آواز کھوکھلی معلوم ہو رہی تھی- "تم نے میری جھولی میں اپنی ساری محبت ڈال دی- تم جب محبت سے

آشنا ہو گئی ہو تو مہ جبیں کی محبت کا بھی خیال کرو' اسے بھی اس چنگل سے نجات دلا دو۔"

"تم مجھ سے فریب تو نہیں کر رہے ہو؟" کنول نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

"محبت جھوٹ نہیں' سچ بولنا سکھاتی ہے۔" میں نے اندھیرے میں تیر چلایا۔ "کیا یہ محبت ہی نہیں ہے جس نے تمہیں یکسر بدل کر رکھ دیا۔"

کنول کی آنکھوں میں چمک بڑھنے لگی۔ اس کے لبوں پر ایک استہزائیہ مسکراہٹ ابھر آئی۔ "بے چارہ شرفو۔" کنول نے ایک بناوٹی سرد آہ بھری۔ "اس نے ایک بار مجھے درندگی کا نشانہ بنایا تھا۔ آج مجھے موقع مل گیا تو میں نے اس کا بدلہ لے لیا۔ وہ مہ جبیں کو اٹھا کر کیا لائے گا بلکہ اسے اٹھا کر لانا ہوگا۔"

کنول کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا۔ اس کے چہرے پر وحشت برس رہی تھی۔ اس کے تیور بتا رہے تھے کہ اس نے شرفو سے کوئی خوفناک انتقام لیا ہے۔ میں بھونچکا ہو کر رہ گیا۔ "تم نے شرفو کے ساتھ کیا کیا؟"

"کچھ باتیں بتانے کی نہیں ہوتی ہیں۔" کنول نے میرے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ "صرف ایک شرفو ہی نہیں بلکہ ہر مرد' عورت کو بڑا ناتواں اور کمزور سمجھتا ہے' جیسے وہ بے جان سا کھلونا ہے۔ اس وقت شرفو کسی ٹوٹے ہوئے کھلونے کے مانند کہیں پڑا ہوگا۔"

کنول مجھ سے اپنے انتقام کا راز چھپانا چاہ رہی تھی۔ اس کی باتوں میں ابہام تھا۔ اس نے شرفو سے کیونکر اور کیسے انتقام لے لیا اور اس بدمعاش کا کیا حشر کیا' میری سمجھ میں نہیں آسکا۔ اس پل میرا ذہن سوچ کی حدوں پر جا کر رک گیا۔ میں مزید سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ یہاں سے نکل بھاگنے اور اس ناگن سے مجھے اپنی جان بچانے کی فکر تھی جو کل میرے خون میں اپنا سارا زہر چھوڑ دینا چاہتی تھی لیکن ادھر کنول جونک بن کر مجھ سے چمٹی ہوئی تھی۔ اپنی محبت کی جوت جگانا چاہتی تھی۔ میں کنول سے اس وقت بے اعتنائی بھی نہیں برت سکتا تھا' اس لیے کہ میں اس کے رحم و کرم پر تھا۔ میری جلد بازی کو وہ میری خودغرضی پر محمول کرتی۔ میں نے پہلے تو دروازے کی جانب دیکھا' زنداں کھلا ہوا تھا' باہر سناٹا اور نیم اندھیرا سا چھایا ہوا تھا۔ میں نے وہاں سے نگاہ ہٹا کر کنول کے چہرے پر ڈالی' اس کی آنکھیں بند تھیں' اس کی لانبی لانبی پلکوں کی طرح اس کے لبوں کی پتیاں بھی تھرتھرا

رہی تھیں' اس پر بے خودی کی سی کیفیت طاری تھی۔ کوئی اور لمحہ ہوتا تو میں اس کی وارفتگی میں بہہ جاتا۔ میں نے جھک کر اس کے کان کے پاس اپنا منہ لے جا کر سرگوشی کی۔ "کنول! اگر ہم بھٹک گئے تو یہ کمرہ پھر زندان بن جائے گا۔"

کنول نے اپنی تھرتھراتی پلکیں اوپر اٹھائیں' اس کی جھیل سی گہری آنکھوں میں خوابیدہ سپنے بکھرے ہوئے تھے۔ وہ سرشاری کے عالم میں بولی۔ "میرے شہزادے! تم اس ڈائن کی فکر نہ کرو۔ میں اس کمینی کو جانتی ہوں' جب وہ خوب پی لیتی ہے تو اسے گھنٹوں تک ہوش نہیں آتا ہے۔ محبت کی ایک گھڑی ملی ہے' جانے پھر کب یہ گھڑی نصیب ہو' مجھے اپنی ذات میں جذب کر لو' چھپا لو۔"

کنول ہر خوف سے بالاتر تھی اور میں اعصاب کے دباؤ کا شکار ہو رہا تھا۔ میں نے طوعاً و کرہاً اسے اپنے سینے میں بھر لیا اور پھر نہایت غیر محسوس انداز سے اپنے سینے سے الگ کیا۔ "چلو! ہم دونوں بھاگ چلتے ہیں۔"

"صرف تم چلے جاؤ۔" اس نے سرگوشی کی۔ "مجھے ابھی یہاں رکنا ہے' اس لیے کہ میرے اندر وحیدہ زندہ ہو گئی ہے۔ وہ ایک عورت ہے' سرکش اور ضدی۔ جب تک وہ ایک ایک سے اپنا انتقام نہیں لے لے گی' وہ یہاں سے نہیں جائے گی۔"

"اچھا! خدا حافظ۔" میں نے اس کی جانب محبت پاش نظروں سے دیکھا۔ "میں تمہارا انتظار کروں گی۔"

"فرید!" وہ تڑپی اور لپک کے میرے پاس آئی۔ "یہ لمحات یادگار تو بنا کر جاؤ۔"

لیکن یہ لمحہ مجھ پر ایسا بھاری ہو گیا کہ میں زندگی بھر اسے یاد کرتا رہوں گا۔ میں نے اس کے لبوں کو پوری طرح سیراب بھی نہیں کیا تھا کہ ایک فلک شگاف قہقہہ فضا میں گونجا۔ میرے دل کو ٹھوکر سی لگی۔ میں نے اور کنول نے سراسیمہ اور بدحواس ہو کر دروازے کی جانب دیکھا۔ دروازے میں آنٹی کھڑی ہوئی تھیں۔ ان کے ہاتھوں میں ایک ریوالور چمک رہا تھا۔ اس کی نالی ہماری طرف اٹھی ہوئی تھی۔ "ذلیل! کمینی!" آنٹی کا پارہ چڑھا ہوا تھا۔ "تو اس شخص پر مرمٹی ہے جو تیری اور میری محسن کا قیدی اور مجرم ہے' تو خانم سے ٹکر لینے جا رہی ہے کتیا! وہ تجھے پیس کے رکھ دے گی۔"

میں نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر کنول کو اپنی ڈھال بنایا۔ کنول نے بھی اپنے دونوں ہاتھ

پھیلا کر مجھے اپنے پیچھے چھپا لیا تھا لیکن کنول کا قد مجھ سے چھوٹا تھا۔ میں بلند قامت تھا۔ وہ میرے لیے ایک ناکارہ ڈھال کی مانند تھی۔ اس نے آنٹی کی گالیوں کا کوئی جواب نہیں دیا کیونکہ وہ اپنی بدحواسی پر قابو نہیں پا سکی تھی۔ میں نے اس خاموشی سے فائدہ اٹھا کر آنٹی کو دیکھا جو ریوالور تانے کمرے کے اندر داخل ہو چکی تھیں۔ وہ نشے کی حالت میں تھیں لیکن پوری طرح اپنے حواس میں تھیں' انہیں ابھی اچھی طرح نشہ نہیں ہوا تھا البتہ بوجھل بوجھل آنکھیں بتا رہی تھیں کہ ان پر نشہ آہستہ آہستہ چڑھتا جا رہا ہے۔ یہ درست ہے کہ شراب کے عادی لوگوں پر نشہ جلد اثر نہیں کرتا' پھر بھی آنٹی کا نشے کی حالت میں ریوالور تھامے کھڑے رہنا ایسا ہی تھا جیسے ہماری موت ان کے ہاتھوں لکھی ہوئی ہے۔ وہ طیش کے عالم میں گولی چلانے سے دریغ بھی نہیں کرتیں۔ انہی خیالات سے میرے بدن میں جھرجھری سی آگئی۔ میں اپنے بچاؤ کی راہ تلاش کرنے کے لیے اپنا ذہن لڑانے لگا۔ جب ہی کنول پوری قوت سے چیخی۔ "آنٹی تم میرے راستے سے ہٹ جاؤ' فرید کو یہاں سے نکل جانے دو۔ کیا تم چاہتی ہو کہ وہ خارش زدہ کتیا میرا حق چھین لے؟"

"یہ شخص خانم کا مجرم ہے' اس پر ہمارا کوئی حق نہیں رہا۔" آنٹی کے ہاتھ میں ریوالور لرزنے لگا۔ "اس شخص نے شاید تمہیں بہکا دیا ہے۔ جب ہی تم اس فریبی کی باتوں میں آکر غداری کر رہی ہو۔ ایک حسن پرست مرد کبھی سچا نہیں ہوتا ہے' تم اسے پہلے بھی ایک بار آزما چکی ہو۔"

میں نے ایک لمحے کی تاخیر کیے بغیر نہایت پھرتی سے اپنے دونوں ہاتھ کنول کی پشت پر رکھ دیئے اور اسے کسی پتھر کی مانند آنٹی پر لڑھکا دیا۔ کنول میرے ارادے سے بے خبر تھی اور آنٹی کو اس غیر متوقع حملے کا وہم و گمان بھی نہیں تھا۔ کنول بڑی تیزی سے آنٹی کے اوپر جا گری۔ آنٹی کنول کا بوجھ برداشت نہیں کر سکیں' وہ اپنا توازن کس طرح برقرار رکھ سکتی تھیں۔ وہ دونوں فرش پر لڑھک گئیں۔ میں نے ان دونوں کو پھلانگ کر بھاگنے میں دیر نہیں کی' میں اندھا دھند بھاگا' زینے سے اتر کے عمارت سے باہر نکلا تو بیرونی دروازہ سامنے تھا۔ برساتی میں ایک نئے ماڈل کی مرسڈیز کھڑی ہوئی تھی۔ میں چاروں طرف دیکھتا ہوا باہر نکل آیا۔ جدھر منہ اٹھا' ادھر کو بھاگتا چلا گیا۔ جب مین روڈ پر آیا تو میری سانسیں سینے میں اس طرح پھول گئی تھیں کہ سانس لینا دشوار ہو رہا تھا۔ میں اپنا سینہ پکڑ کر فٹ پاتھ پر بیٹھ

گیا۔

میں ایک ٹیکسی لے کر گھر پہنچا۔ جب ماں نے اسکوٹر کے بارے میں دریافت کیا تو میں نے بہانہ بنا دیا کہ ایک دوست کو دے آیا ہوں۔ میرا اسکوٹر دفتر کے احاطے میں پارک کیا ہوا تھا۔ اس کے چوری ہونے کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ وہاں کے دونوں چوکیدار میری اسکوٹر کو پہچانتے تھے۔ میں اکثر وہاں اسکوٹر چھوڑ جایا کرتا تھا۔ یہ کوئی تعجب خیز اور نئی بات نہیں تھی۔

امی جان مجھے پریشان اور بوکھلایا ہوا سا دیکھ کر میرے پیچھے پڑ گئی تھیں' بڑی مشکل سے میں نے اپنی خیر خیریت کی تسلی کرائی اور اپنے بستر پر جا لیٹا۔ دن بھر کے واقعات کسی فلم کے مناظر کی طرح میری آنکھوں کے سامنے ابھرنے لگے۔ مجھے کنول پر ترس آ رہا تھا۔ آنٹی نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا ہوگا' میرے ذہن میں کوئی خاکہ نہیں بن سکا البتہ پری زاد خانم' کنول کے ساتھ کس درندگی سے پیش آئے گی اور اس کا کیا حشر کرے گی' اس کا تصور ہی لرزہ خیز تھا۔ معاً مجھے یہ خیال بھی آیا کہ یہ مردانگی نہیں ہے کہ میں کنول کو بیچ منجدھار میں چھوڑ آیا ہوں۔ پھر اس بات سے دل کو یک گونہ سکون سا ہوا کہ کنول مجھے وہاں سے فرار کرانے آئی تھی اور میرے ساتھ چلنے پر راضی نہیں تھی۔ اسے آنٹی اور پری زاد خانم سے انتقام لینا تھا لیکن اب وہ ان دونوں کے انتقام کا نشانہ بن گئی تھی۔

طلوع ہونے والا دن میرے لیے پریشانیوں اور کسی سنگین خطرے کا پیش خیمہ تھا۔ پری زاد خانم کون سا قدم اٹھائے گی' میں نہیں جانتا تھا لیکن میں اس کے انتقام سے بچ نہیں سکتا تھا۔ مجھے قدم قدم پر موت اپنے استقبال کے لیے کھڑی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ شرفو کا کیا حشر ہوا' مجھے کچھ نہیں معلوم ہو سکا۔ کنول اگر مجھے اس انتقام کے بارے میں صاف صاف بتا دیتی تو طمانیت سی رہتی۔ اس نے کچھ نہیں بتایا تھا اور میں اندھیرے میں تھا۔ میرے دل کو یہ دھڑکا سا لگا ہوا تھا کہ کہیں کنول کی اسکیم ناکام نہ ہو گئی ہو اور شرفو نے مہ جبیں کو اغوا نہ کر لیا ہو۔ اگر مہ جبیں کو رات اغوا نہیں کیا گیا تھا تو شاید اسے دن دہاڑے اٹھا کر لے جانے کا پروگرام بنا لیا گیا ہو۔

میں کسی قدر سوچ بچار کے بعد دفتر پہنچا تو میرا ذہن الجھا ہوا اور انتشار کا شکار ہو رہا تھا۔ میں پری زاد خانم کے خوف سے دہشت زدہ ہونے لگا۔ دوسری طرف دفتر کے ساتھیوں

نے مجھ پر طرح طرح کے سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ میں نے انہیں صاف صاف بتا دیا کہ میں کنول کے ساتھ کہیں نہیں گیا تھا بلکہ اسے ٹیکسی میں سوار کرانے کے بعد ایک نجی کام یاد آیا تو اپنے گھر چلا گیا تھا۔

یوں دن بغیر کسی سنگین حادثے اور چونکا دینے والے واقعے کے' امن و امان اور سکون سے بیت گیا لیکن میں نے ایک ایک لمحہ جس پریشانی اور اضطراب کے عالم میں کاٹا۔ اس کی اذیت میں ہی جانتا تھا۔ دل کے گوشوں میں ایک ایسا خوف جاگزیں ہو گیا کہ دفتر میں کسی کام سے آنے والے ہر شخص پر شرفو کا دھوکا ہوتا تھا۔ ہر وقت یہ دھڑکا سا لگا رہا کہ کہیں پری زاد خانم ہی نہ آدھمکے یا اپنے کسی آدمی کے ذریعے کسی بہانے سے اغوا کی کوشش نہ کرے۔ میں نے اس عالم میں بھی کنول کی سلامتی کے لیے دعائیں مانگیں۔ یہ اسی کا کرم تھا کہ میں کھلی اور آزادی کی فضا میں سانس لے رہا تھا۔ ایک خیال بار بار ستا بھی رہا تھا کہ میں نے مہ جبیں کے لیے ایک ایسا ہی گڑھا کھودا تھا لیکن میں خود اس میں جا گرا۔ اگر کنول میرے لیے فرشتہ نہیں بنتی تو میں آج پری زاد خانم کے ہاتھوں ایک کھلونا بن کر رہ جاتا' وہ زندگی بھر مجھے بلیک میل کرتی رہتی۔

میں کنول کا حشر معلوم کرنے کے لیے بہت زیادہ فکرمند تھا۔ ایک جانب یہ خیال بھی آتا تھا کہ پری زاد خانم' کنول کو بڑی عبرتناک سزا دے گی۔ اس کے دشمن کا ساتھ دینے کا مطلب یہ تھا کہ وہ خود بھی اس کے لیے انتہائی خطرناک دشمن تھا۔ دوسری جانب آنٹی کا احساس دل کو تقویت پہنچا رہا تھا۔ آنٹی' پری زاد خانم کے انتقام کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ بن کر کھڑی ہو سکتی تھی کیونکہ کنول' آنٹی کے لیے سونے کی چڑیا تھی۔ اگر کنول کو کچھ ہو جاتا اور اس پر فاقوں کی نوبت آجاتی تو کنول جیسی حسین لڑکی کا دوبارہ ہاتھ لگنا آسان بھی تو نہیں تھا۔ ایسی لڑکی جو قسمت کی بھی دھنی ہو' بڑی مشکل سے ملتی ہے۔

دوسرے روز میں نے فخرو بھائی کو دفتر کے احاطے میں اسکوٹر پارکنگ کی جگہ پر کسی کے انتظار میں بے چینی اور بدحواسی کے عالم میں ٹہلتے ہوئے پایا تو میں بوکھلا کر رہ گیا' میری رگوں میں خوف برف کی مانند سرد ہونے لگا۔ مجھے خیال کہ کہیں فخرو بھائی آنٹی کی کسی چال کی کوئی کڑی نہ ہوں۔ اگر میں دور سے ہی فخرو بھائی کو دیکھ لیتا تو الٹے قدموں لوٹ جاتا لیکن فخرو بھائی نے مجھے دیکھتے ہی فضا میں اپنا ہاتھ لہرا دیا تھا۔ میں نے خوفزدہ نگاہوں سے

چاروں طرف دیکھا' کوئی مشتبہ آدمی دکھائی نہیں دیا۔ جب میرا اسکوٹر فخرو بھائی کے پاس پہنچا تو وہ لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں بولے ......"فرید بھائی! سامنے والے ہوٹل میں چل کر بیٹھتے ہیں' تم سے بہت ساری باتیں کرنی ہیں۔"

میں بادل نخواستہ فخرو بھائی کے ساتھ ہو لیا۔ مجھے ان پر پورا پورا بھروسا تھا۔ وہ میرے آدمیوں میں سے تھے لیکن میں پھر بھی ہوٹل کی جانب جاتے ہوئے چوکنا اور بڑا محتاط تھا۔ میں نے ہوٹل کے اندر داخل ہو کر ایسا گوشہ منتخب کیا کہ اگر کسی بدمعاش نے میرے ساتھ کسی قسم کی حرکت کی تو آسانی سے مزاحمت کر کے اپنے آپ کو تحفظ دے سکوں۔ فخرو بھائی نے بیٹھتے ہی سانس بھی لینے نہیں دیا ......یکایک میرے سر پر جیسے بم دے مارا ......"تم نے وہ عبرت ناک خبر سن لی نا؟"

"کون سی خبر؟" میرے سینے میں دل دھک سے ہو کر رہ گیا۔ میرا خیال فوراً کنول کی جانب چلا گیا۔ پری زاد خانم نے آخرکار اس غریب کو بخشا نہیں۔ کنول کے ساتھ اس نے کیسا بے رحمانہ برتاؤ کیا ہوگا' میں تصور نہیں کر سکا۔ فخرو بھائی جو خبر لائے تھے' وہ یقیناً بڑی سنگین تھی۔

"مجھے تو یقین ہی نہیں آرہا ہے کہ آخر یہ سب اچانک کیسے اور کیونکر ہو گیا؟" فخرو بھائی نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا ......"صرف ایک ہی دن میں انجام بھی سامنے آگیا۔"

سینے میں میرا دل پھڑپھڑانے لگا۔ "جلدی سے بتاؤ نا......آخر ہوا کیا؟" میں نے بے تاب ہو کر ان کا شانہ جھنجوڑ دیا۔ "یہ تم مجھ سے پہیلیاں کیوں بجھوا رہے ہو؟"

"کیا تم نے آج کا اخبار نہیں دیکھا؟" فخرو بھائی کے لہجے میں حیرت تھی......"ساری دنیا کو خبر ہو گئی' شہر میں ایک کھلبلی سی مچی ہوئی ہے' تمہیں اس کی خبر ہیں کس کا تعلق تمہاری ذات سے بھی ہے۔"

"کون سی خبر!" میں نے متعجب ہو کر پوچھا۔ "اتفاق سے آج اخبار ہی نہیں دیکھا۔"

"کیا دل دہلا دینے والا ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔" فخرو بھائی کی آواز یکلخت جذباتی ہو گئی۔ "کل صبح آٹھ بجے پری زاد خانم' آنٹی اور کنول کے ہمراہ اپنی مرسڈیز میں کہیں جا رہی تھی کہ اچانک اس کی کار جو بڑی تیز رفتار تھی' ایک سگنل پر کھڑے ہوئے ٹرک کے عقبی حصے

سے ٹکرا کر پچک گئی۔ اگلی نشست پر پری زاد خانم اور آنٹی بیٹھی ہوئی تھیں' وہ دونوں موقع پر ہی ہلاک ہو گئیں لیکن کنول معجزاتی طور پر بچ گئی۔ اس نے اپنی زندگی میں شاید کبھی کسی کے ساتھ کوئی نیکی کی ہوگی' وہ کام آگئی لیکن وہ کل سے بے ہوش پڑی ہوئی ہے۔" فخرو بھائی آبدیدہ ہو گئے۔ "میں اسے اسپتال سے دیکھ کر سیدھا یہاں آرہا ہوں' وہ زندگی اور موت کی کشمکش میں پھنسی ہوئی ہے۔ اسے آکسیجن دی جا رہی ہے۔ خون بھی دو بوتل چڑھایا گیا ہے' پندرہ ڈرپ لگی ہیں۔" فخرو بھائی نے آنکھیں بند کر کے توبہ و استغفار کیا۔ "اس کی زندگی کے امکانات ففٹی ففٹی ہیں۔ کیا اسی دن کے لیے ہم اس دنیا میں مکرو فریب اور کالے پیلے دھندے کرتے پھرتے ہیں ......" ان پر صوفیانہ اثر غالب آگیا تھا۔

میں بھونچکا ہو کر رہ گیا۔ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ میں قدرت کے اس حیرت ناک انتقام پر لرز اٹھا۔ اس کے ہاں دیر ہے' اندھیر نہیں۔ دوسرے لمحے مجھے ان دونوں کی موت کی خبر سن کر اس قدر خوشی ہوئی کہ میں اندر ہی اندر پھولا نہیں سمایا۔ ان دونوں کی موت پر میرا دل ذرا سا بھی نہیں دکھا۔ پری زاد خانم سے کہیں زیادہ سفاک اور ظالم عورت آنٹی تھیں۔ آنٹی نے جانے کتنے گھرانوں کو تباہ و برباد کیا تھا۔ آنٹی نے مہ جبیں پر ہاتھ ڈال کر اپنی موت کے لیے راہ بنائی تھی۔ اس معصوم اور نیک سیرت لڑکی کا کوئی قصور تو نہیں تھا کہ اسے تباہ و برباد کر کے اپنے زخموں کو مندمل کرتیں' وہ اسی انجام کے لائق تھیں لیکن کنول کے شدید زخمی ہونے کی اطلاع سے میرے دل پر دھچکا سا لگا۔ اس نے میری زندگی پر ہی نہیں بلکہ مہ جبیں پر بھی احسان کیا تھا۔ فخرو بھائی مجھے خاموش اور سوچ میں ڈوبا ہوا پا کر افسردگی سے بولے "مجھے کنول پر بڑا ترس آرہا ہے' خدا اسے ایک نئی زندگی دے دے۔ میں نے اسے ہمیشہ ایک ملنسار لڑکی کی طرح پایا' اس میں غرور بالکل نہیں تھا۔"

لیکن میرا ذہن کہیں اور تھا۔ میں کنول کے بارے میں نہیں' اپنی خوشیوں کے متعلق نہیں بلکہ ایکسیڈنٹ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ کنول نے اس رات پری زاد کو اس قدر پلائی تھی کہ صبح تک بھی اس پر نشہ طاری رہا۔ وہ کنول کو کسی جگہ لے جا کر سزا دینا چاہتی تھی کہ قدرت نے پری زاد خانم اور آنٹی کو سزا دے دی۔ پری زاد خانم کی مے نوشی نہ صرف اس کے لیے بلکہ آنٹی کے لیے بھی موت کا باعث بن گئی۔ میں نے انہی خیالات کے زیر اثر فخرو بھائی سے پوچھا۔ "کیا پری زاد خانم نشے میں کار چلا رہی تھی؟"

"اخبار میں لکھا ہے کہ بریک فیل ہو گئے تھے!" فخرو بھائی نے جواب دیا۔

"لیکن وہ مرسڈیز کار تو بالکل نئی تھی!" میں نے تعجب سے کہا۔

"خدا معلوم کیا چکر ہے؟" فخرو بھائی کے چہرے پر حیرت کے آثار پھیلنے لگے...... "پرسوں رات پری زاد خانم کا ایک ساتھی شرفو ایک نئی ٹویوٹا کار لے کر ناظم آباد جا رہا تھا کہ اس کی کار کے بھی بریک فیل ہو گئے اور وہ ایک بجلی کے کھمبے سے ٹکرا گئی۔ وہ زخمی ہو کر چند گھنٹوں بعد اسپتال میں دم توڑ گیا۔ پولیس کا کہنا ہے کہ دونوں کاریں ایک ہی سازش کی کڑی ہیں۔ پری زاد خانم کے کسی دشمن نے سوچ سمجھے منصوبے کے تحت بریک ناکارہ کر کے رکھ دیئے۔"

میرے ذہن میں دھماکہ ہوا اور میرے تصور میں کنول مسکراتی ہوئی آ کھڑی ہوئی۔ اس کا ایک جملہ میرے ذہن کے ایوانوں میں گونجنے لگا۔ "جب میں بارہ سال کی معصوم بچی تھی او، اپنے غریب باپ کا ہاتھ بٹاتی تھی جو موٹر مکینک تھا......" کنول نے وحیدہ بن کر مجھ لیا، کہا تھا۔ "مجھے ابھی یہاں رکنا ہے' اس لیے کہ میرے اندر وحیدہ زندہ ہو گئی ہے۔ وہ بہت عورت ہے' سرکش اور ضدی۔ جب تک وہ ایک ایک سے اپنا انتقام نہیں لے لے گی' وہ یہاں سے نہیں جائے گی۔" اس نے شرفو کے بارے میں بڑے سنگدلی اور حقارت آمیز لہجے میں کہا تھا۔ "اس نے مجھے ایک مرتبہ درندگی کا نشانہ بنایا تھا' آج مجھے موقع مل گیا تو میں نے اس سے بدلہ لے لیا ہے۔ وہ مہ جبیں کو اٹھا کر کیا لائے گا بلکہ اسے اٹھا کر لانا ہو گا۔"

کنول نے بڑے صبر آزما اور حوصلہ شکن حالات کی دھار کے خلاف جانے کب سے اپنے آپ کو اندر ہی اندر تیار کرنا شروع کر دیا تھا' جانے کب سے وہ گھات لگائے بیٹھی ہوئی تھی۔ جیسے ہی اس کے اندر سے وحیدہ بپھر کے اٹھی تو وہ یکلخت آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑی۔ اس کے ابلتے ہوئے لاوے نے ان تینوں کو ایک ساتھ اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس نے جانے کتنے برسوں اپنے مکینک باپ کا ہاتھ بٹایا ہوا تھا کہ آج اس کی ساری محنت اور مہارت کام دے گئی تھی۔ اس نے دنیا کی ہر ذلت اپنے دامن میں سمیٹ کر صبر و ضبط کیا لیکن وہ اپنی محبت کو قربان گاہ کی بھینٹ چڑھتی ہوئی نہیں دیکھ سکی۔ اس نے دوبارہ وحیدہ بن کر جنم لیا تو کنول کی ذات کو تھپک تھپک کر سلا دیا تھا۔ موت زندگی کی کشمکش میں

وحیدہ الجھی ہوئی تھی‘ کنول نہیں ...... میں کس قدر جذباتی ہو کر اس کے بارے میں سوچے جا رہا تھا۔ فخرو بھائی بھی کسی گہری سوچ میں غرق تھے۔ ان کی پیشانی پر ٹیڑھی میڑھی لکیریں ابھر آئی تھیں۔ میں نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے سرگوشی کے انداز میں کہا ...... "کنول نے میری راہ سے بھی ان زہریلے کانٹوں کو ہٹا دیا جو میری زندگی میں سرایت کرتے جا رہے تھے‘ اگر وہ ان چڑیلوں اور بدمعاش کے انتقام نہیں لیتی تو شاید آج کے اخبار میں میرے بارے میں کوئی منحوس خبر شائع ہوئی ہوتی۔"

"ایں!" فرید بھائی بھونچکا ہو کر میری شکل دیکھنے لگے۔ "فرید بھائی! یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ کنول نے ان تینوں سے انتقام لیا ہے؟" ان کی آواز میں عجیب سی سرسراہٹ تھی۔ "تم نہیں جانتے لیکن میں جانتا ہوں کہ کنول تم سے اس روز کی بے عزتی کا بدلہ لینے پر تلی ہوئی تھی۔ اس نے مہ جبیں کو آزاد کروایا‘ پھر بھی اس کے سینے کی آگ نہیں بجھی۔ جب مہ جبیں فرار ہو گئی تو اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی تھی لیکن وہی کنول ان تینوں کی جان کیسے لے سکتی ہے؟ وہ کیسے جانتی ہے کہ گاڑیوں کے بریک کس طرح ناکارہ کیے جا سکتے ہیں لیکن تمہیں یہ کیسے اور کیونکر معلوم ہوا؟"

فخرو بھائی نے ایک ہی سانس میں دل کی بات اگل دی تھی۔ میں نے فخرو بھائی کو وحشت ناک کہانی سنائی تو وہ سناٹے میں آ گئے۔ کتنی ہی دیر تک ان پر سکتہ سا چھایا رہا۔ جیسے انہیں اس کہانی پر یقین نہیں آ رہا ہو۔ کچھ دیر بعد وہ بولے تو ان کی آواز تحیر میں ڈوبی ہوئی تھی۔ "میں نے کنول جیسی عورتوں اور لڑکیوں کو بے حد قریب سے دیکھا ہے۔ میں اس ذات کو جانتا ہوں جو بڑی عجیب و غریب شے ہے‘ جب ان کے سینے میں محبت جاگتی ہے تو وہ اتنی بدل جاتی ہیں کہ یقین ہی نہیں آتا ہے؟"

میں سرشام گھر پہنچا تو بے حد مسرور تھا اور اپنے آپ کو گیس کے غبارے کی طرح ہلکا پھلکا محسوس کرتا آسمان کی بلندیوں پر اڑتا پھر رہا تھا۔ ہر کسی نے میرے چہرے پر پھوٹتی خوشی کے بارے میں معلوم کرنا چاہا۔ میں نے سبھی کو کسی نہ کسی بہانے ٹال دیا‘ میں نے اپنی نئی زندگی کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتایا۔ بتانے کے لیے میرے پاس تھا بھی کیا۔ اس سارے فساد کی جڑ میری اپنی ذات تھی۔ میں کنول کے حسن پر ریجھ کر سانس لینے بھی نہیں پایا تھا کہ مہ جبیں غیر متوقع اور ایک سنگین حادثے کی صورت میں میری راہ

میں آکڑی ہوئی۔ میری وجہ سے مہ جبیں' آنٹی اور پری زاد خانم کے ستم کا نشانہ بنتے بنتے رہ گئی۔ میں نے مہ جبیں کے ایک کنواں کھودا تو میں خود ہی اس میں گرتے گرتے بچا۔ میں ایک چراغ کی مانند جلتا رہا۔ بڑے بڑے طوفان کے تھپیڑے بھی مجھے بجھا نہیں سکے۔ یہ کہانی گھر والوں کو سنانے کے لیے نہیں تھی۔ میں نے اسے سینے کی گہرائیوں میں دفن کر لیا۔

میں دوسرے روز امی جان کو بڑے میاں کے ہاں ان کا عندیہ معلوم کرنے کے لیے بھیجنا چاہتا تھا۔ میں نے مہ جبیں کو کسی قدر اپنے حق میں ہموار کر لیا تھا۔ امی جان کا بخار صبح ہی اترا تھا' انہوں نے بدپرہیزی کر لی تو سہ پہر تیز بخار چڑھ آیا۔ ان کی مکمل صحت یابی تک بات ٹل گئی تھی۔ میں اپنی بہنوں یا کسی قریبی بزرگ رشتے دار کو بھیجنا چاہتا تھا۔ امی جان نے منع کر دیا کیونکہ بڑے میاں سے نمٹنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں تھی۔ پولیس کی ملازمت نے اس شخص کو انتہائی خشک اور خرانٹ بنا دیا تھا۔

رات جب میں بستر پر لیٹا تو میرے رگ و پے میں ایک عجیب سی سرشاری لہریں لے رہی تھی۔ جیسے میں نے بے آب و گیاہ صحرا میں ٹھنڈے پانی کا چشمہ پا لیا تھا اور اب اس سے سیراب ہونے لگا تھا۔ من کی گہرائیوں میں ہر دھڑکن' فرحت بن کر دماغ کے گوشوں میں پھیلتی جا رہی تھی۔ میں شادی کا ایک سہانا سپنا دیکھ رہا تھا۔ میرے سجے ہوئے کمرے میں ایک لمبی چوڑی مسہری پر جس کے چاروں طرف پھولوں کی لڑیاں جھول رہی تھیں۔ اس پر مہ جبیں دلہن بنی' گٹھری بن کے سمٹی ہوئی تھی۔ اس نے لمبا سا گھونگھٹ نکال رکھا تھا۔ اس کے ہاتھ پیروں کے سوا کچھ اور نظر نہیں آتا تھا لیکن وہ بھی بھڑکیلے اور ریشمی لباس کی سلوٹوں میں کسی قدر چھپ سے گئے تھے۔ میں مسہری پر اس کے پاس جا بیٹھا' میں نے اپنا ہاتھ بڑھا کر مہ جبیں کا حسین اور نرم و نازک ہاتھ تھام لیا' مہندی نے جس کا حسن بڑھا دیا تھا' میں نے دوسرے لمحے بڑی آہستگی سے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ "مہ جبیں! میری مہ جبیں!" یہ آواز دل کی صدا تھی۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کا گھونگھٹ دھڑکتے دل کے ساتھ الٹ دیا۔ میرے سامنے ایک حسین چہرہ تمتما رہا تھا۔ وہ چہرہ مہ جبیں کا نہیں بلکہ کنول کا تھا۔ کنول نے اپنے سر سے گھونگھٹ اتار کر پھینک دیا۔ اس نے مسہری سے اتر کر چاروں طرف لگی ہوئی پھولوں کی لڑیاں نوچنی شروع کر دیں۔ انہیں فرش

پر پھینک کر اپنے پیروں سے روندنے لگی۔ انھیں روندتے روندتے وہ یکایک چیخ پڑی اور وحشت میں میرا گریبان پکڑ لیا۔ "فرید! میں تمھاری ہوں۔ تم نے مجھ سے محبت اور شادی کا اقرار کیا تھا۔ عہد و پیاں کیے تھے لیکن تم نے مہ جبیں سے شادی کرلی' تم یہ سمجھے کہ مجھے دھوکا دے دو گے۔ میں کنول نہیں' وحیدہ ہوں۔ وحیدہ کو بے وقوف نہیں بنایا جا سکتا۔ اسے جو فریب دے گا' میں اس کا گلا گھونٹ دوں گی۔"

یکلخت میری آنکھ کھل گئی' میرا لرزتا ہوا جسم پسینے میں نہایا ہوا تھا۔ میں ان تینوں کی موت کی خبر سن کر اس قدر خوش ہوا تو یہ بھی بھول گیا کہ میں نے اپنی رہائی کی غرض سے کنول کے ساتھ جھوٹی محبت کا ڈرامہ کھیلا تھا۔ کنول میری محبت کی اسیری میں اتنی آگے بڑھ گئی کہ اس نے اپنی اور میری راہ کی چٹانوں کو سرکا دیا تھا۔ جب کنول زندگی اور موت کی کشمکش سے نکل کر صحت یاب ہو جائے گی اور وحیدہ بن کر میری اور مہ جبیں کی راہ میں ایک ناگن بن کر ڈسنے کے لیے اپنا پھن لہرائے گی' تب میں کیا کروں گا؟ وہ مہ جبیں کو ڈس لے گی' کیا میں اس ناگن کا سر کچل سکوں گا؟ کیا میں اس کے انتقام سے بچ سکوں گا؟ میرے ذہن پر ہتھوڑے کی ضربیں لگ رہی تھیں' میں پاگلوں کی طرح کمرے کے چکر کاٹنے لگا۔ آج مجھے لینے کے دینے پڑ رہے تھے۔

میں نے صبح ہوتے ہی فخرو بھائی کو ان کے گھر پر جا لیا۔ وہ مجھے اپنے ہاں پا کر بڑے حیران و پریشان ہوئے۔ وہ سمجھ گئے کہ مجھ پر کوئی افتاد آن پڑی ہے' مجھے ان کو اپنے ساتھ لے کر اسپتال پہنچنا تھا' کنول اسپیشل وارڈ میں زیرعلاج تھی۔ میں نے کمرے کے باہر راہداری میں کنول کے عاشقوں کی ایک بڑی تعداد کو افسردہ و ملول پایا۔ وہ کنول کی زندگی کی خبر پانے کے لیے مضطرب اور بے چین دکھائی دے رہے تھے۔ کنول کی مقبولیت کا اندازہ کرکے میں حیران بھی ہوا۔ برابر کا ایک کمرہ کنول کے منہ بولے ماموں نصیر نے لے رکھا تھا۔ فخرو بھائی نے مجھے بتایا کہ وہ کنول کے علاج کے سارے اخراجات برداشت کر رہا ہے۔ جب میں اس کے کمرے میں داخل ہوا تو اس نے اپنا حال دیوانوں کی طرح بنا رکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں سرخ ڈورے ابھرے ہوئے تھے۔ جیسے وہ کئی راتوں سے مسلسل جاگ جاگ کر کنول کی زندگی اور سلامتی کے لیے دعائیں مانگتا رہا ہے۔ اسے کنول کی زندگی اس لیے بھی عزیز تھی کہ اسٹیج ڈراموں میں تہلکہ مچانے والی اس کی جیبیں بھر سکتی تھی۔ اس

کے چہرے پر ایک انجانا اور نادیدہ خوف بھی چھایا ہوا تھا۔ اسے شاید یہ خدشہ تھا کہ کہیں کنول مر نہ جائے۔ وہ مجھے دیکھتے ہی چراغ پا ہو گیا۔ "تم یہاں کیا لینے آئے ہو؟ کیا تم کنول کی لاش دیکھنا چاہتے ہو؟ کان کھول کر سن لو' میں اسے مرنے نہیں دوں گا۔ میں اس کی زندگی کے لیے اپنی ساری دولت خرچ کر دوں گا۔ اس کی جان بچا لوں گا۔ نکل جاؤ یہاں سے' تمہی اس کی بربادی کے ذمہ دار ہو۔"

نصیر کے انداز و اطوار اور وضع قطع ہمیشہ بدمعاشوں کی طرح رہی تھی اور وہ ہیرا منڈی میں غنڈوں کا سردار بنا پھرتا تھا۔ ہیرا منڈی اجڑی تو اس نے فلم انڈسٹری میں ملازمت اختیار کرلی۔ وہ ضرورت سے زیادہ ذہین اور دور اندیش تھا۔ اس نے ایک فنانسر پھانس کر لاہور میں اسٹیج ڈراموں کا ایک پروگرام بنایا جو بہت ہی کامیاب رہا لیکن اس کی فنانسر سے زیادہ دنوں تک نہیں بن سکی تو وہ کراچی آگیا۔ فخرو بھائی سے اس کی ملاقات ہوئی تو اس نے آنٹی نے نصیر کو متعارف کرا دیا۔ اس نے آنٹی کو اپنی بہن بنا لیا۔ کنول کے حسن اور اس کی بے باکی کو آزمایا تو کراچی والوں نے اپنی آنکھوں پر بٹھایا' وہ کنول کی دلکشی کی جھلک دکھا دکھا کر تماشائیوں کو دونوں ہاتھوں سے لوٹتا رہا اور اب کنول کی صحت یابی کے بعد پھر سے ڈراموں کا سلسلہ شروع کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اس سے الجھنا مناسب نہیں سمجھا' فخرو بھائی نے اسے بڑی مشکل سے ٹھنڈا کیا۔

کنول کی حالت خطرے سے باہر نہیں ہوئی تھی۔ اسے اب بھی خون دیا جا رہا تھا اور ڈرپ لگ رہی تھی۔ اس کا نازک سا بدن پٹیوں میں لپٹا ہوا تھا۔ اسے تین دن سے ہوش ہی نہیں آیا تھا۔ میں نے کنول کو دیکھا' زیادہ دیر تک اسے دیکھ نہیں سکتا تھا' کمرے سے باہر نکل آیا۔ میں فخرو بھائی کو اسپتال کے ایک ایسے گوشے میں لے آیا جو سنسان اور ویران نظر آیا۔ جہاں آس پاس کوئی نہیں تھا۔ میں نے فخرو بھائی سے پوچھا۔ "کیا کنول بچ جائے گی؟"

"کیوں نہیں؟" فخرو بھائی نے پرامید لہجے میں جواب دیا۔ "زندگی لینا دینا خدا کے ہاتھ میں ہے۔ ہم اس سے ناامید نہیں ہو سکتے۔"

"وہ تین روز سے موت اور زندگی کی کشمکش میں مبتلا ہے' ایسے کوئی آثار بھی نظر نہیں آرہے ہیں کہ اس مشکل سے نکل آئے گی۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

"آخر اسے سسکا سسکا کر موت سے ہمکنار کیوں کیا جا رہا ہے؟"

"اس کی زندگی کے لیے پوری پوری کوشش کی جا رہی ہے۔ نصیر نے بھی کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی ہے' وہ پیسہ پانی کی طرح بہا رہا ہے۔" فخرو بھائی نے اداسی سے کہا۔ "ڈاکٹروں نے بھی اپنی پوری توجہ دے رکھی ہے۔ جب تک اوپر والے کی رضا شامل نہ ہو' کوئی کچھ نہیں کر سکتا ہے۔"

"اس کے ماموں کو اس کی زندگی اور موت سے کوئی ہمدردی نہیں ہے۔" میں نے فخرو بھائی کو سمجھایا۔ "وہ محض اپنی غرض کے لیے کنول پر ظلم کر رہا ہے۔"

"یہ ظلم کیسے ہوا؟" فخرو بھائی حیران ہو گئے۔

"کیا یہ ظلم نہیں ہے کہ ایک بدقسمت عورت کو سکون سے مرنے نہیں دیا جا رہا ہے؟"

"آخر تم کہنا کیا چاہتے ہو فرید بھائی؟" فخرو بھائی نے وحشت زدہ مگر پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھا۔

"میں کنول پر ایک احسان کر کے اس کے احسان کا بدلہ چکانا چاہتا ہوں۔" میں نے

شقاوت سے کہا۔

"وہ کس طرح؟" فخرو بھائی کے جسم میں جھرجھری سی آ گئی۔ وہ میری باتوں کی تہہ میں پہنچ کر کچھ کچھ سمجھ گئے تھے۔

"کنول کی زندگی اس سے چھین کر!" میں نے پرسکون لہجے میں بغیر کسی جھجک کے کہہ دیا۔ "وہ تین دن سے موت سے جنگ کر رہی ہے' چند گھنٹے یا کچھ دن اور لڑے گی لیکن ہم میں سے کسی کو احساس نہیں ہے کہ اس پر کیا بیت رہی ہے۔ اگر ہم چاہیں تو اس عذاب سے اسے نجات مل سکتی ہے جس سے وہ دوچار ہے۔ اسے مر جانا چاہیے فخرو بھائی۔ اسی طرح ہم اس پر احسان کر سکتے ہیں۔"

"نہیں' نہیں۔" فخرو بھائی دہشت زدہ ہو کر اس طرح پیچھے ہٹے جیسے انہیں مجھ میں موت کے فرشتے کا عکس نظر آ گیا ہو۔ "تمہارا دماغ چل گیا ہے فرید بھائی! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ کیا یہ انسانیت ہے کہ ہم اس معصوم کی جان لے لیں۔ کچھ تو خوف خدا کرو۔"

میں نے کسی اور طور و انداز سے انہیں سمجھانا چاہا لیکن فخرو بھائی میرے ہم خیال نہ

بن سکے- میں ان کے تعاون سے اسپتال کے کسی ملازم سے مل کر کنول کو اپنی راہ سے ہٹانا چاہتا تھا- اس اسپتال میں زیادہ تر ملازمین کم تنخواہوں پر ملازم تھے- ان کی ضرورتیں اتنی تھیں کہ وہ رشوت لیے بغیر کوئی کام نہیں کر سکتے تھے- ان کی نس نس میں بے حسی رچی بسی ہوئی تھی- کتنے مریض روز ہی ان کی غفلتوں سے مرجاتے تھے جس کی انہیں پروا نہیں ہوتی تھی- شاید وہ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ انہیں کبھی مرنا نہیں ہے اور خدا کو جواب بھی نہیں دینا ہے- اگر کسی کے دل میں ایک مقرر دن حساب کتاب دینے کا خوف دامن گیر ہوتا تو کتنی جانیں تلف ہونے سے بچ سکتی تھیں- کنول بھی اب تک اس لیے زندہ تھی کہ نصیر قدم قدم پر نوٹ پھینک رہا تھا- اگر اس کا کوئی وارث نہیں ہوتا تو وہ کب کی مر گئی ہوتی-

میں نے فخرو بھائی کو ان کے گھر چھوڑا- دفتر میں دو تین گھنٹے بیٹھ کر کام نمٹاتا رہا- جب میری اوپری آمدنی حسب توقع ہو گئی تو میں سیدھا اسپتال آیا- میں نے نصیر کی نظروں سے بچ بچا کر اسپیشل وارڈ کے خاکروب کو پکڑا' اس کا نام رابرٹ مسیح تھا- میں اسے اسپتال سے لے کر باہر نکلا- ایک بہانے سے اسے صدر کے ایک پارک میں لے آیا- میں نے اس سے پوچھا- "کیا کنول موت کے منہ سے نکل آئے گی؟"

"کچھ کہہ نہیں سکتا جی!" اس نے ذہن پر زور دیتے ہوئے جواب دیا- "ویسے اس کی جو حالت ہے' اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بچ نہیں سکے گی-"

"کیا نزع کے عالم سے کوئی بھی بچا ہے؟"

"نہیں جی!" اس نے فکرمندی سے کہا- "لیکن اسپتال میں بڑے بڑے معجزے ہوتے ہیں- جس کے جینے کی امید ہوتی ہے' وہ پوری طرح صحت یاب ہو کر اچانک مر بھی جاتا ہے- جس کے زندہ بچ جانے کی کوئی امید نہیں ہوتی ہے' اسے شفا مل جاتی ہے- یہ قدرت کے کھیل ہیں' جس کے آگے ڈاکٹر صاحبان بھی مجبور ہیں-

"تمہاری تنخواہ کیا ہے؟"

"ساڑھے تین سو روپے-"

"کیا اس میں آسانی سے گزارہ کر لیتے ہو؟"

"آسانی سے!" وہ تمسخر سے ہنسا- "میرے آٹھ بچے ہیں- میں' میری بیوی اور جوان بیٹی اسپتال میں نوکری کر کے اور بخشش سے بمشکل گزارہ کر لیتے ہیں- پیٹ بھر کے کھانا بھی

نصیب نہیں ہوتا ہے۔"

میں نے اپنی جیب سے پرس نکال کر اسے نوٹوں کی شکل دکھائی۔ "اگر تم میرا ایک چھوٹا سا کام کر دو میں تمہیں دو ہزار روپے دے سکتا ہوں۔"

"دو ہزار روپے!" اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اس نے متحیر ہو کر پوچھا۔ "کام کیا ہے؟"

"میں کنول کو نزع کے عذاب سے نجات دلانا چاہتا ہوں۔" میں نے اسے ایک سبق پڑھانے کی کوشش کی۔ "غیر ممالک میں لوگ زیادہ حقیقت پسند ہوتے ہیں۔ وہ ایک مرتے ہوئے شخص کے پیچھے اپنا وقت' پیسا' خون کا عطیہ اور اپنی ساری قابلیت برباد نہیں کر دیتے ہیں۔ انہیں ہم سے زیادہ انسانیت کی فکر ہوتی ہے' جب ہی وہ ایک مرتے ہوئے شخص کو انجکشن دے کر یا کسی اور طریقے سے ختم کر دیتے ہیں مگر بدقسمتی سے ہمارے ہاں لوگ جذباتی اور احمق ہوتے ہیں' خوابوں کی دنیا میں جیتے ہیں۔ اس بدنصیب پر ظلم کر رہے ہیں جو ایک دو دن میں مرنے والی ہے۔ کیا یہ انسانیت ہے کہ ایک شخص کو سکا سکا کر مار دیا جائے؟"

"نہیں!" اس کی گردن غیر ارادی طور پر نفی میں ہلی اور اس نے حیرت سے پوچھا۔ "آپ کیا چاہتے ہیں؟"

"مجھے اس بدنصیب پر بڑا ترس آ رہا ہے۔" میں بناوٹی طور پر آبدیدہ ہو گیا۔ "میں چاہتا ہوں کہ وہ ڈاکٹروں اور رشتے داروں کے ظلم کا نشانہ بننے کی بجائے آخری آرام گاہ کی جانب واپس چلی جائے۔"

"لیکن میں یہ کام نہیں کر سکتا۔" وہ بدحواس ہو گیا۔

"اسے آکسیجن نہیں دی جا رہی ہے ورنہ تمہارا کام اور آسان ہو جاتا۔" میں نے اس کے گرد اپنا گھیرا تنگ کیا۔ "صرف دو منٹ کی بات ہے' تم اس کے منہ پر تکیہ رکھ کے اس کی سانسیں بند کر دو۔"

"نہیں صاحب جی!" وہ خوفزدہ ہو گیا۔ "کسی نے مجھے عین وقت پر پکڑ لیا تو جیل پہنچ جاؤں گا۔"

"تمہارے لیے یہ کام مشکل نہیں ہے۔" میں نے اسے آمادہ پا کر سمجھایا۔ "تم صفائی

اس نے اپنی جیب سے ایک ہزار روپے نکال کر میرے ہاتھ پر رکھ دیئے۔ "یہ سنبھالیے جی اپنی رقم۔" اس کی آواز سے خوشی پھوٹی جا رہی تھی۔ "اس کی زندگی پانے کی خبر' ان دو ہزار روپوں سے کہیں بڑھ کر ہے۔"

پندرہ دنوں کے عرصے میں ادھر امی جان بیمار ہیں' ادھر کنول تیزی سے صحت یاب ہو رہی تھی۔ وہ اسپتال میں ہی زیر علاج تھی۔ اس کے زخم بھرتے جا رہے تھے اور توانائی واپس آ رہی تھی۔ میں کنول کی عیادت کرنے کے لیے اسپتال چلا تو جاتا تھا لیکن میرے ذہن میں طرح طرح کے منصوبے پرورش پانے لگے تھے۔ میں نے اسے موت کے منہ میں پہنچانے کے لیے بہت ساری اسکیمیں بنائیں اور تدبیریں سوچتا رہا لیکن میرے لیے کوئی منصوبہ قابل عمل نہیں تھا۔ ادھر ایک ماہ گزر گیا۔ کنول کی محبت میں بڑی شدت آ گئی تھی۔ نصیر کو محبت کے یہ انداز ایک آنکھ نہیں بھاتے تھے۔ وہ شاید اس انتظار میں تھا کہ کنول اسپتال سے رخصت ہو کر گھر آئے تو میرا پتا کاٹ دے۔ میں خود بھی یہی چاہتا تھا۔ اس روز کے لیے بے قراری سے منتظر تھا۔

کنول کے اسپتال سے رخصت ہونے سے ایک روز قبل جب میں کنول سے ملنے گیا تو وہ اپنے کمرے میں تنہا تھی۔ وہ میرے انتظار میں بڑی بے تاب اور مضطرب سی ہو رہی تھی۔ جب میں بستر پر اس کے پاس بیٹھ گیا تو اس نے کسی قدر لجا کر اپنی نظریں نیچی کر لیں۔ "فرید! آج میں تمہیں ایک خوشخبری سنانا چاہتی ہوں۔"

میں نے چونک کر اس کا حیا آلود چہرہ دیکھا' یہ چہرہ کنول کا نہیں' وحیدہ کا تھا۔ ایک خیال دماغ میں سنسناتا گیا۔ "کہیں نصیر نے کنول کو مجھ سے شادی کرنے کی اجازت تو نہیں دے دی ہے!" میرا دماغ چکرانے لگا' میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ "کیسی خوشخبری ہے؟"

اس کے رخساروں پر سرخی ابھر آئی' اس کے چہرے کا حسن اور نکھر گیا۔ وہ چادر میں اپنا چہرہ چھپاتی ہوئی بولی۔ "میں تمہارے بچے کی ماں بننے والی ہوں!"

مجھے اس لمحے یوں محسوس ہوا جیسے کنول نے کوئی نوکیلا پتھر میری کنپٹی پر دے مارا ہو۔ میرا سر تیزی سے چکرا گیا اور آنکھوں کے سامنے ایک گہری دھند تیزی سے پھیلتی چلی گئی۔ چند لمحوں تک کچھ بجھائی نہیں دیا۔ جب دھند چھٹنے لگی تو میری نگاہ کنول پر پڑی جس پر حیا کا عجیب سا رنگ چھایا ہوا تھا۔ میں نے اسے دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس لمحے سے پہلے میں نے کبھی کنول کو اس قدر حسین نہیں پایا تھا۔ وہ ایسی بھولی' ایسی معصوم اور اس قدر دل فریب دکھائی دے رہی تھی جیسے اس پر تجلی کی بارش ہو رہی ہو۔ وہ ایک شیریں تصور میں ڈوبی ہوئی شاید انجانے خواب دیکھ رہی تھی۔ جس کی پرچھائیاں اس کے سرخ رخساروں پر کانپ رہی تھیں۔

کمرے میں ایک گہرا سکوت طاری تھا' جو مجھے اپنی وحشت کے زہر سے ڈسنے لگا۔ ہر سمت سے میرے کانوں میں تیز اور وحشیانہ سرگوشی گونج رہی تھی۔ "فرید! کنول تمہارے بچے کی ماں بننے والی ہے۔ تمہارے بچے کی ماں!" میرے کانوں میں گرم گرم سیسہ پگھلتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ میں نے تڑپ کر بے یقینی کے لہجے میں پوچھا۔ "میرے بچے کی ماں؟"

کنول نے بدستور اپنی آنکھیں بند رکھیں۔ اس نے اپنا سر اور جھکا لیا۔ اس کے لہجے میں رس بھرا ہوا تھا۔ "ہاں ہمارا بچہ جو ہماری محبت کا امین اور جذبوں کا سرچشمہ ہے۔"

"نہیں۔ نہیں۔" مجھے اپنے سینے میں ایک خنجر سا اترتا ہوا محسوس ہوا۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" میں نے چیختے ہوئے کہا۔

کنول نے چونک کر آنکھیں کھول دیں اور میری جانب حیرت سے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھا "کیا میں عورت نہیں ہوں؟ کیا میں پتھر ہوں جو تمہارے بچے کی ماں نہیں بن سکتی؟"

کے بہانے کمرہ اندر سے بند کر لو' صرف دو منٹ! اس دو منٹ کے کام کے عوض تمہیں دو ہزار روپے ملیں گے' دو ہزار روپے! جس سے تمہارے بچے خوش حالی کی جھلک دیکھ لیں گے۔ انہیں بہت اچھا کھانے اور پہننے کو مل جائے گا۔ تمہارے کسی قدر دکھ بٹ جائیں گے۔ ان روپوں کے علاوہ تمہیں آخرت میں اس کا صلہ ملے گا۔ اس لیے کہ یہ جرم نہیں ہے۔ انسانیت کی عظیم خدمت ہے۔"

وہ ذہنی کشمکش میں الجھ گیا۔ میں نے فوراً ایک ہزار روپے پرس سے نکال کر اس کے ہاتھ میں تھما دیئے۔ "انہیں جیب میں رکھ لو۔ میں کل تمہیں اسپتال پر ملوں تو تمہاری زبان پر کنول کی موت کی خبر ہونی چاہیے۔"

میں اسے اسپتال کے عقبی حصے پر چھوڑ کر ذہنی سکون کی غرض سے فلم دیکھنے چلا گیا۔ فلم بھی میرا دل بہلا نہیں سکی۔ رات بھی مجھ پر بڑی بھاری رہی اور میں بستر پر کروٹیں بدلتا ہوا کبھی نیند کے قبضے میں آجاتا تو مجھے کنول کا جنازہ دکھائی دیتا۔ دوسرے روز دفتر میں دوپہر تک کا وقت کاٹنا ایک مسئلہ ہو گیا۔ جب میں دو بجے اسپتال کے عقبی حصے میں پہنچا تو وہ مین گیٹ سے ہٹ کر کھڑا تھا اور میری آمد کا بے چینی سے منتظر تھا۔ میں نے تنہائی کی جگہ اسکوٹر روک لیا تو وہ مجھے دیکھ کر دیوانہ وار دوڑتا ہوا آیا۔ اس کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ میں دل ہی دل میں خوش ہو گیا۔ میری رگوں میں مسرتیں پھوٹ پڑی تھیں۔ میں نے اطمینان کا گہرا سانس لیا۔ اس نے میرے پاس پہنچ کر پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان کہا۔ "صاحب جی! مبارک ہو۔"

"تمہیں بھی مبارک ہو۔" میں نے بشاش لہجے میں کہا۔

"تو کیا آپ کو خبر مل گئی؟" اس نے متعجب ہو کر پوچھا۔

"نہیں تو!" میں مسکرا دیا۔ "تمہارا چہرہ بتا رہا ہے کہ خبر کیا ہے۔"

"کنول کو گیارہ بجے ہوش آگیا اور اس کی حالت خطرے سے باہر ہو گئی ہے۔" اس کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ "میں نے آپ سے کہا تھا نا! اسپتال میں بڑے معجزے ہوتے ہیں۔"

لیکن میرے ساتھ معجزہ نہیں ہوا تھا بلکہ مجھے جہنم میں جھونک دیا گیا تھا۔ میں اپنی جگہ دم بخود ہو کر رہ گیا۔

میں نہ چاہتے ہوئے بھی بول اٹھا۔ "کنول! تم ہوش میں ہو! ایک عورت جس کی زندگی میں نہ جانے کتنے مرد ہوا کے جھونکے کی طرح آتے اور گزر جاتے ہوں گے' وہ کس طرح یہ کہہ سکتی ہے کہ یہ بچہ کس کا ہے؟"

"فرید! یہ تم کہہ رہے ہو؟" اس کی آواز گلے میں رندھ گئی۔ اس کی آنکھوں میں ایک وحشت ناک چمک ابھر آئی۔

اس کی کھلی کھلی پیشانی پر ان گنت بل پڑ گئے تو میرے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ اس کی آواز بدستور بھرائی ہوئی تھی۔ "میں نے اپنی زندگی سے اسی روز تمہارے سوا ہر مرد کو نکال دیا تھا جب تمہاری زبان سے محبت کا پہلا لفظ میرے کانوں سے امرت بن کر ٹپکا اور دل کے گوشوں میں اتر گیا۔ تم میری زندگی میں پہلے مرد تھے جس نے مجھے محبت آشنا کیا۔" اس کے اسرار و رموز سکھائے۔ اس کے سینے میں سانسیں بے ترتیب ہو رہی تھیں۔ اس نے یک لخت آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا اور لرزیدگی سے کہنے لگی۔ "تم محبت کے اس صاف ستھرے اور شفاف راستے پر کانٹے کیوں بچھانا چاہتے ہو؟"

میں لرز کر اپنی جگہ منجمد سا ہو گیا۔ میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ نادانستگی میں بویا ہوا بیج یوں نمو پا جائے گا۔ اگر سوچا بھی تھا تو اس کا اتنا احساس نہیں کیا تھا۔ میں نے ایک آخری کوشش اور کی۔ "میں یہ مان لیتا ہوں کہ تم ایک بچے کی ماں بن رہی ہو لیکن اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ وہ میرا بچہ ہے' کسی اور کا نہیں؟"

"تمہیں میری سچائی اور بے گناہی کا یقین نہیں آ رہا ہے!" اس کی آواز رندھی ہوئی تھی۔ "شاید تم نہیں جانتے کہ یہ عورت ہی بتا سکتی ہے کہ اس کے پیٹ میں کس مرد کی نشانی ہے۔"

میں بوکھلا گیا۔ میری نظروں میں مہ جبیں کا دہکتا ہوا سراپا ابھر آیا۔ کنول میرے اور مہ جبیں کے درمیان ایک دیوار بن کر کھڑی ہو گئی تھی۔ جب تک یہ دیوار گر نہیں جاتی میں مہ جبیں کو کسی صورت حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ معاً میرے ذہن میں ایک خیال لپکا اور میں مسکرانے لگا۔ میں کنول کے پاس جا بیٹھا اور اسے محبت پاش نظروں سے دیکھنے لگا۔

کنول نے غیر یقینی انداز سے مجھے دیکھا اور چودھویں کے چاند کی مانند مسکرانے لگی۔ اس نے قریب سرک کر اپنا سا میرے شانے پر رکھ دیا۔ "فرید! خدا کے لئے میرا امتحان

مت لو ورنہ میں مر جاؤں گی۔"

میری تو یہ آرزو تھی کہ کنول ابھی اور اسی وقت مر جائے۔ میں نے اس کے ملائم بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

"کنول! اگر تم اس محبت کی لاج رکھنا چاہتی ہو تو میری ایک بات مان لو۔"

کنول نے یک لخت میرے شانے سے اپنا سر اٹھا کر میری آنکھوں میں جھانکا۔ اس کی بڑی بڑی حسین آنکھوں میں روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ "ایک نہیں' دس باتیں مان سکتی ہوں۔"

میں نے ہچکچاتے ہوئے اپنی پلکیں جھپکائیں۔ "کیوں نہ اس داغ کو مٹا دیا جائے؟"

وہ میرا مطلب اور بات نہیں سمجھی۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور سوالیہ نشان بن گئیں۔ "ہماری محبت پر کون سا ایسا داغ لگ گیا ہے جو تم مٹانا چاہتے ہو؟"

"کیا یہ ہمارے لئے ایک داغ نہیں ہے کہ تم ایک بچے کی ماں بننے والی ہو؟" میری آواز سرسرائی۔ "دنیا کیا کہے گی؟ کتنی انگلیاں تمہاری طرف اٹھیں گی۔ تم بدکار اور فاحشہ کہلاؤ گی' تب تم کیا کرو گی؟ کہاں جاؤ گی؟ سماج کو کیوں کر اور کیسے مطمئن کرو گی؟"

"کیا تم اپنی اور میری محبت کی اس نشانی کو داغ کہہ رہے ہو؟" اس نے دکھ بھرے لہجے میں پوچھا۔

"لیکن ہم دنیا والوں کا منہ بند نہیں کر سکتے۔" مجھے غصہ آ گیا تھا۔ "میں کسی کو اپنی شکل دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا۔"

"تم تو بڑے ڈرپوک اور بزدل ہو!" اس نے پیار سے میرا گال تھپتھپا کر میرا غصہ فرو کرنے کی کوشش کی۔ "تم کیسے مرد جو سماج کا مقابلہ نہیں کر سکتے؟"

میں جزبز ہو گیا' میرے دل کی بات زبان پر آ ہی گئی۔ "تم میں اور مجھ میں بہرحال ایک فرق موجود ہے' تمہیں سماج اور زمانے کی کبھی پرواہ نہیں رہی۔ تم عزت کی خاطر نہیں' دولت کی غرض کے لئے زندہ رہ رہی ہو اور رہنا چاہتی ہو۔ میری پوزیشن بڑی نازک ہے۔"

کنول کے چہرے پر ایک کرب سا پھیل گیا۔ وہ دوسرے لمحے سنبھل گئی۔ اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔ "اس داغ کو مٹانے کی ایک صورت نظر آتی ہے۔"

"کون سی صورت؟" میں نے خوش ہو کر بے تابانہ انداز سے پوچھا اور اسے اپنے بازوؤں میں بھر لیا۔

"ہم دونوں شادی کر لیتے ہیں۔" وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔

شادی! شادی! میری رگوں میں کوئی چیز سن سن کرتی اترتی چلی گئی۔ میرے سینے میں سانسیں الجھنے لگیں۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ میرے بازوؤں میں کوئی ناگن لپٹی ہوئی ہے اور اس کا پھن میری نگاہ کے روبرو لہرا رہا ہے۔

"اس کا سر کچل دو۔" میرے من کے کسی گوشے سے ایک سفاک آواز ابھری۔ "یہ عورت نہیں، ناگن ہے۔ تمہیں زندگی بھر ڈستی رہے گی!"

دوسرے لمحے میرے ذہن میں کوندا لپک گیا۔ میں اس کے منہ پر تکیہ رکھ دوں تو پولیس کو اس کی موت کے فرشتے کا کبھی کوئی سراغ نہیں مل سکے گا۔ میں نے دل میں سوچا کہ اس طرح کی موت کنول کے لئے زیادہ مناسب رہے گی۔

میں نے بڑی آہستگی سے کنول کو بستر پر لٹا دیا۔ یک بارگی کنول نے آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا اور مسکرائی۔ "کیوں فرید! میں ...نے ....." اس کا جملہ ادھورا ہی رہ گیا۔ نہ جانے اس نے کس طرح میری آنکھوں اور چہرے سے میرے دلی ارادوں کو بھانپ لیا۔ وہ خوف زدہ سی ہو گئی۔ اس نے سہم کر مجھے دیکھا۔ "تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"

میں نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی اور زبردستی مسکرایا۔ "میں بالکل ٹھیک ہوں۔ کیا ہوا مجھے؟"

"تم اپنے آپ کو آئینے میں تو دیکھو!" وہ لرزیدہ آواز میں بولی۔ "تمہارا چہرہ یکایک کیسا خوف ناک ہو گیا ہے؟" میں نے سراسیمگی سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ بستر پر اکڑوں بیٹھ گئی۔ "شاید تم شادی کے خیال سے پریشان ہو گئے ہو؟ کیا تم مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتے؟"

میں نے اپنی دونوں مٹھیاں بھینچ لیں۔ مجھ پر دیوانگی کا دورہ پڑ گیا تھا۔ کنول کی نگاہیں میری طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ اس نے میری بدلی ہوئی کیفیت دیکھی تو سہم سی گئی۔ "فرید تمہاری طبیعت بگڑتی جا رہی ہے۔ تم ابھی اور اسی وقت کسی ڈاکٹر کو دکھاؤ۔" وہ پریشان ہو کر تذبذب سے بولی۔ "ٹھہرو، میں نرس کو بلاتی ہوں۔ اس سے مشورہ کر کے کسی اچھے ڈاکٹر

کے بارے میں پوچھ لیتے ہیں۔"

میں اسے روکتا ہی رہ گیا۔ کنول نے اپنا ہاتھ بڑھا کر سرہانے کی جانب اور پاس والی دیوار میں نصب اطلاعی گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔ میں نے اپنا سر پیٹ لیا۔ اس کی ہمدردی نے میرا سارا منصوبہ چوپٹ کر کے رکھ دیا تھا۔ اس میں میری اپنی بھی غلطی تھی کہ میں نے گزرتا ہوا ایک ایک قیمتی لمحہ ضائع کر دیا۔ اب میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ اپنے ارادوں کی تکمیل کرتا۔ نرس کے آنے اور چلے جانے کے بعد بھی میں چاہوں تو کنول کو قتل نہیں کر سکتا تھا' اس لئے کہ نرس کی نظروں میں آنے والا تھا۔ میں نے اسی میں اپنی بہتری سمجھی کہ نرس کے آنے سے پہلے یہاں سے نکل جاؤں۔ میں نے کنول کے قریب پہنچ کر کہا۔ "میں کل سہ پہر تمہارے گھر آ رہا ہوں۔ کل ہی اس موضوع پر بات ہو گی۔ مجھے اس وقت ایک ضروری کام یاد آ گیا ہے۔ خدا حافظ۔"

میں اسے حیران و پریشان اور وحشت زدگی کے عالم میں چھوڑ کر بڑی تیزی سے باہر نکل گیا۔ میں اپنے منصوبے کی وجہ سے نرس کا سامنا کرنا نہیں چاہتا تھا' مبادا کہ وہ میری سرخ سرخ آنکھوں سے میری دلی کیفیت کا اندازہ کر لے۔ میرا بشرہ میری گھناؤنی سازش کو بڑی آسانی سے طشت ازبام کر کے رکھ دیتا۔ وہ مجھے دیکھ کر یقیناً چونک جاتی' نروس سی ہو جاتی۔ شاید وہ خوف زدہ سی ہو کر پل بھر کے لئے سوچتی بھی کہ آخر میری حالت اس قدر حواس باختہ کیوں اور کس لئے ہو رہی ہے۔ پھر جب کنول اپنے بستر پر مردہ پائی جاتی تب یکایک اس کا شکی ذہن میری جانب جا سکتا تھا۔ اسے میرا خیال آتا اور میرا بھیانک چہرہ اس کی نظروں میں گھوم جاتا۔ اسے یہ کہنے میں پل بھر کی بھی دیر نہیں لگتی کہ کنول کو میں نے قتل کیا ہے۔ وہ پولیس کو میرے بارے میں سب سے پہلے اطلاع دیتی۔

میں دل میں طے کر چکا تھا کہ اس داغ کو ہر قیمت پر مٹا دینا چاہیے۔ جو میرے لئے سوہان روح بن گیا ہے۔ اب مجھے جرم کی فکر نہیں رہی تھی۔ میں ہر اس چیز کو بڑی بے رحمی سے اپنے پیروں تلے روند دینا چاہتا تھا جو میری اور مہ جبیں کی راہ میں حائل ہو۔

پہاڑ جیسے گھنٹوں کو میں نے انتہائی اذیت سے کاٹا۔ رات گیارہ بجے میں نے اپنے منصوبے کا آغاز کیا۔ میرے منصوبے کے لئے یہ آخری رات تھی۔ کل دن میں کسی وقت بھی کنول کی چھٹی ہونے والی تھی۔ وہ اپنے گھر چلی جاتی تو مجھے ایک نئی مصیبت کا سامنا کرنا

پڑتا۔ اس وقت میں اس کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے جو کچھ کرنا تھا۔ آج ہی کرنا تھا۔

میں نے اپنا سکوٹر ایک ہوٹل کے سامنے کھڑا کیا جہاں اور بھی بہت سارے سکوٹر کھڑے ہوئے تھے۔ میں ہسپتال کی جانب چل پڑا جو وہاں سے تقریباً" سو گز کے فاصلے پر تھا۔ میرے قدم تقریباً" ڈگمگا رہے تھے۔ میں نے بہ وقت تمام اپنے آپ کو قابو میں کیا ہوا تھا۔ اگر کوئی مجھے گھبراہٹ کے اس عالم میں دیکھ لیتا تو چونکے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ ویسے میں ہسپتال کی حدود میں قدم رکھ کے یہ تاثر دے سکتا تھا کہ میرے کسی عزیز کی حالت بڑی نازک ہے اور میں اسے دیکھنے جا رہا ہوں۔ اس خیال سے میرے دل کو تسلی سی ہوئی۔ اندر داخل ہونے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی' البتہ کنول کے کمرے کی جانب جاتے ہوئے میں بڑا محتاط اور چوکنا تھا۔ یہ خوف بھی دامن گیر تھا کہ کسی شناسا نرس سے راستے میں مڈبھیڑ نہ ہو جائے۔ اس بات کا قوی امکان بھی تھا۔ جب میں نے راہ داری میں قدم رکھا تو وہ سنسان پڑی ہوئی تھی۔ چاروں اطراف گہرا سناٹا طاری تھا۔ مدھم مدھم ٹمٹماتی ہوئی روشنی ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے کسی کو گزرتے نہیں دیکھا اور نہ ہی میں کسی کی نظروں میں آسکا۔

میں نے اچھی طرح سے اطمینان کرنے کے بعد کنول کے کمرے کے دروازے کے پاس رک کر دستے پر ہاتھ رکھا تو میرا ہاتھ بری طرح کانپ رہا تھا۔ میں نے بڑی آہستگی سے غیر محسوس انداز میں دستہ گھمایا' وہ بے حد ہلکی سی آواز کے ساتھ کھل گیا۔ میں نے دروازے کو اندر کی طرف دھکیلا تو وہ چرچرایا۔ میں نے دروازہ اتنا ہی کھولا کہ بہ آسانی اندر داخل ہو سکوں' میں نے اندر جھانک کر دیکھا۔ وہاں صرف زیرو پاور کا بلب جل رہا تھا اور کنول گہری نیند میں غرق تھی۔ اس کا منہ دیوار کی جانب اور اس کی پشت پر میں کھڑا تھا۔ کمرے میں پنکھا پوری رفتاری سے چل رہا تھا اور وہ سر تا پا چادر میں ڈھکی ہوئی تھی۔

میں نے بجلی کی سی تیزی سے اندر داخل ہو کر دروازے کو بڑی آہستگی سے اس طرح بند کیا کہ کھٹکا تک نہیں ہو سکا لیکن ان چند ثانیوں کے عرصے میں میرا جسم پسینے سے پوری طرح بھیگ چکا تھا۔ ایک انجانا خوف میری رگوں میں برف بن کر اترنے لگا تو میں نے دیوار سے اپنی پشت لگا دی۔

میں کسی کمزور اور ناتواں مریض کی طرح اپنے آپ کو لاغر محسوس کر رہا تھا۔ مجھ میں اتنی سکت بھی نہیں رہی تھی کہ فوراً" ہی آگے بڑھوں اور کنول کا قصہ ختم کر دوں۔ مجھے اپنے حواس مجتمع کرنے اور جسم کی طاقت بحال کرنے کے لئے چند لمحے درکار تھے لیکن اندیشے تھے کہ مجھے دہلا رہے تھے۔ بار بار میری نگاہ غیر اختیاری طور پر دروازے کی جانب اٹھ جاتی۔ نرس کی آمد کا سنگین خطرہ بڑھ رہا تھا۔ مجھے شدید الجھن ہو رہی تھی۔ میں نے بادل نخواستہ آگے بڑھ کر کنڈی لگا دی۔

میں کسی بھوکے شیر کے مانند دبے پاؤں بستر کی جانب بڑھا تو میری حالت رعشے کے مریض کی سی ہو رہی تھی۔ میں پلنگ کے پاس کی پشت پر جا کھڑا ہوا۔ میرے دل کی دھڑکنوں میں اور اضافہ ہو گیا۔ میری آنکھوں کے سامنے دھند چھانے لگی تو میں نے اپنے سر کو جھٹکا دیا اور اپنا سرکش ہاتھ کنول کے سرہانے کی طرف بڑھایا۔ پہلے مجھے اس کے چہرے پر سے چادر ہٹانا تھی اور تکیہ بھی نکالنا تھا تاکہ وہ اس کے منہ پر رکھ دوں اور وہ تڑپ تڑپ کر مرجائے۔

میں نے چادر کا ایک کونا پکڑ کر اسے آہستگی سے اٹھایا۔ کہیں گہری نیند سوتی ہوئی قلوپطرہ جاگ نہ جائے۔ چادر ہٹتے ہی میرے ہاتھ اور جسم میں رعشہ سرایت کر گیا' وجود میں ایک ایسی سنسنی دوڑی کہ میں بھونچکا ہو کر رہ گیا۔ نظروں کو یقین نہیں آتا تھا۔ بستر پر کنول موجود نہیں تھی بلکہ تین چادر نرم و ملائم تکیے موجود تھے جنہیں اس طریقے اور انداز سے رکھا گیا تھا کہ اس پر کنول کا دھوکا ہو۔

ان گنت سوالوں کے ساتھ سائیں سائیں کرتا اور چکراتا ہوا دماغ سنبھلا بھی نہیں تھا کہ مجھے یوں محسوس ہوا کہ میری کنپٹی پر کوئی چیز تڑ سے آ لگی ہے۔ جھن جھناتے ہوئے دماغ کا گوشہ گوشہ روشن ہو گیا۔ "خوش آمدید مسٹر فرید احمد!"

کنول کی رسیلی آواز میں ہنسی کا ترنم بھی لہرایا تھا لیکن وہ میری سماعت پر بم کا گولا بن کے پھٹ پڑا تھا۔ میری ذات کے جیسے پرخچے بکھرنے لگے۔ میں نے بدحواس ہو کر دحشت زدہ نظروں سے اس آواز کی سمت دیکھا۔ غسل خانے کے دروازے پر کنول کسی ناگن کے مانند اپنا پھن اٹھائے کھڑی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ابھری ہوئی بور جیسی صاف شفاف چمک' رخساروں کی دمک' لبوں پر بکھرے معنی خیز تبسم اور لہراتے ہوئے سراپا میں

زہر ہی زہر بھرا ہوا تھا۔ میں نے اس کے خوب صورت ہاتھ میں ایک چھوٹا سا پستول چمکتے ہوئے دیکھا تو اپنی جگہ سن ہو کر برف کا تودہ بن گیا۔ میں تو اس وقت پوری طرح منجدھار میں گر کر بے بس ہو چکا تھا۔

کنول' نازک سی شاخ کے مانند لچکتی' لہراتی' بل کھاتی اور مجھ پر ہنسی کا جال پھینکتی ہوئی سوئچ بورڈ کی جانب بڑھی۔ ایک ایک کر کے اس نے سارے سوئچ آن کر دیئے۔ فوری طور پر کمرہ روشنیوں میں نہا گیا۔ میں نے رنگے ہاتھوں پکڑے جانے والے مجرم کی طرح خجالت سے اس کی طرف دیکھا اور جلد ہی اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ میرے ماؤف ذہن میں ایک کوندا لپکا تو میں خوشی سے نہال ہو گیا۔ میں نے مسکرانے کی کوشش کی تو وہ بڑے طمطراق سے بولی۔ "میں تمہارا انتظار کر رہی تھی۔ مجھے معلوم تھا' میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ تم ضرور آؤ گے۔" وہ بولتے بولتے رکی۔ میرے سینے میں سانس اٹکنے لگی۔ "میرے دل نے سچ ہی کہا تھا۔ میرے اندیشے غلط ثابت نہیں ہوئے۔"

میں نے انجان بنتے ہوئے بھول پن سے پوچھا۔ "کنول! تم نے یہ کیا ڈراما اسٹیج کیا ہے؟ آخر اس کی ضرورت ہی کیا تھی؟" میں نے توقف کر کے' محبت پاش نظروں سے اس کی طرف دیکھا تو کنول کی ہنسی بھی جواباً" اور گہری ہو گئی۔ "کیا تم نئے انداز اور طریقے سے میرا استقبال کر رہی ہو؟"

"ہاں!" اس کے لہجے میں طنز بھرا ہوا تھا۔ "بالکل اسی انداز اور طریقے سے جس طرح تم میرے کمرے میں داخل ہوئے۔ کیا تمہاری محبت کا یہ طریقہ کچھ ضرورت سے زیادہ ڈرامائی نہیں ہو گیا ہے۔" وہ پلنگ پر جا بیٹھی لیکن وہ اس طرح سے چوکنا تھی کہ کہیں میں اس پر جھپٹ نہ پڑوں۔ اس کے تیور صاف بتا رہے تھے کہ اگر میں نے ایسی کوئی حماقت کی تو وہ مجھے بخشنے کی غلطی نہیں کرے گی۔ میں ششدر سا ہو رہا تھا کہ کنول کو میرے ارادوں کی بابت کیوں کر اور کیسے علم ہو گیا' یہ راز صرف میرے ذہن میں پوشیدہ تھا۔ وہ مجھے متحیر پا کر کھل کھلاتے ہوئے ہنس پڑی۔ "کیوں فرید؟ ایسی محبت کا لطف ہی کچھ اور ہوتا ہے نا؟ روایتی انداز سے محبت کرنے میں کیا رکھا ہے؟"

"میں تمہاری محبت میں دیوانہ ہو کر چلا آیا ہوں!" میں اپنے دونوں بازو فضا میں پھیلا کر اس کی جانب مجرمانہ انداز سے بڑھا تو اس نے چونک کر مجھے اپنے پستول کی زد میں

لے لیا اور اس کی انگلی لبلبی پر بے تاب ہونے لگی۔ اس نے سنبھل کر ایک خطرناک عورت کے انداز میں اپنا سر ہلایا۔ "نہیں۔ میری جان! آگے مت بڑھو۔ ذرا اپنی فل سپیڈ محبت پر قابو رکھو۔ میں اس رفتار کا ساتھ نہیں دے سکتی ...... تم طوفان بن کے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لینا چاہتے ہو؟ میں تو ایک تنکا ہوں۔ اس طوفان کو کیسے اور کیوں کر سہ سکتی ہوں؟"

میں ٹھٹھک کر رہ گیا۔ اس کے چہرے پر یکایک ابھری ہوئی سفاکی نے میرے قدموں میں جیسے بیڑیاں ڈال دیں۔ اس کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ میرے دل کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے لگے۔ کنول کے یہ تیور میرے لئے دہشت ناک تھے۔ میں مبہوت سا ہو کر اسے دیکھنے لگا تو وہ تمسخر سے بولی۔ "تم نے اپنی محبت کا اظہار نہیں کیا؟" وہ ہنس رہی تھی اور میں ریزہ ریزہ ہو رہا تھا۔

"کنول!" میرے حلق میں گرہیں پڑنے لگیں۔ "آخر یہ سب کیا ہے؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے۔ تم میری توہین کر رہی ہو؟ میری محبت کا مذاق اڑا رہی ہو؟"

"یہ وہ نہیں ہے جو تم نے سوچا تھا!" اس نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ "تم اپنے تئیں محبت کا اور میرا گلا کاٹنے آئے تھے نا؟ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟"

"یہ سب کچھ تم سے کس نے کہا؟ یہ جھوٹ ہے' مجھ پر سراسر بہتان ہے۔" میں اس طرح سے اچھلا جیسے وہ الفاظ نہیں' ڈنگ تھا۔ میری آواز تیز ہونے لگی۔ "تمہیں میری محبت پر شک کیوں ہو گیا ہے؟ کیا تم مجھے فریبی' مکار اور دغاباز سمجھنے لگے ہو؟"

"جان من ذرا آہستہ بولو۔" وہ مجھے دبی ہوئی آواز میں پچکارنے لگی۔ "یہ کوئی ہال نہیں' ہسپتال کا کمرہ ہے۔ کسی نے تمہاری آواز سن لی تا تو ایک نئی افتاد آن پڑے گی۔" پستول اس کے ہاتھ میں جھولنے لگا۔ "تمہارے گھناؤنے ارادوں کے بارے میں مجھے تمہارے علاوہ کون بتا سکتا ہے؟" میں نے بوکھلا کر تعجب سے دیکھا تو سنجیدگی سے کہنے لگی۔ "میں سنتی آئی ہوں کہ دل ایک آئینہ ہوتا ہے لہٰذا دل کی بات ہمیشہ آنکھوں سے جھلک جاتی ہے۔ میں نے جب تمہیں ماں بننے کی خوش خبری سنائی تو تمہارے چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا اس لئے کہ تم مجھ سے محبت نہیں کرتے ہو۔ تم نے اپنی جان بچانے کے لئے پری زاد خانم کے ہاں مجھ سے محبت کا ڈھونگ رچایا۔ تم تو مجھ سے بھی بڑے اداکار ثابت ہوئے۔

میں نے یکایک محسوس کیا کہ تمہاری وحشت زدہ آنکھیں میری محبت کے خلاف چہرے پر نفرتوں کے غبار کو پھیلتے ہوئے دیکھا تو میرے دل پر چوٹ لگی۔ دل نے مجھ سے سرگوشی کی۔ "پگلی! تو محبت کی ان دیکھی راہوں پر اتنی دور کیسے چلی گئی' کیا تو نہیں جانتی تھی کہ مرد تو ایک بھونرے کے مانند ہوتا ہے' وہ کسی ایک کلی اور پھول سے آج تک سیراب نہیں ہوا' وہ تروتازہ کلیوں اور رنگ برنگ پھولوں کے اردگرد منڈلاتا رہتا ہے۔" میں اس کی لمبی چوڑی تقریر سے اکتا گیا۔ وہ اسٹیج پر جیسے اپنے مکالمے دہرا رہی تھی' لیکن اس پر مجھے فریب کا جال پھینکنا تھا ورنہ میں یہاں سے زندہ بچ کر نہیں جا سکتا تھا۔ اس نے توقف کیا تھا تاکہ اپنی الجھی ہوئی سانسوں پر قابو پا کر بولنا شروع کر دے۔ میں نے اس کی خاموشی سے فائدہ اٹھا کر مرتعش آواز میں کہا۔

"کنول! کنول! تم میری باتیں دھیان سے سنو' تمہیں میرے بارے میں غلط فہمی ہوئی ہے۔ تم نے مجھے سمجھنے میں غلطی کی ہے۔"

وہ درمیان میں دخیل ہو کر بھڑک اٹھی۔ "چپ ہو جاؤ فرید! تم مجھے بے وقوف مت بناؤ۔ میں جانتی اور سمجھتی ہوں کہ تم موت کا فرشتہ بن کر آئے ہو۔"

معاً" اس کی آواز بھرا سی گئی تو وہ چپ ہو گئی۔ اس کی آنکھوں کے کناروں میں صاف شفاف موتی چمکنے لگے۔ میں نے اپنا ایک قدم اس کی سمت بڑھایا اور رک گیا۔

"اگر تمہیں اپنے راستے سے ہٹانا مقصود ہوتا تو مجھے ایک نہیں' متعدد مواقع ملے تھے۔" میں اپنی صفائی پیش کرنے لگا۔ "جب تم سنگین حادثے کا شکار ہو کر اس ہسپتال میں آئی تھیں تو تمہیں موت کے منہ میں پہنچانا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔" میں نے دل میں اس خاکروب کو جی بھر کے گالیاں دیں۔ اس کی حماقت کی بدولت مجھے اس بدترین لمحے سے واسطہ پڑا تھا۔

میں اس کے نزدیک پہنچ گیا۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھوں میں اس کا متوحش چہرہ سجا لیا۔ "تم میری زندگی ہو۔" میں تمہیں اپنی آخری سانسوں تک چاہوں گا۔" میں نے اسے بازوؤں کے حصار میں لیتے ہوئے غیر محسوس انداز سے پستول والے ہاتھ پر ایک ضرب سی لگائی لیکن پستول پر اس کے ہاتھ کی گرفت بہت مضبوط تھی۔ جب میں اس کے چہرے پر جھکنے لگا تو وہ تڑپ کر میرے بازوؤں سے نکلی اور دور جا کھڑی ہوئی۔ اس نے کمال

ہوشیاری سے میرے ایک اور جال کے سارے تار کاٹ دیئے تھے۔ میں اسے غافل کر کے اس کے ہاتھ سے پستول چھین لینا چاہتا تھا لیکن وہ مجھ سے بھی کائیاں نکلی۔

اس کے سینے میں سانسوں کا تموج ہو رہا تھا۔ "اگر تم مجھ سے محبت کرتے ہو تو کل ہی مجھ سے شادی کر لو۔ نہیں تو میں یہ سمجھوں گی کہ ......" اس کی آواز اس کا ساتھ نہ دے سکی لیکن اس کا لہجہ اس قدر شدید تھا کہ میرے اعصاب جھنجھنا اٹھے۔ "تم اب تک مجھ سے محبت کا ناٹک کر رہے تھے۔ میں دنیا کے سامنے ناٹک کرتی رہتی تھی لیکن آج خود حقیقی زندگی کا ایک فالتو کردار بن کر رہ گئی ہوں۔" اس کی آواز میں زمانے بھر کا دکھ بھرا ہوا تھا۔

میں نے تذبذب سے اس کی طرف بڑھنا چاہا تو اس نے سراسیمہ ہو کر اپنا پستول میری جانب تان لیا۔ اس کی آنکھیں آگ برسا رہی تھیں۔ "میں کل سہ پہر تک ہسپتال میں رہوں گی۔ کیا تم یہاں ایک قاضی اور دو تین گواہوں کے ہمراہ آ سکو گے؟" اس نے غیر یقینی انداز سے پوچھا۔ "آنٹی کی موت کے بعد اب میرا کوئی گھر نہیں رہا۔ اب میں اس گھر میں جانا بھی نہیں چاہتی ہوں جو اب نصیر کا بن گیا ہے۔"

"مجھے ایک دو دن کی مہلت تو دو تاکہ ....." میں نے اپنا جملہ پورا بھی نہیں کیا تھا کہ اس نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔ "تم دو تین دن کی مہلت کس لئے چاہتے ہو؟"

"میں سوچنا چاہتا ہوں اور پھر مجھے اپنے گھر والوں کو رضامند کرنا پڑے گا۔"

میرا جواب سن کر اس کے ارمانوں پر اوس پڑ گئی تھی۔ اس کے چہرہ بجھ گیا۔ اس نے انکھیں بند کر لیں اور بڑی سختی سے اپنے ہونٹ بھینچ لئے۔ وہ ڈوبتی ہوئی آواز میں بولی۔ "فرید! تم یہاں سے چلے جاؤ۔ میری نظروں کے سامنے سے دور ہو جاؤ۔ میں اپنی محبت کا خون ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی۔ تمہاری باتوں میں فریب کی بو آ رہی ہے۔" وہ بلک پڑی' چند ثانیوں تک بلکتی رہی۔ اس نے مجھے اپنی جگہ منجمد دیکھا تو وہ بھرائی ہوئی آواز میں چیخی۔ "نکل جاؤ! نہیں تو میں ابھی ساری دنیا کو اکٹھا کر لوں گی۔"

میں دروازے کی جانب بڑھتے ہوئے یکبارگی رک گیا۔ "میں کل کسی وقت تمہارے پاس آؤں گا۔ تم اس وقت ہوش میں نہیں ہو۔"

کنول نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ وہ دیوار سے لگی کھڑی ہوئی بے تحاشا روتی

جا رہی تھی۔ میں کمرے سے باہر نکل گیا۔ میں اپنے خیالوں میں غلطاں اپنے سینے پر بوجھ رکھے ہوئے ہسپتال کے لان کے پاس سے گزر رہا تھا کہ پیچھے سے ایک مانوس آواز نے مجھے پکارا۔ "صاحب جی! او صاحب جی! فرید صاحب جی!" میں نے پلٹ کر دیکھا۔ نیم تاریکی میں کوئی آدمی میری جانب تیزی سے دوڑتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ جیسے جیسے وہ شخص قریب آتا گیا۔ میری الجھن بڑھتی گئی۔ جب وہ ہلکی سی روشنی میں آیا تو میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ خاکروب تھا۔ اس نے بڑے ادب کے ساتھ سلام کرنے کے بعد' تعجب اور خوشی کے ملے جلے انداز میں پوچھا۔ "صاحب جی! آپ اتنی رات گئے یہاں کہاں؟ کیا آپ کنول کو دیکھ کر آ رہے ہیں؟"

میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی اثباتی انداز میں سر ہلا دیا۔ اس شخص کو دیکھتے ہی میرا خون کھولنے لگا تھا۔ اگر میرے بس میں ہوتا تو اس شخص کو ابھی موت کی نیند سلا دیتا لیکن میں اس کا بال تک بیکا نہیں کر سکتا تھا۔ اسے دیکھتے ہی میری تیوریاں چڑھ گئی تھیں۔ میں نے تلخی سے جواب دیا۔ "ہاں! میں کنول سے مل کر آ رہا ہوں' کیا تمہیں کوئی اعتراض ہے؟"

اس نے میرے روکھے پن اور کڑوے کسیلے لہجے کا کوئی اثر نہیں لیا اور خوش دلی سے بولا۔ "صاحب جی! کنول جی بہت اچھی طبیعت کی ہیں' وہ جتنی خوب صورت اور نازک سی ہیں جی' ان کے سینے میں ویسا ہی دل دھڑکتا ہے جی!"

"تو میں کیا کروں؟" میں نے جل کر اسے تند لہجے میں جواب دیا۔ ایک جانب میں اپنی ناکامی' کنول کی ذہانت اور چالاکی پر پیچ و تاب کھاتے ہوئے اندر اندر ہی منتشر ہوا جا رہا تھا کہ دوسری طرف یہ کم بخت نہ جانے کہاں سے آ ٹپکا۔ میں نے اس سے پیچھا چھڑا کے یہاں سے جلد از جلد نکل جانا چاہا مگر وہ تو جونک کی طرح مجھ سے چمٹ گیا تھا۔

جب میں تیزی سے سے آگے بڑھنے لگا تو وہ میرے ساتھ قدم ملا کر چلنے لگا۔ "کیا کنول جی نے آج سے نئے ڈرامے کی ریہرسل شروع کر دی ہے؟ وہ مجھ سے کہہ رہی تھیں کہ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اسٹیج کی دنیا میں پھر سے ایک نیا ہنگامہ کھڑا کر دوں گی۔" اس آدمی کے بے تکے سوالات اور باتوں سے میں زچ ہو گیا اور غصے سے کھول کر چلتے چلتے رک گیا۔ میرے کچھ کہنے سے قبل وہ بول اٹھا۔ "صاحب جی! آپ میری بکواس کا برا نہ

مانیں۔ میں آپ سے یہ سب کچھ اس لئے پوچھ رہا ہوں جی کہ کنول جی نے آج ہی مجھ سے ایک پستول منگوایا تھا۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ ڈرامے میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لئے' ریہرسل کے موقع پر حقیقی چیز کا موجود ہونا بھی بہت ضروری ہے۔ کیا ڈائریکٹر صاحب ریہرسل کے لئے پستول نہیں دیتے ہیں' یہ تو بڑی عجیب سی بات ہے نا جی!"

"پستول!" میں چونک کر ٹھٹھک گیا اور چلتے چلتے رک گیا۔ میرے جسم میں غصے کی لہر دوڑ گئی۔ میرے سینے میں ایک آگ دہکنے لگی۔ میں نے اسے تند و تیز نگاہوں سے گھورتے ہوئے منہ بنایا۔ تو یہ ذات شریف اس اصل فساد کی جڑ ہیں۔ اس نے کنول کو پستول فراہم کر کے میرے منصوبے کا بیڑہ غرق کر دیا تھا۔ اگر اس نے کنول کو پستول لا کر نہ دیا ہوتا تو آج کی رات میری زندگی کی یادگار راتوں میں سے ایک ہوتی اور میں اس وقت ایک آزاد پنچھی کی طرح فضا کی وسعتوں میں پرواز کر رہا ہوتا۔ معاً" مجھے ایک خیال بھی آیا کہ کہیں اس نے کنول کو میرے قتل والا منصوبہ تو نہیں بتا دیا تھا جس کے باعث وہ چوکنا ہو گئی ہو۔ اس خیال کے آتے ہی مجھے یوں محسوس ہوا کہ کوئی بھونچال سا آ گیا ہے۔ میں سر تا پا تپنے لگا۔ جبھی تو کنول نے اپنی حفاظت کے لئے ایک پستول خرید لیا تھا۔ اسے دھڑکا سا لگ گیا تھا کہ میں ضرور کسی جرم کی نیت سے آؤں گا اور اس کا اندیشہ پورا ہوا تھا۔

میں نے وحشیانہ انداز میں اس کا گریبان پکڑ لیا اور اسے گھسیٹتا ہوا لان میں لے آیا۔ "سچ سچ بتاؤ' کیا تم نے کنول کو میرا منصوبہ بتا دیا تھا کہ میں اس کی موت آسان کرنے جا رہا ہوں؟" میں نے سفاک لہجے میں پوچھا۔ "تم مجھ سے جھوٹ مت بولنا۔"

وہ بھونچکا ہو کر مجھے پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے پر خوف اور حیرت ابھر آئی تھی۔ چند ثانیوں کے بعد وہ بولا۔ "صاحب جی! کیا میں کوئی پاگل ہوں کہ آپ کی اس نیکی کو ایک مریض پر ظاہر کر دوں۔ یسوع مسیح کی قسم لے لیں جو میں نے اس بارے میں اس سے ایک لفظ بھی کہا ہو؟"

میں اس کا جواب سن کر سرد پڑ گیا۔ طمانیت کی گہری سانس میری رگوں میں اترنے لگی۔ میں نے اس کا گریبان چھوڑ دیا۔ جیسے ہی مجھے پستول کا خیال آیا' میں نے بھڑک کر کہا۔ "تم نے کنول کو پستول لا کر کیوں دیا؟ تم یہ نہیں جانتے کہ تم نے کتنا بڑا جرم کیا ہے؟" اس کا چہرہ سوالیہ نشان بن گیا۔ وہ مجھے ایسی نظروں سے دیکھنے لگا جیسے میں پاگل

ہوں۔ "کیا تمہاری عقل ماری گئی تھی؟" میں بولا۔

"اس میں جرم کی کیا بات ہے صاحب جی!" اس نے سادگی سے پوچھا۔

"ایں!" اس کی احمقانہ بات سن کر میرا منہ کھلا رہ گیا۔

"تمہاری نظروں میں پستول خریدنا اور رکھنا کوئی جرم نہیں ہے؟" وہ گدھا مجھے حیران حیران نظروں سے دیکھے جا رہا تھا۔ جانے کیوں میری باتیں اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں۔ دفعتاً" ایک ڈاکٹر اور نرس کو باتیں کرتے ہوئے گزرتے دیکھ کر میں چپ ہو گیا لیکن میں دانت پیستے ہوئے سوچ رہا تھا کہ اسے ہسپتال کے کسی ویران گوشے میں لے جاؤں اور دونوں ہاتھوں سے اس کا گلا گھونٹ کر مار دوں۔ وہ نرس اور ڈاکٹر کسی قدر دور چلے گئے تو میں نے اسے چبھتی نظروں سے گھورا۔ "احمق آدمی! بغیر لائسنس کے پستول خریدنا اور رکھنا بہت بڑا جرم ہوتا ہے۔ اس کی سزا بہت کڑی ہوتی ہے اور۔" میں اس کے ہونٹوں اور چہرے پر بکھرتی ہوئی مسکراہٹ دیکھ کر یک لخت چپ ہو گیا۔ اس نے اپنا سر کھجاتے ہوئے کہا۔ "صاحب جی! وہ پستول تو نقلی ہے' کیا آپ کو کنول جی نے بتایا نہیں؟"

"وہ نقلی پستول تھا!"

"اف! میرے خدا!" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا اور میں سناٹے میں آ گیا۔ کنول اسٹیج سے کہیں زیادہ حقیقی دنیا کا ایک کامیاب اور عظیم کردار ثابت ہوئی تھی۔ اس نے کتنی مہارت سے مجھے بے وقوف بنا دیا تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ اس قدر شاطر عورت ثابت ہو گی۔ میں اس کے سامنے چاروں شانے چت پڑا ہوا تھا۔ وہ فاتحانہ انداز میں مسکرا رہی تھی۔ میں نے غصے سے اپنی دونوں مٹھیاں کس لیں اور زمین پر پیر پٹخا تو اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے جی' کنول جی نے آپ سے کوئی مذاق کر کے آپ کو ڈرایا ہے۔ وہ پستول میں نے کھلونوں کی ایک دکان سے پندرہ روپے۔" میں نے اس کا جملہ پورا نہیں ہونے دیا' ہاتھ کے اشارے سے اسے چپ کرا دیا۔

"میں سمجھ گیا۔ کنول نے واقعی مجھ سے مذاق کیا ہے۔" میں نے اپنی جیب سے دس روپے کا ایک نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ "میں بھی اسے اس سنگین مذاق کا ایسا مزہ چکھاؤں گا کہ زندگی بھر یاد کرے گی۔" میں بے دھیانی کے عالم میں دانت پیستے ہوئے بڑبڑاتا چلا گیا اور ایک دم سے اس کی موجودگی کا احساس کر کے چونکا۔ "تم کنول سے میری اس

ملاقات کا ذکر بالکل مت کرنا۔ میں اس سے بدلہ لینا چاہتا ہوں۔"

اس نے میرے ہاتھ سے دس کا نوٹ لے کر جلدی سے اپنی جیب میں ٹھونس لیا اور نفی میں سر ہلاتے ہوئے خوشامدانہ لہجے میں بولا۔ "صاحب جی! آپ فکر نہ کریں۔ میں کنول جی کو اس کی ہوا بھی نہ لگنے دوں گا مجھے ان سے کہہ کر کرنا بھی کیا ہے' وہ کل ہسپتال سے اپنے گھر جا رہی ہیں نا جی!"

میں گھر کی جانب جا رہا تھا تو بے ربط سوچوں نے میرا دماغ ماؤف کر کے رکھ دیا۔ کنپٹیوں میں خون آتش فشاں کے لاوے کی طرح ابلنے لگا۔ سارا جسم سن ہوا جا رہا تھا۔ مجھے کوفت ہو رہی تھی کہ میں ایک کھلونے کو نہیں پہچان سکا۔

میں نے گھر پہنچ کر اپنے آپ کو کمرے میں مقید کر دیا۔ رات کے بارہ بج چکے تھے۔ سبھی گہری نیند سو رہے تھے۔ کوئی میرے کمرے میں جھانک نہیں سکتا تھا۔ صرف امی کا ڈر تھا کہ کہیں وہ نہ چلی آئیں کیوں کہ انہوں نے میرا ستا ہوا پریشان چہرہ دیکھا تو وہ متوحش سی ہو گئی تھیں۔ یہ خدشہ سا تھا کہ وہ ممتا کے ہاتھوں مجبور ہو کر میرے کمرے میں نہ چلی آئیں۔ میں اس وقت اپنی شکست کا بدلہ لینے کے لئے ٹھنڈے دل سے سوچنا چاہتا تھا۔ میں ایک شکست خوردہ سپاہی کے مانند بستر پر ڈھیر ہو گیا اور اپنی ناکامی کے اسباب پر غور کرنے اور ان کا جائزہ لینے لگا۔

ایک طرف کنول میری راہ کا سب سے بڑا پتھر بنی ہوئی تھی۔ وہ مجھے اپنی محبت کی آگ میں لپیٹ کر میری ذات کو بھسم کر کے رکھ دینا چاہتی تھی لیکن میں کسی اور کے لئے ایک انجانی آگ میں اندر ہی اندر جل رہا تھا۔ پل پل مہ جبیں کا دہکتا ہوا سراپا میری نگاہوں میں ابھرتا رہتا۔ میں کس قدر وحشت اور کرب سے سوچتا بھی تھا کہ آخر کب تک مہ جبیں کے فراق میں صدیوں جیسے دن گزارتا رہوں گا؟ میں اختر شماری کرنے والے عاشقوں میں سے نہیں تھا۔ مہ جبیں کو جلد از جلد پانے کے لئے دور' بہت دور جانا چاہتا تھا۔ میں اس وقت تک اپنی منزل نہیں پا سکتا تھا جب تک کنول کی زندگی کا چراغ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے گل نہ ہو جائے۔

میرے ذہن میں قتل کا ایک نیا منصوبہ ابھرنے لگا لیکن میں تن تنہا اس ہول ناک جرم کا ارتکاب نہیں کر سکتا تھا۔ سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ اس جرم میں میرا ساتھ کون دیتا۔

اگر وہ ایک دو دن اور ہسپتال میں رہتی تو مجھے کنول کو کسی بہانے قتل کر دینا چنداں مشکل نہیں تھا لیکن وہ کل ہسپتال سے رخصت ہو کر اپنے گھر جا رہی تھی' اسے اب اپنی زندگی اپنے منہ بولے ماموں' نصیر کی پناہ میں گزارنی تھی۔ آنٹی کی ناگہانی موت کے بعد نصیر' کنول کا سرپرست بن گیا تھا۔ اسے کنول کی زندگی محض اس لئے عزیز تھی کہ وہ سونےکے انڈے دینے والی مرغی تھی۔ نصیر ایک خود غرض' لالچی' کمینہ اور بدمعاش آدمی تھا۔ اس نے کنول کی زندگی بچانے کے لئے اپنی دولت اس امید پر داؤ پر لگائی تھی کہ کنول کی صحت یابی کے بعد اپنی رقم مع سود وصول کر لے گا۔ اب وہ کنول کا بلا شرکت غیرے مالک تھا۔ وہ کنول کو اپنے گھر میں ایک قیدی کی طرح رکھے گا تاکہ کوئی ہاتھ کنول کی جانب نہ اٹھ سکے۔ اس طرح نصیر میرے منصوبے میں ایک بڑی رکاوٹ بن سکتا تھا۔ میرا اسے اپنی راہ سے ہٹانا ممکن نہیں تھا۔

پھر ایک منصوبہ اور میرے ذہن میں کوندا بن کر لپکا مگر وہ پہلے والے منصوبے سے کہیں زیادہ ناقص تھا۔ اس پر عمل کرنا سرے سے ہی ناممکن نظر آ رہا تھا۔ میں تو ہر صورت میں یہ چاہتا تھا کہ سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے لیکن میرے سوچنے سے کیا ہو سکتا تھا۔ یہ کوئی گڈے گڑیا کا کھیل نہیں تھا کہ میری ہی جیت ہو جائے۔ میں سوچتا رہا' ہر خیال اور منصوبے پر عرق ریزی کرتا رہا لیکن کوئی منصوبہ میری سمجھ میں نہیں آ سکا۔ رات تیزی سے گزرتی جا رہی تھی۔ میں وہیں کھڑا ہوا تھا جہاں سے چلا تھا۔

صبح بڑی دیر سے جاگا۔ آئینے میں اپنی صورت دیکھی تو اپنے آپ کو پہچان نہ سکا۔ میرا چہرہ بدل کر خوف ناک سا ہو رہا تھا۔ جب میں نے غسل کیا اور کپڑے بدل کر اپنے چہرے کا آئینے میں بغور جائزہ لیا تو مجھے یوں محسوس ہوا کہ میری شکل کسی حد تک لوٹ آئی تھی۔ آئینہ بھی جیسے گواہی دینے لگا کہ میں واقعی فرید احمد ہوں لیکن وحشت اور غم کی پرچھائیاں میرے بشرے پر سے مٹ نہیں سکی تھی۔ جب میں ناشتہ کرنے کی غرض سے کھانے کی میز پر پہنچا تو رضیہ میرے لئے ناشتہ لے آئی۔

جانے آج مجھے کیا ہوا تھا کہ رضیہ پر میری نگاہ پڑی تو میں چونک سا گیا۔ اس کے سراپا نے مجھے ڈس لیا تھا۔ وہ شاید شاپنگ کی غرض سے یا اپنی کسی سہیلی سے ملنے کے لئے جا رہی تھی۔ وہ کسی دلہن کی طرح بجی ہوئی تھی۔ لباس کی تراش خراش میں جسم کی نمائش

ہو رہی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ رضیہ میری نظروں کے سامنے پوری طرح بے حجاب کھڑی ہوئی ہے۔ اس کی آنکھوں میں ارمان بھرے خواب کا عکس ابھر رہا تھا۔ رخساروں کی سرخی میں تمتماہٹ سی تھی۔ اس کے چہرے پر دل کی ساری کیفیت نمایاں ہو رہی تھی۔

میں رضیہ کو دیکھ دیکھ کر حیرت زدہ سا ہوا جا رہا تھا کہ اسی اثناء میں رئیسہ ٹرالی دھکیلتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی' میرے وجود پر ایک اور زہریلا ڈنگ لگا۔ اس نے باریک لباس پہنا ہوا تھا۔ روشنی کے ایک زاویئے پر یوں لگا کہ اس کے جسم پر کچھ ہے ہی نہیں! میں باوجود کوشش کے ان دونوں کی جانب اپنی نگاہ نہیں اٹھا سکا' جیسے وہ نہیں میں ان کا مجرم ہوں۔ اس سے پہلے میں نے کبھی اپنی بہنوں کو ان نظروں سے نہیں دیکھا تھا۔ اگر انہیں اس عالم میں دیکھا تو محسوس نہیں کیا تھا۔

میں اپنی دونوں بہنوں کے جسموں کی آلودگی کے بارے میں جیسے جیسے سوچتا رہا تھا' ویسے ویسے میری رگوں میں خون کی حدت بڑھتی رہی تھی۔ میں اندر ہی اندر کسی تنور کے مانند تپنے لگا۔ میں نے جلدی سے چائے کا ایک گھونٹ حلق میں اتارا تو یوں محسوس ہوا جیسے میں انگارے نگل رہا ہوں۔ اس احساس سے میرے جسم پر کانٹے سے چبھنے لگے کہ وہ کتنے لوگوں کی ہوس ناک نظروں کا نشانہ بنتی رہتی ہوں گی۔ جوان' دل پھینک اور آوارہ قسم کے لڑکے ان پر فقرے چست کرتے ہوں گے۔ چھیڑ چھاڑ ہوتی ہو گی اور میلوں تک تعاقب کیا جاتا ہو گا۔ بازاروں اور سڑکوں پر ان جسموں کو چھونے کے لئے انہیں دھکے دیئے جاتے ہوں گے۔ کتنے ہی ہاتھ سرسراتے ہوئے بھٹکتے ہوں گے۔ قدم قدم پر انہیں ذلالت کا سامنا کرنا پڑتا ہو گا؟ آج میری آنکھوں کے سامنے سے یکایک پردہ کیا ہٹا' طرح طرح کے احساسات نے مجھ پر یورش کر دی۔ میں کنول اور مہ جبیں کو بھول کر رضیہ اور رئیسہ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ میرا دماغ سن سنانے لگا۔ کیا امی اندھی ہو گئی ہیں؟ انہیں اپنی جوان بیٹیوں کی بے حجابی دکھائی نہیں دیتی؟ انہیں کچھ نظر نہیں آتا؟ وہ ان لڑکیوں کی ماں ہیں' کوئی غیر یا اجنبی عورت نہیں ہیں۔ آخر وہ پتھر کی بنی ہوئی کیوں ہیں؟ اپنی بیٹیوں کو ٹوکتی کیوں نہیں ہیں؟ میں انہی خیالات کی یورش سے گھول رہا تھا کہ امی اپنا پان دان لے کر میز پر آ گئیں' میرا متغیر اور متوحش چہرہ دیکھ کر گھبرا گئیں۔ "خیریت تو ہے بیٹے؟ تم آج بہت پریشان دکھائی دے رہے ہو؟" امی کی مزاج پرسی نے میری دونوں بہنوں کو کچھ

احساس دلایا تو وہ دونوں میری کرسی کے اردگرد کھڑی ہو گئیں۔

"بھائی جان! میں بھی آپ کو سوچوں میں گم اور پریشان ہی دیکھ رہی تھی۔" امی نے اپنی بات ختم کی تو رئیسہ بول اٹھی۔ "بھائی جان! میں آپ کا سر دبا دوں۔"

وہ دونوں میرے اس قدر قریب کھڑی ہوئی تھیں کہ میں ایک انجانی اذیت سے تڑپ سا اٹھا' جیسے میں اس آلودگی کی تپش بھی برداشت نہ کر سکوں گا۔ جانے میری سوچ اور میری غیرت کو کیا ہو گیا تھا کہ میں اپنی جگہ سے اٹھ کر ان دونوں کی بے حجابی پر کوئی چادر بھی نہیں ڈال سکتا تھا' ایک لفظ بھی بول کر ٹوک نہیں سکتا تھا۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر آنکھیں بند کر لیں۔ "رات نیند نہیں آ سکی تھی۔ سر میں ہلکا ہلکا سا درد ہو رہا ہے۔ تم دونوں یہاں سے جاؤ۔"

انہیں کہیں جانے کی جلدی تھی۔ اس لئے وہ دونوں چلی گئیں۔ امی مجھے ٹکٹکی باندھ کر دیکھے جا رہی تھی۔ مجھے اپنی طرف متوجہ پا کر بولیں۔ "تم رات بھی کسی قدر پریشان اور وحشت زدہ سے آئے تھے؟ خیریت تو ہے نا؟ کسی سے لڑائی جھگڑا تو نہیں ہو گیا؟" وہ رک کر پاندان میں سے پان نکالتی ہوئی پوچھنے لگیں۔ "آخر تم کس بات پر الجھے ہوئے سے دکھائی دے رہے ہو؟"

میرے سینے میں ایک بگولا سا اٹھا لیکن میں باوجود کوشش کے اپنے دل کی بات زبان پر نہیں لا سکا۔ میرے پاس کہنے کے لئے تھا ہی کیا؟ میرا دامن بھی تو کسی آلودگی سے پاک نہیں تھا۔ میں کبھی اپنے کردار پر قادر نہیں رہا تھا۔ میری ماں' بہنیں' بھائی اور محلے کے لوگ جانتے تھے کہ میں شرابی' جواری' زناکار اور رشوت خور ہوں۔ میری داستانیں اس محلے کے ایک ایک گھر میں دہرائی جاتی تھیں۔ اگر میرے پاس دولت نہیں ہوتی تو کب کا ہم لوگوں کو اس محلے سے نکال دیا جاتا۔ دولت کی ریل پیل کے باعث ہر کسی نے تعلقات قائم کر رکھے تھے۔

دفتر آیا تو میرے ذہن پر کنول پھر سے مسلط ہو چکی تھی۔ میں بڑے کرب سے سوچ سوچ کر پاگل ہوا جا رہا تھا کہ آخر اس سے کس طرح نجات پا سکوں' کیوں کہ میرے ذہن میں کوئی منصوبہ مکمل نہیں ہو سکا تھا۔

ایک بجے کے قریب میرے ساتھی لنچ کرنے چلے گئے۔ میں اپنے کمرے میں تنہا بیٹھا

ہوا ایک فائل میں اپنا سر کھپا رہا تھا۔ فائل کے ہر کاغذ پر کنول کا چہرہ ابھرنے لگتا۔ میں نے غصے سے کھول کر فائل بند کر دی اور اس پر ایک مکا دے مارا۔ معاً میری نگاہ سامنے کی جانب اٹھی، میں ہڑبڑا سا گیا۔ میری میز کے سامنے ایک عورت کھڑی ہوئی تھی۔ نفیس اور شائستہ! اس کی عمر تیس اور پینتیس سال کے درمیان ہو گی' فراخ پیشانی' خم دار بھنویں' بڑی بڑی حسین آنکھیں' گہری سیاہ چمکتی ہوئی پتلیاں! اس کے حسین چہرے پر دمک اور سرخی پھوٹی پڑ رہی تھی۔ اس کے تراشیدہ لبوں پر تبسم دھیمے دھیمے سروں میں گنگنا رہا تھا۔ اس کا سراپا اس قدر دل کش اور باوقار تھا کہ میں مرعوب سا ہو گیا۔

"کیا میں بیٹھ سکتی ہوں؟" اس نے کھنکتے ہوئے پوچھا۔

"ضرور! ضرور!" میں نے کرسی کی جانب اشارہ کیا لیکن ایک خیال سا آیا کہ کہیں وہ غلطی سے میرے کمرے میں تو نہیں آ گئیں۔ وہ موٹی آسامی دکھائی دیتی تھی۔ حسین بھی تھی۔ اس کی پوشاک اور وضع قطع بتا رہی تھی کہ وہ کسی اعلیٰ قسم کی فرم میں کلیدی عہدے پر فائز ہو گی یا ذاتی طور پر کسی بڑے ادارے کی مالک ہو گی۔ وہ اسی لائق نظر آ رہی تھی۔ اس میں ایک حاکمانہ انداز نمایاں تھا۔ اس وقت میرا ذہن کنول کے باعث بے حد الجھا ہوا اور پریشان ہو رہا تھا' اسی لئے میں اس وقت یہ اندازہ نہیں کر سکا کہ وہ کس ادارے کی جانب سے آئی ہے۔ کوئی خاص اور سنگین نوعیت کا کیس ہو سکتا تھا' تب ہی وہ بہ نفس نفیس آئی تھی' اپنے جلوؤں میں بجلیاں بھر کے تاکہ دیکھنے والوں کو جلد از جلد خاکستر کر دے' لیکن میں نے اسے اور نگاہ سے دیکھا اور اپنا شکار سمجھ کر چارا ڈالنے کی سوچنے لگا۔ وہ میری دونوں جیبیں بھر سکتی تھی۔ میں ایک دم مالا مال ہو سکتا تھا۔ میرے نزدیک ایسی عورت کو دونوں ہاتھوں سے لوٹنا ثواب کا کام تھا۔

اس نے میرا رسمی اور مہذبانہ انداز سے شکریہ ادا کیا اور کرسی پر تمکنت سے بیٹھ گئی۔ یکبارگی ہم دونوں کی نگاہیں چار ہوئیں تو اس کے چہرے پر دمک بڑھ گئی لیکن میری پیاسی نگاہ اس کافر کے پرشکوہ اور ہیجان خیز سراپا پر بھٹکتی اور للچاتی رہی۔ وہ عمر کے اس حصے میں پہنچ کر بھی جوان لڑکیوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ پرکشش اور گداز دکھائی دے رہی تھی۔ معاً میری عجیب سی حالت ہونے لگی۔ پیشانی کے دونوں کناروں کی رگیں پھڑکنے لگیں اور آنکھوں کی پتلیوں پر دھند سی چھانے لگی۔ رگ و پے میں چنگاریاں بھڑکتی جا رہی

تھیں۔ مجھ میں جیسے ضبط کا یارا نہیں رہا۔ میں اپنی نگاہوں کو کس سمت لے جاؤں، فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔ اس نے مجھے اس بے باکی سے اپنی طرف دیکھتے ہوئے پا کر کوئی اثر نہیں لیا اور نہ اس نے ناگواری محسوس کی۔ وہ دن میں نہ جانے کتنے ہی مردوں کی نگاہوں میں جکڑی جاتی ہو گی، جبھی تو وہ ذرہ برابر بھی نروس نہیں ہوئی البتہ اس نے دل فریب مسکراہٹوں کا ایک ایسا جال مجھ پر پھینکا کہ میں اس میں جکڑ کر رہ گیا۔ میں اس لمحے کنول اور مہ جبیں کو یکسر بھول گیا اور اس کا ایسا اسیر بنا کہ اپنے آپ کو بھی فراموش کر بیٹھا۔ میرا سینہ دھک دھک کرنے لگا۔

کرسی میں اس کا گداز سراپا لچکا، کسمسایا اور مرتعش سا ہوا۔ وہ پرس اپنی گود میں رکھ کے جھکی تو ساڑھی کا پلو سرسراتا ہوا گود میں بکھر گیا۔ بجلیوں کے نظارے سے میری آنکھیں دھندلا گئیں اور میں پتھر کا ہو کر رہ گیا .... جب وہ ساڑھی کا پلو اپنے شانے پر درست کرنے لگی تو اس کی نگاہ غیر ارادی طور پر میری جانب اٹھی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایک شوخی ابھر رہی تھی۔ وہ پرس میں سے اپنا تعارفی کارڈ نکال کر میری جانب بڑھانے لگی۔ میری نگاہ اس کے سڈول ہاتھ پر جم گئی۔ "آپ ہی مسٹر فرید ہیں نا؟" اس کی ترنم خیز آواز کا زیر و بم میرے کانوں میں کسی مدھر نغمے کے مانند لہرایا تو میں چونکا۔ میرے جسم میں فرحت کی لہر دوڑ گئی۔ میں اس کی رسیلی آواز میں اپنا نام سن کر بہت خوش ہوا تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ سے کارڈ لے کر اس پر ایک اچٹتی نظر ڈالی۔ اس پر ایک نام لکھا ہوا تھا۔ "ڈاکٹر مس یاسمین شہریار۔"

اس کا نام پڑھتے ہی میرے ذہن میں کراچی شہر کے مشہور و معروف کلینک کی وسیع و عریض اور پرشکوہ عمارت ابھر آئی جو جدید طرز تعمیر کا ایک نادر نمونہ تھی۔ میں اپنی نظروں کے سامنے اس کلینک کی بانی، مالک کو دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ میرے لئے یہ شدید حیرانی کی بات تھی کہ وہ بذات خود چلی آئی تھی جب کہ وہ اپنے وکیل یا کسی بھی آدمی کو بھیج سکتی تھی لیکن اس کا یوں آنا اس لئے حیرت انگیز تھا کہ شاید وہ اپنا کیس الجھانا نہیں چاہتی تھی۔ میں نے تعارفی کارڈ اپنی نظروں کے سامنے میز پر رکھ لیا اور اس کی حسین آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ "فرمایئے! میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"میں آپ کو ایک زحمت دینا چاہتی ہوں!" اس نے نشیلی آواز میں جواب دیا اور

محتاط سی ہو کر کمرے کا سرسری جائزہ لینے لگی۔ کمرے میں کسی کو موجود نہ پا کر اس کے چہرے پر طمانیت سی ابھر آئی۔ "کیا یہ اچھا نہیں ہو گا کہ ..." اس نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ کر اپنی سڈول کلائی میں بندھی سیاہ رنگ کی گھڑی میں وقت دیکھا اور تبسم بکھیرتی ہوئی بولی۔ "آپ میرے ساتھ چل کر لنچ کر لیں تاکہ اس دوران میں اطمینان سے گفتگو ہو سکے۔" وہ توقف کر کے میرے جواب کا انتظار کرنے لگی۔ میں اس لمحے لنچ کیا' جان تک دینے کو تیار تھا لیکن اس خیال اور خوف کے تحت ہچکچانے لگا کہ کہیں اس کے ساتھ جانے میں طرح طرح کی قیاس آرائیاں نہ ہونے لگیں۔ یوں بھی میں پہلے ہی سے دفتر والوں کی نظروں میں کھٹکتا تھا۔ جن لڑکیوں اور عورتوں کے ٹیلی فون میرے نام آتے تھے' انہوں نے مجھے بہت زیادہ بدنام کر رکھا تھا۔ رہی سہی کسر کنول نے دفتر میں قدم رکھ کے پوری کر دی تھی۔ لوگ مجھے یاسمین کے ہم راہ دیکھ کر اور اس کے ساتھ باہر نکلتے دیکھ لیتے تو ان کے سینوں پر سانپ لوٹ جاتے' مجھے تن تنہا اتنا بڑا شکار ہضم کرتا ہوا دیکھ نہیں پاتے' بلاوجہ اپنا حصہ طلب کرتے' میرے انکاری ہونے پر رخنہ ڈالتے۔ ویسے بھی اس برق رفتار دور میں ایک ڈاکٹر اور قصاب میں کوئی فرق نہیں رہا تھا۔ ایک قصاب قابل معافی اس لئے ہے کہ وہ جانوروں کا گلا کاٹتا ہے جب کہ ڈاکٹر مریضوں کا! بعض ڈاکٹروں نے اس باعزت اور مقدس پیشے کو ایک منافع بخش کاروبار بنا رکھا ہے۔

مس یاسمین شہریار کا کلینک بھی شفاخانہ نہیں' ایک مذبح تھا' جہاں مریضوں کا علاج کم اور ان کا گلا زیادہ کاٹا جاتا تھا۔ میرے اپنے جائزے کے مطابق اس کلینک کی یومیہ آمدنی پچیس تیس ہزار سے کسی طرح کم نہیں تھی۔ یہ خالص منافع تھا۔

یاسمین شہریار کی فائل میرے پاس موجود تھی۔ جب میں اس کلینک کا جائزہ لینے اور حسابات کی جانچ پڑتال کرنے گیا ہوا تھا' میرے ساتھ وہاں کے عملے نے بڑی بدسلوکی کی تھی۔ مجھے دھمکیاں دے کر گیا تھا کہ میں اس عمارت سے نکل جاؤں۔ یاسمین شہریار نے بھی مجھ سے ملنے سے انکار کر دیا تھا۔ میں نے بھی پھر اپنے دل کی بھڑاس خوب نکالی۔ میں ایک دو دن تک اس کلینک کی عمارت کے باہر کھڑے ہو کر مریضوں سے انٹرویو لیتا رہا۔ شہریار کلینک جو ڈیفنس میں واقع تھا' اس نے تین چار سال سے ٹیکس ادا نہیں کئے تھے۔ میرے ساتھ کیا گیا برا سلوک انہیں مہنگا پڑا تھا۔ میں نے ایسی رپورٹ مرتب کی تھی کہ

اعلیٰ افسران بھی کچھ نہیں کر سکتے تھے۔

یاسمین شہریار نے جب یہ دیکھا کہ اس کا کیس ایک ایسے نازک مرحلے میں داخل ہو چکا ہے کہ اب کا اثر و رسوخ کچھ کام نہیں کرے گا تو وہ کچے دھاگے میں بندھی چلی آئی تھی۔ یہ خود غرض' سنگدل اور لٹیرے لوگ ستم زدہ لوگوں کی جیبیں خالی کرنے سے کسی طرح نہیں چوکتے تھے لیکن اپنی جیب سے ایک دمڑی بھی نکالتے ہوئے ان کی جان جاتی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ ایک دن یہ ہونا ہے۔ وہ میرے ہاتھوں سے بچ نہیں سکے گی۔ آج ایسا ہی ہوا تھا۔ وہ پوری طرح میری دسترس میں تھی' کسی مفتوحہ قوم کے مانند! میں ایک فاتح جرنیل کی طرح بڑی شان سے اس کے روبرو بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اس لئے حواس باختہ ہو گئی تھی کہ لاکھوں روپے کا انکم ٹیکس' ایک عفریت بن کر اسے نگلنے والا تھا۔

وہ مجھے سوچوں میں گم پا کر رسیلے لہجے میں بولی۔ ''مسٹر فرید احمد! اگر آپ اس وقت مصروف ہیں تو رات کا کھانا ساتھ کھالیں۔''

ایک طرح سے مجھے ڈنر کا پروگرام ہی بہتر لگا۔ اس حسین قربت سے رات اور کھانے کا لطف دوبالا ہو جاتا۔ معاً'' مجھے کنول کا خیال آیا تو میرے دل پر ایک ضرب سی لگی اور میں تڑپ سا گیا۔ اس کی ذات میرے دل و دماغ پر چٹان کا بوجھ بن کر جم گئی تھی۔ میں جب تک کنول کا قصہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم نہیں کر دیتا' میں خوش اور بے فکر نہیں رہ سکتا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں؟ میں یاسمین جیسا شکار ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہتا تھا۔ روز روز ایسے شکار ہاتھ کہاں لگتے تھے جس میں وارے نیارے ہو جاتے ہوں۔

میرا دل اندر سے بجھنے لگا۔ میں نے الجھتے ہوئے بڑے کرب سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ بغور میرا بشرہ پڑھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں سنجیدگی امڈی ہوئی تھی۔ میں نے افسردگی سے نظریں چار کیں تو دفعتاً'' ایک خیال بجلی بن کر ذہن کی تاریک گلیاں روشن کر گیا اور میں خوشی سے اچھل سا گیا۔ اس نے میری یکایک بدلتی ہوئی کیفیت کو دیکھا اور محسوس کیا تو وہ مسکرانے لگی۔

مجھے اپنی پریشانیوں کا حل مل گیا تھا' جیسے یاسمین شہریار میرے زخموں کا مرہم تھی' اب مجھے کنول کو اپنے راستے سے ہٹانے میں کوئی دشواری نہیں تھی۔ یاسمین میری نجات کا

راستہ تھی۔ میں نے اندرونی مسرت کو دباتے ہوئے کہا۔ "میرے خیال میں لنچ کا پروگرام زیادہ مناسب رہے گا!"

لوہا اس قدر گرم تھا کہ اس پر ایک بھرپور چوٹ لگانے کی ضرورت تھی۔ مجھے فوراً ہی آمادہ پا کر اس کے رخساروں پر ایک تیز سرخی کی لہر ابھری۔ وہ یکایک اپنی کرسی سے نکل کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ "چلئے!" اس نے شیفتگی سے کہا۔ "نیچے میری کار کھڑی ہوئی ہے۔ ہم دونوں کسی اچھے ہوٹل میں چل کر لنچ کرتے ہیں۔"

میں نے قدرے تامل کے بعد کہا۔ "کسی وجہ سے میرا آپ کے ساتھ باہر نکلنا مناسب نہیں ہے‘ آپ مجھے ہوٹل کا نام بتا دیں‘ میں وہاں پہنچ جاؤں گا۔"

وہ میرا مدعا سمجھ گئی تھی۔ اس نے اپنے ذہن پر زور دے کر سوچنا شروع کیا۔ وہ بار بار ساڑھی کا پلو گرا کے شانے پر درست کرتی جا رہی تھی۔ اس نے زیر لب تبسم سے کہا۔ "آپ ہوٹل شیرٹن پہنچ جائیں‘ میں آپ کا انتظار کروں گی۔"

جب میں سکوٹر پر بڑی تیزی سے ہوٹل کی جانب جا رہا تھا تو یاسمین کا سراپا میرے اعصاب پر سوار تھا۔ یاسمین کے کردار اور اس کے کلینک کی شہرت اچھی نہیں تھی۔ میں نے بارہا سنا تھا کہ اس نے محض اس لئے شادی نہیں کی کہ وہ یکسانیت سے جلد اکتا جاتی ہے۔ اس کے بارے میں یہ بھی مشہور تھا کہ وہ بڑی لالچی اور دولت کی بھوکی ہے۔ اس کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ وہ بے شمار گھرانے تھے جن کی لڑکیاں اپنے گناہوں کی پردہ پوشی کے لئے اس کے پاس آتیں اور منہ بولی فیس ادا کرتیں۔

پھر بھی یاسمین شہریار سے ملنے‘ دیکھنے اور بات کرنے کے بعد مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس قماش کی عورت ہے‘ اس کے حسین چہرے کے پیچھے ایک گھناؤنا چہرہ چھپا ہوا ہے۔

میں نے یاسمین شہریار کو اپنے انتظار میں کسی قدر بے تاب اور مضطرب پایا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی خوشی سے کھل اٹھی۔

یاسمین شہریار نے پر تکلف کھانے کا آرڈر دیا تو دیکھتے ہی دیکھتے میز پر انواع و اقسام کے اتنے سارے کھانے چن دیئے گئے تھے کہ مجھ جیسے چار پانچ خوش خوراک خوب سیر ہو کر کھائیں تو پھر بھی خاصا کھانا بچ جائے۔ کھانے کے دوران میں وہ‘ میرے چہرے کو ٹکٹکی

باندھ کر دیکھے جا رہی تھی' جیسے مجھے تول رہی ہو۔ غالباً" وہ میری وجاہت سے متاثر ہو رہی تھی۔ ایک مرد کو جانچنے اور پرکھنے کا اس کے پاس اپنا کوئی پیمانہ ہو گا۔ جب میں نے کھانے سے فراغت حاصل کر لی اور بیرا برتن سمیٹ چکا' تب اس نے کسی قدر پس و پیش کے بعد خجالت کے انداز میں کہا۔ "مسٹر فرید احمد! مجھے اس روز کے واقعے پر بڑی شرمندگی ہے۔" میں نے انجان بن کر تحیر زدہ ہو کر اسے دیکھا تو اس پر گہری سنجیدگی طاری ہو گئی۔ میں نے بھولپن سے پوچھا۔

"آپ کس واقعے کا تذکرہ کر رہی ہیں؟"

"میرے کلینک پر میرے سٹاف نے آپ کے ساتھ جو ناروا سلوک کیا تھا' میں اس پر سخت نادم ہوں!" وہ خجل ہو کر بولی۔ "جب مجھے اس واقعے کا علم ہوا تو میں اپنے سٹاف پر بہت بگڑی۔" میں زیر لب مسکرانے لگا تو اس کے چہرے پر ندامت کی پرچھائیاں ابھرنے لگیں۔ "میں نے اپنے سٹاف کو ہدایت کر دی تھی کہ ائندہ آپ کبھی آئیں تو وہ آپ سے اپنے طرز عمل کی معافی مانگیں اور آپ سے پورا پورا تعاون کریں۔"

"وہ بھولا بسرا واقعہ آج بھی آپ کے ذہن میں محفوظ ہے؟" میں نے انجان بن کر اس پر چوٹ کی۔ "حالانکہ اس واقعے کو مجھے یاد رکھنا تھا۔ میں تو اسے جانے کب کا بھول چکا ہوں۔" میں نے اس کی آنکھوں میں ابھرتی ہوئی وحشت کو دیکھ کر سرگوشی کے انداز میں کہا۔ "آج آپ اس کا تذکرہ کیوں لے بیٹھیں؟ اس واقعے کو بیتے ہوئے ایک سال کا عرصہ ہو چکا ہے۔"

میرے اس جواب پر وہ سٹپٹا گئی اور حواس باختہ ہو کر کہنے لگی۔ "آپ جانتے ہیں کہ ایک کامیاب ڈاکٹر کو کس قدر مصروف رہنا پڑتا ہے۔ میں بھی رات دن مصروف رہتی ہوں۔" اس نے اپنے ہواس پر کسی قدر قابو پا لیا تو ایک گہرا سانس لیا۔ "لیکن مجھے فرصت ہی نہیں ملتی تھی کہ آپ سے ذاتی طور پر مل کر معذرت کر لوں۔"

"تو گویا آج آپ کو فرصت ملی ہے؟" میں نے شوخی سے پوچھا۔

"آپ جو چاہیں سمجھ لیں یا۔" اس کی آنکھوں میں وارفتگی کے چراغ جلنے لگے۔ میں نے اپنا دل تھام لیا۔ "جو سزا چاہیں دے لیں۔"

"سزا؟ اور میں آپ کو دوں؟" میں نے تعجب سے کہا۔

اس نے میری بات کا جواب نہیں دیا اور اپنے پرس میں سے ایک پھولا ہوا لفافہ نکال کر میرے سامنے رکھ دیا۔ میں نے حیرت سے لفافے کو اور سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ "یہ کیا ہے؟"

"آپ کی ناراضگی دور کرنے کے لئے ایک حقیر نذرانہ!" وہ سادگی سے بولی۔ "اگر آپ اسے قبول کرلیں گے تو میں سمجھوں گی کہ آپ نے مجھے معاف کردیا۔"

"آخر کس بات کی آپ معافی مانگ رہی ہیں!"

"آپ مجھے مزید شرمندہ نہ کریں۔ میں پہلے ہی سے بہت نادم ہوں۔"

"آپ یقین کریں کہ میں آپ سے قطعی ناراض نہیں ہوں۔"

"جی نہیں۔" اس نے پیار بھرے لہجے میں تکرار کی۔ "آپ کی ناراضگی ایسی ویسی نہیں بلکہ بڑی شدید ہے۔ میں تو آپ کی اس ناراضگی سے بہت خوف زدہ ہوں۔"

میں سمجھ گیا کہ وہ کہنا کیا چاہتی ہے لیکن میں اسے یہ تاثر دیتا رہا کہ اس کی پہیلی میری سمجھ سے بالاتر ہے۔ میں نے متحیر ہو کر پوچھا۔ "میں اپنی ناراضگی واپس کیسے لے سکتا ہوں؟"

آپ چاہیں تو کیا ممکن نہیں ہے؟" وہ ٹھنکتی ہوئی کہنے لگی۔ "آپ اس لفافے کو قبول کر کے میری طرف سے دل صاف کرلیں۔ میں صرف اتنا چاہتی ہوں کہ مجھے اتنی بڑی سزا نہ دی جائے۔" اس کا لہجہ ایک دم سے شوخ ہو گیا۔ "آپ بڑے سنگدل ہیں؟"

"کیا میں اپنا جرم دریافت کر سکتا ہوں؟"

"میں اسے جرم نہیں' ناراضگی کہوں گی۔" اس نے شگفتگی سے جواب دیا۔ "کیا لاکھوں روپے کا انکم ٹیکس محض انتقام کی غرض سے نہیں لگایا گیا۔" میں اس کی بات سن کر غیر اختیاری طور پر ہنس پڑا تو وہ سنجیدہ ہو گئی۔ "پلیز' فرید صاحب! کچھ تو خیال کریں۔ میں ٹیکس کی مد میں اتنی بڑی رقم کیسے بھر سکتی ہوں؟"

"آپ کے نزدیک ٹیکس کی ادائیگی کوئی وقعت نہیں رکھتی ہے؟" میں نے پوچھا۔ "میرے خیال میں ٹیکس بہت کم لگایا گیا ہے۔"

یکبارگی اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔ اس نے جزبز ہو کر کہا۔ "کیا آپ کے نزدیک ایک ڈاکٹر کو سپر ٹیکس کے پھندے میں جکڑ دینا سراسر زیادتی' ناانصافی اور ظلم

نہیں ہے۔" میرے لبوں پر ابھرتی ہوئی غیر اختیاری مسکراہٹ کو محسوس کر کے اس کے رخسار لال ہو گئے۔ اس کے سینے میں سانسوں کا تموج بکھر کے بے ترتیب ہونے لگا۔ "کیا آپ نے میرے بارے میں یہ بات نہیں سنی کہ میں برسوں سے کس لگن اور جذبے سے انسانیت کی خدمت کرتی چلی آ رہی ہوں؟ کیا آپ اس شہر میں کسی اور ڈاکٹر کی مثال میرے مقابلے میں پیش کر سکتے ہیں؟" اس کا لہجہ پرجوش اور جذباتی ہو رہا تھا۔ "دکھی لوگوں کے سکھ کی خاطر میں نے شادی نہیں کی اور نہ کروں گی۔"

میں دل ہی دل میں ہنس دیا' میرے من کے گوشے میں ایک آواز ابھرنے لگی۔ جان من! میں یہ اچھی طرح سے جانتا ہوں کہ آپ انسانیت اور خدمت کی آڑ لے کر کس بے رحمی سے دکھی لوگوں کی چیر پھاڑ کر رہی ہیں؟ "آپ نے شادی محض اس لئے نہیں کی کہ شوہر اور بچوں کے جھنجھٹ دیمک بن کر زندگی سے چمٹ جائیں گے تو رنگین دل کے ارمان کیوں کر پورے ہو سکیں گے؟" میں نہ چاہتے ہوئے بھی کہنے لگا۔ "لیکن میں نے تو یہ سنا ہے کہ اگر کسی مریض نے بھولے سے بھی آپ کے کلینک میں قدم رکھ دیا تو اس کی چمڑی ادھیڑ دی جاتی ہے۔ آپ جس بدنصیب کی نبض پر اپنی حسین انگلیاں رکھ دیتی ہیں' اسے سو روپے کا نوٹ نذر کرنا پڑتا ہے۔ اس غریب کو جبر و زیادتی سے خون' پیشاب' بلغم' ایکسرے اور نہ جانے کن کن مراحل کے پل صراط سے گزرنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ آپ اسے ایسی نایاب اور قیمتی دوائیاں لکھ کر دیتی ہیں جو آپ کے کلینک میں واقع میڈیکل اینڈ جنرل سٹور کے علاوہ کہیں اور دستیاب نہیں ہوتی ہیں۔ کہیں میں نے غلط تو نہیں سنا ہے؟" میں نے سنجیدہ ہو کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

اس کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا اور ہوائیاں اڑنے لگیں۔ شاید وہ اپنے دل میں غصے سے پیچ و تاب کھا رہی ہو گی۔ اس نے جلدی سے لیمن اسکوائش کے دو تین گھونٹ بھرے تو اس کی وحشت میں کمی آئی۔ جب وہ اپنے اعصاب پر قابو پا چکی تو اس نے پرسکون لہجے میں ٹھہر ٹھہر کے کہنا شروع کیا۔ "مسٹر فرید احمد! آپ ٹھنڈے دل سے یہ کیوں نہیں سوچتے ہیں کہ میں نے اپنی اعلیٰ تعلیم اور تین چار ڈگریوں کے حصول کے لئے کتنی بڑی رقم خرچ کی ہو گی؟ اس کا حساب لاکھوں میں جا کر بیٹھتا ہے۔ میں نے پریکٹس کا آغاز ایک مکان سے کیا' میں نے اپنے کلینک کی عمارت بنائی تو اسے جدید سازوسامان سے محض

اس لئے آراستہ کیا کہ مریضوں کو فائدہ پہنچاؤں۔ میں نے آج تک جو کچھ کیا ہے' کیا وہ آپ کی نظروں میں ایک سنگین جرم ہے؟"

"آپ نے کوئی خدمت نہیں کی بلکہ کاروبار کیا ہے۔" میں نے جرح کے انداز میں چوٹ کی۔ "ایک خالص اور منافع بخش کاروبار۔"

اس کے چہرے پر ناگواری کی لہر ابھر آئی۔ اس نے تند لہجے میں پوچھا۔ "شاید آپ یہ چاہتے ہیں کہ مجھے اپنی رقم کا کچھ حاصل نہ ہو؟ میں غریبوں اور مریضوں کی خدمت کرتے کرتے بھیک مانگنے سڑک پر نکل آؤں!"

"جن لوگوں کا علاج آپ نے کیا ہے' وہ تو بھیک مانگنے سڑکوں پر نکل پڑے ہیں!" میں نے زیر لب مسکراہٹ سے اس پر ایک اور وار کیا۔ "آپ میری زبانی جگ بیتی بھی سن لیں۔ آپ نے سات سال پہلے ایک سو بیس گز کے مکان میں اپنا کلینک قائم کیا تھا' لیکن آج آپ کے پاس دو ہزار کے وسیع و عریض رقبے پر بنا ہوا عظیم الشان اور دو منزلہ کلینک موجود ہے۔ آپ ان دنوں فیڈرل ایریا کے ایک چھوٹے سے مکان میں کرائے پر سکونت پذیر تھیں اور رکشا اور ٹیکسی میں سفر کیا کرتی تھیں' لیکن آج آپ کے پاس ڈیفنس میں ایک کوٹھی ہے اور ذاتی استعمال میں تین مختلف قسم اور نئے ماڈل کی کاریں رہتی ہیں۔ آپ نے کراچی سے اسلام آباد تک کمرشل پلاٹ خرید کر رکھے ہوئے ہیں۔ آپ لاکھوں روپے کے حصص کا کاروبار کرتی رہتی ہیں' تین بینکوں میں آپ کی مجموعی رقم ساٹھ لاکھ روپے ہے۔ یہ سب کچھ آپ نے دکھی انسانی کی خدمت اور اعلیٰ گھرانوں کی جوان لڑکیوں کے گناہوں پر پردہ ڈال کے حاصل کیا ہے۔ یہ میری ناقص معلومات ہیں' کیا آپ انہیں جھٹلا سکتی ہیں؟"

وہ بھونچکا ہو کر میری شکل دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں اور وہ اپنی جگہ ساکت ہو گئی تھی۔ میں نے اسے گنگ پا کر کہا۔ "جب آپ اس قدر کماتی ہیں تو ٹیکس کی چوری کیوں کرتی ہیں؟"

وہ خاصی دیر بعد سنبھل کر بولی۔ "اس لفافے میں پچاس ہزار کی رقم موجود ہے۔ اگر آپ نے مجھ پر کرم کیا تو میں ہر سال آپ کو نوازتی رہوں گی۔"

میں نے محتاط ہو کر کہا۔ "میں اس وقت یہ رقم قبول نہیں کر سکتا۔"

"کیوں؟" وہ حیران سی ہو گئی۔ میری آنکھوں میں ابھرتے ہوئے شکوک کو شاید اس نے پڑھ لیا تھا۔ وہ یکایک مسکرا دی۔ "آپ مجھ پر کوئی شک مت کریں۔ میرا آپ کو رشوت کے الزام میں گرفتار کرانے کا کوئی منصوبہ نہیں ہے۔ کیا آپ مجھ سے اس کمینگی کی توقع رکھتے ہیں؟"

میں نے بے پروائی کے انداز میں اپنے دونوں شانے اچکائے۔ "مجھے اپنی گرفتاری کا اندیشہ اور خوف نہیں ہے۔" میرا لہجہ آپ ہی آپ دھمکی آمیز ہوتا چلا گیا۔ "اگر آپ نے میرے ساتھ زیادتی یا ایسی ویسی کوئی حرکت کی تو اس کا جو خمیازہ آپ بھگتیں گی اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔" میرے لہجے کی سفاکی اور دھمکی آمیز جملے سے اس کے چہرے پر زردی سی پھیل گئی۔ میں نے سنبھل کر اپنے لہجے میں نرمی اختیار کیا۔ "دراصل میں آپ سے کچھ اور معاملات طے کرنا چاہتا ہوں۔"

اس نے "کچھ" میں شاید اس قدر ابہام محسوس کیا تھا کہ وہ چونک پڑی۔ اس کے چہرے پر استعجاب بکھر گیا۔ اس نے متذبذب ہو کر پوچھا۔ "کیا آپ اس رقم سے مطمئن نہیں ہیں؟" شاید وہ "کچھ" کا یہی مطلب سمجھ سکی تھی۔ میں جواباً مسکرایا۔ میں اس "کچھ" کی وضاحت کرنے والا تھا کہ میری نگاہ ارادی طور پر کسی چور کی نظر کی طرح اس بڑے اور پھولے ہوئے لفافے کی جانب اٹھی جس میں پچاس ہزار کی ایک بڑی رقم موجود تھی۔ اسے پالینے کا تصور اس قدر فرحت انگیز تھا کہ میرے جسم میں ایک عجیب سی سنسنی بجلی کے مانند دوڑنے لگی۔ میرے منہ میں پانی بھر آیا۔ میں نے اس سے پہلے کبھی کسی ایک کیس میں اتنا تگڑا ہاتھ نہیں مارا تھا۔ مجھے اس یاسمین شہریار کی جانب سے اتنی بڑی رقم کی کوئی توقع نہیں تھی۔ اس کی فیاضی نے مجھے اس کیس کی اہمیت اور نزاکت کا پورا پورا احساس دلا دیا تھا۔ وہ ضرورت سے زیادہ ڈر گئی تھی۔ اسے اپنی دولت کے لٹ جانے کا شدید خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ میں ان پچاس ہزار روپوں کے بارے میں چند ثانیوں تک سوچتا رہا اور ایک رنگین سپنے میں ڈوب کر نکل آیا۔ میں اس کی خوف زدگی سے فائدہ اٹھا کر نہ صرف زیادہ سے زیادہ رقم اینٹھنا چاہتا تھا بلکہ اس کی یہی کمزوری میرے مقاصد میں، اسے آلہ کار بھی بنا سکتی تھی۔ اس کی مدد اور تعاون کے لئے کوئی مجبوری نہیں رہی تھی۔ کنول سے چھٹکارا پانے کے لئے یاسمین شہریار کے بغیر میں ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتا تھا۔

اب وہ میرے منصوبے کا ایک اہم ستون بن گئی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ لوہا گرم ہے اور اسے مزید گرم کرنے کی ضرورت ہے۔ پھر ایک بھرپور ضرب لگائی جائے تو رقم دگنی ہو سکتی ہے۔ اس کے بشرے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ مزید رقم کی ادائیگی کے لئے آمادہ ہے لیکن میں نے کچھ اور ہی سوچا ہوا تھا۔ "اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو آج رات کسی وقت میرے فلیٹ پر آ جائیں' جب ہی میں آپ کو ان معاملات کے بارے میں تفصیل سے بتا سکوں گا؟" میں نے اپنے شبہات کی تصدیق کے لئے اس کی آزمائش کی تھی۔

"کیا آپ ابھی' اسی وقت اور یہاں وہ معاملات طے نہیں کر سکتے؟" اس نے متردد ہو کر پوچھا تو میں نے نفی میں اپنا سر ہلایا۔ "جی نہیں!" میں سنجیدہ ہو گیا۔ "مجبوری ایسی ہے کہ میں یہاں ان معاملات پر گفتگو نہیں کر سکتا۔"

"آپ کے "کچھ" میں ابہام ضرورت سے زیادہ ہی ہے۔" وہ مترنم ہنسی سے بولی۔ "کیا ان معاملات کو طے کرنے کے لئے آپ کا فلیٹ مناسب رہے گا؟ کیا وہاں خلل نہیں ہو گا؟" میں نے اسے اپنے فلیٹ اور تنہائی کے بارے میں بتایا تو وہ کسی سوچ میں ڈوب گئی اور اس کی پیشانی پر شکنیں ابھر آئیں۔ ادھر میرا سینہ دھڑکتا جا رہا تھا۔ میں اپنے اندرونی اضطراب کو دباتے ہوئے اپنے نتیجے کا انتظار کر رہا تھا۔ یکبارگی اس کی آنکھیں کسی انجانے خیال سے چمک اٹھیں۔ "کیوں نہ آپ میرے فلیٹ پر تشریف لے آئیں۔ ہم دونوں اس فلیٹ کی تنہائی اور پرسکون ماحول میں سر جوڑ کر بیٹھیں گے تو "کچھ" معاملات آسانی سے طے کر لیں گے۔" یکبارگی فضا میں اس کی معنی خیز ہنسی کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ میں نے کچھ سوچ کر اس کے فلیٹ پر پہنچنے کی حامی بھرلی' وقت بھی طے کر لیا۔ یاسمین شہریار کے بارے میں جو باتیں مشہور تھیں' وہ سچ ہی ثابت ہو رہی تھیں۔ میں نے لفافہ اٹھا کر جیب میں رکھ لیا۔

ہم دونوں ہوٹل کے اس پرسکون گوشے اور خوش گوار ماحول سے باہر نکل آئے' وہ اپنی کار کی جانب بڑھ گئی اور میں اپنے سکوٹر کی جانب۔ میں نے صدر کے علاقے میں بوہری بازار میں سکوٹر پارک کیا اور زیبی پر ہی ایک بڑی جیولری کی دکان میں داخل ہو گیا۔ میری جیب میں دولت جو بھری ہوئی تھی اور میں کنول کے لئے قیمتی تحفہ خرید کر اپنے منصوبے کا آغاز چاہتا تھا۔ یہ تحفہ اسی منصوبے کی کڑی تھی۔ مجھے اس کے دل سے وہم نکالنا تھا' اس

لئے کہ وہ میرے ارادوں سے باخبر ہو کر چوکنا ہو گئی تھی۔ میں کاؤنٹر پر کھڑے ہو کر کسی اچھے اور خوب صورت سے تحفے کا انتخاب کرنے کے لئے نگاہیں دوڑا رہا تھا کہ کسی نے پیچھے سے میرے شانے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

میں نے یک لخت تیزی سے پلٹ کر دیکھا۔ میرے کالج کا ساتھی اور دوست یامین کھڑا ہوا مسکرا رہا تھا۔ ہم دونوں غالباً" ایک دو سال کے لمبے عرصے کے بعد ملے تھے۔ یامین میرے ان دوستوں میں سے تھا جو بہتی گنگا میں ہاتھ دھوتے تھے۔ وہ ایک رئیس باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ دولت کی کمی نہیں تھی۔ وہ کالج اور کالج سے باہر لڑکیوں کو فلرٹ کرتا پھرتا تھا۔ اسے لڑکیوں کو پھانسنے کا فن آتا تھا۔ بہت کم لڑکیاں اس کے جال سے بچ کر نکلتی تھیں۔ اس نے ایک بھونرے کے مانند کتنے ہی گلستان ویران کر دیئے تھے' جس پر کبھی اسے پچھتاوا نہیں ہوا۔ ہم دونوں بغل گیر ہو کر دکان کے ایک گوشے میں آ گئے کیونکہ کاؤنٹر پر دوسرے گاہکوں کا ہجوم موجود تھا۔ میں نے بے ساختہ اس سے پوچھا۔ "آج کل میرا یار کیا کر رہا ہے؟"

"وہی رنگین کاروبار زوروں پر چل رہا ہے۔" اس نے سرگوشی کرتے ہوئے میرے کندھے پر ایک دھپ جما دی۔ "لیکن یار!" اس کے لہجے میں فکرمندی عود کر آئی۔ "آج کل کی لڑکیاں بڑی سیانی اور تیز ہیں۔ وہ ہمہ وقت اس قدر چوکنا رہتی ہیں کہ ایک انچ بھی آگے بڑھنے نہیں دیتیں۔ انہیں رام کرنے کے لئے بڑے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ لاکھ کوشش کر لو۔ دیوار سے سر ٹکراؤ تب بھی انہیں ترس نہیں آتا۔" اس نے توقف کر کے اپنی گھنی اور لمبی لمبی مونچھوں کو تاؤ دیا۔ "آخر ہم بھی اولمپک چیمپئن ہیں' اپنے سینے پر ایک نہیں سینکڑوں تمغے سجے ہوئے ہیں۔" اس نے فخر سے سینہ تان کر ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا اور اپنے کارنامے کی داد وصول کرنے کی غرض سے اپنا ہاتھ میری جانب بڑھایا تو میں نے خوشی سے کھل کر اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ دے مارا۔ وہ ایک دم سے سنجیدہ ہو گیا۔ "یار فرید! یہ لڑکیاں کبھی میری سمجھ میں نہیں آ سکیں' "آج کل ایک ایسی ہی دشوار لڑکی میری محبت کے جال میں پھنسی ہوئی ہے۔ وہ ایک قیامت ہے۔ اس کے حسن و جمال کی جتنی تعریف کروں' وہ کم ہے۔ اس کا ترشا ہوا سراپا اس غضب کا ہے کہ اس میں کہیں کوئی عیب دکھائی نہیں دیتا۔ وہ ایک کچی کلی کی مانند تروتازہ ہے اور اس پر سرتاپا گلابی رنگ کا غلاف چڑھا ہوا

ہے۔ وہ ایک ایسا قیمتی اور نایاب پتھر ہے کہ اس دکان میں موجود نہیں ہو گا' لیکن اس میں بھی دوسری لڑکیوں جیسی ایک بیماری موجود ہے۔" یامین ناگواری سے منہ بنا کر اپنی جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالنے لگا تو میں نے شدید حیرانی سے پوچھا۔ "کیسی بیماری؟"

"شادی کی بیماری۔" یامین نے اپنا منہ سکیڑ لیا۔ "وہ تنہائی میں میرے ساتھ جانے سے بدکتی ہے۔ وہ ہر ملاقات میں مجھ سے یہ کہتی رہتی ہے کہ میں اس کے گھر شادی کا پیغام بھیج دوں۔ احمق' بے وقوف! لیکن میں نے بھی طے کر لیا ہے کہ اس لڑکی کو شکست دے کر رہوں گا۔ آج میں اسی نئے ماڈل کو شیشے میں اتارنے کے لئے ایک تحفہ خریدنے آیا ہوں۔ کوئی خوب صورت سا تحفہ' ایسا تحفہ کہ ......" اس کا لہجہ معنی خیز ہو گیا۔ "اس کی قیمت وصول ہو جائے۔"

ہم دونوں تقریباً" ایک ہی کشتی میں سوار تھے۔ اس نے مجھ سے مشورہ کر کے اپنی سنگ دل اور ضدی محبوبہ کے لئے بڑے دل کش اور قیمتی آویزے خریدے۔ میرے دل میں اس کی محبوبہ کو دیکھنے کا اشتیاق جاگا۔ "یامین! کبھی اس فتنے سے میں بھی ملوں گا؟"

"کل سہ پہر تم جس ہوٹل میں کہو' اسے اپنے ساتھ لیتا آؤں!" اس نے جواب دیا۔ "لیکن میری جان سے نظر مت لگا دینا۔"

میں یامین سے کوئی وعدہ نہ کر سکا۔ کنول کی وجہ سے میں الجھ کر رہ گیا تھا۔ میں نے بھی کنول کے لئے ایک قیمتی نیکلس خریدا۔ آخر کنول کے دل میں دوبارہ جگہ بنانی تھی۔ وہ ایک بپھری ہوئی شیرنی تھی۔ اس کا غصہ آسانی سے فرو ہونے والا نہیں تھا۔

میں اور یامین ایک قریبی ریستوران میں آ کر بیٹھ گئے۔ وہ اپنی محبوبہ کا تذکرہ کرتا رہا۔ اس ذکر سے نجات سے تو ہم دونوں اپنے کالج کے ایام کو یاد کرتے رہے' کوئی ایک گھنٹے بعد ہوٹل سے باہر نکلے تو ہم دونوں کی راہیں جدا جدا ہو گئیں۔ وہ اپنی نسان کار میں رخصت ہو گیا اور میں اپنے سکوٹر پر کنول کے گھر کی جانب ہو لیا۔ جانے سکوٹر میں اچانک کیا خرابی پیدا ہوئی کہ وہ بند ہوا جا رہا تھا۔ میں نے سکوٹر ایک قریبی موٹر مکینک کے حوالے کیا اور ٹیکسی میں کنول کے ہاں جا پہنچا۔

کنول کے ہاں پہنچا تو نصیر کی کار احاطے میں نظر نہیں آئی' دل کو ڈھارس سی ہوئی۔ میں دل میں دعائیں مانگتا ہوا آیا تھا کہ اس خبیث شخص سے مڈبھیڑ نہ ہو ورنہ تو تو میں میں

ہو جائے گی۔ برآمدے میں آنٹی کا ملازم گل مل گیا۔ وہ مجھ سے خوب واقف تھا اور فخرو بھائی کا دوست بن گیا تھا۔ اس نے میرے پوچھنے پر بتایا کہ کنول' ہسپتال سے صبح دس بجے گھر آگئی ہے۔ میں نے دس دس کے دو نوٹ اس کے انکار پر بھی زبردستی اس کی جیب میں ٹھونس دیئے اور ع تنہا کنول کے کمرے کی طرف بڑھا۔ میں کنول کو حیران کرنا چاہتا تھا۔ میں دبے قدموں اور بغیر کسی آہٹ کے اس کے کمرے کے پاس پہنچ کر رک گیا۔ کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا لیکن چوکھٹ پر لہراتا ہوا پردہ رکاوٹ بن گیا۔

میں نے یکایک محسوس کیا کہ کنول کی سرگوشیاں اور سسکیاں کمرے میں گونج رہی ہیں۔ میں اپنی جگہ منجمد ہو کر کھڑا رہ گیا۔ میرا دماغ چکرانے لگا۔ "وہ کیوں رو رہی ہے؟" لیکن میرے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ میں نے پردہ ہٹا کر کمرے میں جھانکا' وہ کسی گٹھڑی کے مانند سکڑی اور سمٹی ہوئی بیٹھی تھی۔ اس نے اپنا سر گھٹنوں میں دبایا ہوا تھا۔ اس کا نازک بدن ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ میں کمرے میں داخل ہو کر دبے قدموں پلنگ کی جانب بڑھا۔ میں نے پلنگ کے پاس پہنچ کر بڑی آہستگی سے اسے پکارا۔ "کنول!"

میری مرتعش آواز سن کر یک لخت اس کے جسم کی لرزش رک گئی۔ وہ چند ثانیوں تک ساکت رہی' جیسے وہ میری آواز کو اپنی سماعت کا فتور سمجھ رہی ہو۔ جب میں نے اسے دوبارہ آواز دی تو اس نے اپنا سر گھٹنوں سے باہر نکالا' اس کا چہرہ میری طرف اٹھا تو وہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔ اس نے بہ وقت تمام اپنی ہچکیوں پر قابو پایا۔ جب وہ مجھ سے مخاطب ہوئی تو اس کا لہجہ زخم خوردہ تھا۔ "تم یہاں کس لئے آئے ہو؟"

میں نے انجان ہو کر پوچھا۔ "کیا میں یہاں نہیں آ سکتا؟"

اس کا دل بھر آیا تھا۔ اس نے چادر سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ "میں کہتی ہوں' تم یہاں سے چلے جاؤ۔" وہ رندھی ہوئی آواز میں چیخ پڑی۔ "کیا تم میری بدنصیبی کا تماشا دیکھنے آئے ہو؟ تمہارا جی ابھی بھرا نہیں؟"

میں پلنگ پر اس کے پاس جا بیٹھا اور اپنے دونوں ہاتھوں کی مدد سے' اس کی دونوں کلائیاں پکڑ لیں۔ اس نے بڑی بے رحمی سے مجھے جھڑک دیا۔ "مجھے ہاتھ مت لگاؤ' میں ......" اس کا جملہ ہچکیوں میں گم ہو کر ادھورا ہو گیا۔

میں نے اپنا منہ اس کے کان کے پاس لے جا کر سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ "کنول"

میری بات تو سنو! میری طرف دیکھو۔"

اس کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔ وہ چند لمحوں بعد خود پر قابو پا کر اٹکتی ہوئی بولی۔

"اب تمہیں دینے کے لئے میرے پاس رکھا ہی کیا ہے؟"

"محبت!" میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

"تم مجھے پھر فریب دینے آگئے؟"

"میں تمہیں ایک بہت بڑی خوش خبری سنانے آیا ہوں!"

"یہ کیوں نہیں کہتے کہ تم میرے لئے موت کی خبر لائے ہو؟" اس نے یکایک اپنے چہرے پر سے دونوں ہاتھ ہٹا لئے' وہ جیسے رونا بھول گئی تھی۔ "کیا میری موت تمہارے لئے خوش خبری نہیں ہے؟"

میں نے اپنے دل میں اعتراف کیا کہ اس کی موت میری عین تمنا ہے۔ میں نے اپنے دل پر جبر کر کے اس کی تیز و تند نگاہوں کا مقابلہ کیا جو میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔ "کنول! جانے تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ کل سے تم بہکی بہکی باتیں کر رہی ہو' کیا میں موت کا فرشتہ نظر آتا ہوں کہ تم میری شکل تک سے خوف زدہ ہو؟"

"میں نے تمہاری آنکھوں میں موت کے فرشتے کو دیکھا ہے!" اس کی آواز میں لرزیدگی نمایاں تھیں۔ تم وہ فرید نہیں ہو جس نے مجھ سے محبت کی تھی۔"

میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا تو اس نے کوئی تعرض نہیں کیا۔ میں انتہائی جنونی انداز میں بولا۔ "کنول! تم جیت گئیں' میں ہار گیا۔ میں تمہیں اپنانا چاہتا ہوں' ہمیشہ ہمیشہ کے لئے' لیکن ایک شرط پر۔"

میں نے قدرے تذبذب سے اس کی جانب دیکھا' وہ میری زبان سے شرط سننے کے لئے بے چین ہو رہی تھی۔ میں نے ہچکچاتے ہوئے کہہ دیا۔ "تمہیں اپنی شادی کے لئے ایک قربانی دینا ہو گی اور اس قربانی سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"

کنول کا چہرہ اور آنکھیں بجھ سی گئیں' اس نے چشم اشتباہ سے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "شاید تم چاہتے ہو کہ میں شادی سے پہلے اپنا بچہ ضائع کرا دوں؟"

میں نے چونک کر اپنی گردن اقرار میں ہلا دی تو وہ تڑپ کر بولی۔ "شاید تم پچھلی باتیں بہت جلد بھول گئے' میں نے تم سے کہا تھا نا کہ میں اپنی محبت کی نشانی نہیں گنوا

سکتی۔"

"لیکن میرے گھر والے کیا کہیں گے؟ وہ مجھے طعنہ دیں گے۔" میں نے سوچ کر کسی خیال کے زیر اثر کہا۔ "کیا میں مایوس واپس چلا جاؤں گا؟"

"ہاں!" اس نے سرد مہری سے جواب دیا۔ "تم واپس چلے جاؤ اور دوبارہ یہاں قدم نہ رکھنا' اس لئے کہ میں اب صرف ایک اداکارہ' فاحشہ یا بازاری عورت نہیں رہی۔ میں اب دنیا کو بتاؤں کہ یہ بچہ تمہارا ہے۔ تم اس بچے کے باپ ہو' پھر دیکھتی ہوں کہ تم کیا کرو گے؟ کہاں جاؤ گے؟"

میرے سامنے کھلے ہوئے تمام دروازے ایک ایک کر کے کنول نے بند کر دیئے۔ اس نے میرے وجود پر ایسی بھرپور ضرب لگائی تھی کہ میرا دماغ ماؤف ہو کر رہ گیا۔ میں ایسا چکرایا کہ کچھ سوچتے نہیں بنی' اس کی ناراضگی مول لے کر میں اس سے اپنا انتقام نہیں لے سکتا تھا۔ میرا منصوبہ دھرا رہ جاتا بلکہ وہ مجھ سے انتقام لینے پر تلی ہوئی تھی۔ میرے ذہن پر ہتھوڑے برسنے لگے۔ میں نے سراسیمگی سے کنول کی جانب دیکھا' وہ ایک سفاک عورت کے مانند مجھے تیز و تند نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ میں نے سٹپٹائی ہوئی آواز میں کہا۔

"کنول! تم ذرا سوچو' ایک عورت بن کے نہیں' فرید بن کے۔"

وہ ہنسی تو اس کی ہنسی استہزائیہ تھی۔ "جب تمہیں اپنی عزت کا اتنا خیال ہے تو دوسروں کی عزت بھی تمہارا فرض ہے۔"

"کیا تم ایک بھول کی اتنی بڑی سزا دو گی؟"

"کیا تم اپنے ہی خون کا گلا اس لئے گھونٹ دینا چاہتے ہو کہ وہ تمہاری پیشانی پر بدنما داغ بن جائے گا؟" کنول نے بھڑک کر تکرار کی۔

"مجھے صرف ایک ہفتے کی مہلت دو تاکہ میں اپنے گھر والوں کو اس شادی پر رضامند کر سکوں۔"

"تم جھوٹ بول رہے ہو؟" وہ سپاٹ لہجے میں بولی تو میرے جسم میں سوئیاں سی چبھنے لگیں۔ میرے ہاتھوں میں رعشہ آ گیا۔

میں نے بدحواس ہو کر کہا۔ "کیا تمہیں میری بات کا یقین نہیں؟"

"نہیں!" اس نے کھردرے انداز میں جواب دیا۔ "تمہارا لہو کھوکھلا اور فریبی

محسوس ہو رہا ہے۔ تمہاری وحشت زدہ آنکھوں سے سازش جھلک رہی ہے۔"

میرے جی میں تو آیا کہ میں ابھی اور اسی وقت اپنی ان دونوں بے شرم آنکھوں کو پھوڑ دوں اور اپنی خود غرض زبان بھی کاٹ لوں جس نے بڑی بے رحمی سے میری سازش کو بے نقاب کر کے مجھے کنول کی نظروں میں ذلیل و خوار کر دیا تھا۔ میں نے اپنے دل پر صبر کا بڑا سا پتھر رکھ کے زبردستی مسکرانے کی کوشش کی۔" میرے پاس تو کیا کسی حکیم یا ڈاکٹر کے پاس بھی وہم کا علاج نہیں ہے۔ تم جو چاہو' میرے بارے میں سوچ سکتی ہو۔ تمہیں ہر طرح کے فیصلے کا اختیار بھی ہے۔ لیکن میری ایک بات ذہن نشین کر لو کہ میں تم سے شادی کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں نے تمہیں ہر قیمت پر اپنانے کا قوی فیصلہ کر لیا ہے۔" وہ میرا ایک ایک لفظ بڑے دھیان اور توجہ سے سن رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں چھائے ہوئے گھرے بادل چھٹ گئے اور چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ اس کے سینے میں سمندر کی سرکش لہروں کا تموج تھا۔ میں نے اپنی تقریر کو کلا مکس پر پہنچایا۔ "اگر تم نے میری محبت کو ٹھکرا دیا تو تمہیں میری لاش......"

اس نے جھٹ سے اپنا ہاتھ میرے منہ پر رکھ دیا۔ وہ مترنم لہجے میں بولی تو اس کی آواز میں حیرت تھی۔ "فرید! تم سچ کہہ رہے ہو؟ کہیں میرے کان دھوکا تو نہیں کھا رہے ہیں؟"

"کیا میں تمہیں اپنا سینہ چیر کر دکھاؤں؟" میں نے شوخی سے پوچھا۔

"نہیں۔" اس کے رخساروں پر سرخی کی لہر اٹھی۔ میں نے فوری طور پر اس کے ہاتھوں پر نیکلس کا ڈبہ رکھ دیا۔ اس نے ڈبہ لیتے ہوئے میری جانب سوالیہ اور حیرت بھری نظروں سے دیکھا تو میں نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے شانوں پر رکھ دیئے۔

"تمہاری صحت یابی کی خوشی میں' میری جانب سے ایک حقیر نذرانہ۔"

اس نے بے تابانہ انداز میں جگمگاتے ہوئے نیکلس کو دیکھا تو حیرت سے اس کی حسین آنکھیں پھیل گئیں۔ معاً اس کا کھلا ہوا چہرہ سپاٹ اور ہر قسم کے جذبات سے یکسر عاری ہو گیا۔ وہ دوسرے لمحے جانے کس خیال سے بجھ سی گئی اور افسردگی سے بولی۔ "فرید! میرے لئے تمہاری محبت ہی بہت بڑا تحفہ اور انمول سرمایہ ہے۔ میرے نزدیک تو تمہاری زبان سے محبت میں ڈوبا اور نکلا ہوا ایک ایک لفظ ایسے ہزاروں تحائف سے کہیں زیادہ

وقعت رکھتا ہے۔" وہ جذباتی ہونے لگی تو اس کی آواز بھرا گئی۔ اس نے آہستگی سے اپنا سر میرے سینے پر رکھ دیا۔ "مجھے صرف اور صرف تمہاری محبت چاہئے۔ میں صرف چاہت کی بھوکی ہوں۔ اگر تم میرے من میں بسے ہوئے نہیں ہوتے تو میں اپنی کوکھ میں پلنے والی تمہاری نشانی کو' کب کا مٹا دیتی؟" ابھی وہ یہ کہہ ہی رہی تھی کہ کمرے میں ایک بھونچال سا آ گیا۔ نصیر دندناتا ہوا کمرے میں داخل ہوا تھا۔

میں نصیر کو طوفان کی طرح اندر داخل ہوتے دیکھ کر ساکت ہو گیا۔ اس کا اس طرح سے آنا مجھے سخت ناگوار گزرا۔ ہم دونوں تڑپ کر الگ ہو چکے تھے۔ نصیر کی آنکھوں میں غیظ و غضب کی چنگاریاں بھڑکنے لگیں۔ اس کے جسم کا سارا خون سمٹ کر چہرے پر آ گیا تھا۔ وہ کسی اژدہے کی طرح پھنکارا۔ "کیا یہاں کوئی ڈرامہ ہو رہا ہے؟"

نصیر کو طیش کے عالم میں بے قابو دیکھ کر کنول سہم گئی' اور میرے پاس آ کر کھڑی ہوئی تو میں نے اس کے سراپا میں ارتعاش سا محسوس کیا۔ نصیر پر کسی جنونی کی سی کیفیت طاری تھی اور جب اسے اپنی بات کا جواب نہیں ملا تو وہ اور چراغ پا ہو گیا۔ "تم یہاں کیوں اور کس لئے آئے ہو؟"

مجھے جھرجھری سی آ گئی' تاہم میں نے پرسکون لہجے میں جواب دیا۔ "میں کنول سے ملنے آیا تھا۔"

اس نے اپنی پوری طاقت سے اپنا پیر فرش پر پٹخا۔ "اب اس گھر کے دروازے تمہارے لئے بند ہو چکے ہیں۔ تم یہاں سے فوراً" نکل جاؤ اور پھر کبھی لوٹ کر مت آنا۔" وہ دہاڑنے لگا۔ "تم نے اس بات کو مذاق سمجھا تو میں تمہیں گولی مار دوں گا۔"

کنول تڑپ کر میرے سامنے آ گئی' بالکل اسی طرح جیسے اسٹیج اور فلموں کے مناظر میں دکھایا جاتا ہے۔ وہ کانپتی آواز میں بولی۔ "انکل! یہ میرا گھر ہے۔ فرید کو یہاں آنے سے کوئی نہیں روک سکتا ہے۔"

کنول کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ نے جیسے نصیر پر بجلی گرا دی تھی۔ اسے سکتہ سا ہو گیا۔ وہ چند ثانیوں تک نفرت بھری نظروں سے ہم دونوں کو دیکھتا رہا اور پھر کسی خیال سے چونکا۔ "یہ تم کیا کہہ رہی ہو کنول؟" نصیر کی آواز میں حیرت بھری ہوئی تھی۔ "تم اس نابکار کو دل دے بیٹھی ہو جو ہماری تباہی اور آنٹی کی موت کا ذمے دار ہے۔ اگر یہ شخص

ہماری زندگی میں داخل نہ ہوتا تو آج ہماری یہ حالت نہ ہوتی۔"

"آپ انہیں ہمارے گناہوں کا سزاوار مت ٹھہرائیں۔"

"کیوں؟" وہ بھڑک اٹھا۔ "تم جو چاہے سوچو اور سمجھو' لیکن میں اس ذلیل شخص کو ایک لمحے کے لئے بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ مجھے یہ آدمی زہر لگتا ہے۔ اب اس شخص سے ہمارا کوئی تعلق اور واسطہ نہیں ہونا چاہئے۔"

"لیکن میرا ان سے سدا کے لئے ایک تعلق قائم ہو چکا ہے' جو کسی طور نہیں ٹوٹ سکتا!" وہ مضطرب ہو رہی تھی لیکن اس کا لہجہ بڑا مضبوط تھا۔ "میں نہ صرف ان کے بچے کی ماں بننے والی ہوں بلکہ بہت جلد ہم دونوں شادی کر رہے ہیں۔"

کنول نے جیسے کوئی اینٹ اس کے سر پر دے ماری تھی۔ اس کی حالت کسی خزاں رسیدہ پتے کے مانند ہو رہی تھی' وہ کتنے ہی لمحوں تک منجمد ہو کر کھڑا ہوا پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس طرح دیکھنے لگا تھا کہ مجھ پر ایک خوف طاری ہو گیا۔ میں یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا لیکن میرے لئے فرار کی راہ نہیں رہی تھی۔ آخر نصیر ایک چھٹا ہوا بدمعاش تھا۔ وہ اتنی بھرپور ضرب اپنی ذات پر سہہ کر مجھے جانے کیسے دیتا!

جب اس کے حواس اعتدال پر آئے تو وہ ہم دونوں کی طرف بڑھا لیکن کچھ سوچ کر رک گیا۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا' اس نے مجھ پر ایک قہر آلود نگاہ ڈالی اور کنول سے مخاطب ہوا۔ "یہ تم نے کیا کیا کنول؟ آخر تم نے مجھ سے کس بات کا انتقام لیا ہے؟ تم نے میرے ساتھ کیسا بھیانک سلوک کیا ہے۔" اس کی آواز میں کرب سمٹ آیا تھا۔ "آخر کیوں؟ کیا احسانات کا بدلہ اسی طرح دیا جاتا ہے؟"

کنول نے مرتعش انداز میں پوچھا۔ "میں نے آپ کا کیا بگاڑا ہے' میں آج بھی کل کی طرح آپ کی احسان مند ہوں۔"

"کیا احسان اسے کہتے ہیں کہ میری زندگی تباہ کر دو!" وہ فرش پر پیر پٹخنے لگا۔ "تم اس کے بچے کی ماں بن کر کیا میرا مستقبل نہیں اجاڑ رہی ہو؟"

"کیا مجھے کوئی حق نہیں ہے کہ میں اپنی زندگی اپنی خواہش کے مطابق بسر کروں؟"

"لیکن اب میرا کیا ہو گا؟" وہ اپنا سر پیٹنے لگا۔ "میں نے تمہاری زندگی بچانے کے لئے پورے بیس ہزار روپے خرچ کئے' کتنی راتیں آنکھوں میں کاٹیں۔ میں نے یہ سب

کچھ اس لئے کیا تھا کہ تم جیسے ہی صحت یاب ہو گی' اسٹیج پر آ کر پھر سے تہلکہ مچا دو گی اور میں اپنا نقصان پورا کر لوں گا۔" اس کے سینے میں سانسیں بے ترتیب ہو رہی تھیں۔ وہ غصے سے بے قابو ہو رہا تھا۔ "تم نہ صرف اس درندے کے بچے کی ماں بن کر اپنا اور میرا مستقبل تباہ کر رہی ہو بلکہ اس آدمی سے شادی بھی کرنا چاہتی ہو!"

میں نہ چاہتے ہوئے بھی بول اٹھا۔ "اس ملک میں کنول کی کیا کمی ہے؟ ایک نہیں ہزار ایسی لڑکیاں مل جائیں گی جو آپ کی زندگی بنا سکتی ہیں۔"

"تت' تم اپنی زبان بند رکھو۔" اس کے منہ سے جھاگ نکلنے لگی۔ "تم ہی تو فساد کی جڑ ہو۔ ذلیل' کمینے!"

"انکل!" کنول چیخی۔ "آپ انہیں کچھ نہ کہیں۔"

"اس خبیث نے تم پر جادو کر دیا ہے۔ یہ تم کو مجھ سے چھین لینا چاہتا ہے۔" نصیر پر جنون طاری ہو رہا تھا۔ "اس نے میری پیٹھ میں چھرا گھونپ دیا ہے۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

نصیر کی یہ کیفیت دیکھ کر میں گھبرا گیا۔ کنول سر تا پا لرزنے لگی۔ اس لمحے یوں لگتا تھا کہ وہ مجھ پر جھپٹ پڑے گا کیونکہ وہ غصے سے پاگل ہو رہا تھا' لیکن وہ مجھ پر حملہ آور ہونے کی بجائے تیزی سے باہر نکل گیا۔ اس کے کمرے سے باہر نکلتے ہی میں نے سکون کا گہرا سانس لیا۔ کنول پر سراسیمگی طاری تھی۔ اس کا چہرہ متغیر ہو رہا تھا۔ جب وہ بولی تو اس کی آواز کپکپا رہی تھی۔ "فرید! تم یہاں سے نکل جاؤ۔ بھاگ جاؤ۔ انکل کے ارادے اچھے نظر نہیں آ رہے۔"

"کنول! تم گھبراؤ نہیں۔" میں نے اسے تسلی دی۔ "جب ایک شخص اپنے تئیں انتہائی بے بس اور مجبور ہو جاتا ہے تو وہ اپنے آپ میں نہیں رہتا' تمہارے انکل اسی لئے باہر نکل گئے ہیں۔ وہ صرف غصے سے پاگل ہو رہے ہیں۔ کچھ دیر بعد ٹھیک ہو جائیں گے۔"

"تم انکل کو نہیں جانتے۔" اس کی آنکھوں اور آواز سے خوف جھلک رہا تھا۔ وہ بے قراری سے میرا ہاتھ پکڑ کے دروازے کی جانب کھینچنے لگی۔ "وہ بدمعاشوں کے سردار ہیں۔ وہ پری زاد خانم سے زیادہ خطرناک اور سفاک ہیں مجھے ....."

کنول کا جملہ ادھورا رہ گیا اور میں اپنی جگہ سے اچھل کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔

نصیر اپنے ہاتھ میں پستول لئے داخل ہو رہا تھا۔ اس کا چہرہ سفاک ہو کر اس قدر ڈراؤنا ہو گیا تھا کہ میرے جسم پر بجلیاں گرنے لگیں' رگوں میں گرم گرم سیسہ اتر رہا تھا۔ وہ دہلیز پر کھڑا ہو گیا۔ کنول میں نہ جانے کہاں سے اتنی ہمت اور سکت آگئی تھی کہ مجھے اپنے عقب میں چھپا کر سینہ سپر ہونے لگی۔ اس پر ذرا بھی گھبراہٹ طاری نہیں ہوئی' البتہ اس نے چیخ چیخ کر اپنے نوکروں کو پکارا۔ "گل' بٹ' سرفراز!"

نصیر پہلے استہزائیہ انداز میں ہنسا' پھر اس نے تیزی سے پیچھے پلٹ کر دیکھا اور میری طرف متوجہ ہو گیا۔ "یہ کیا مردانگی ہے کہ ایک عورت کا سہارا لے کر اپنی جان بچا رہے ہو؟"

وہ کنول سے مخاطب ہو کر چیخا۔ "کنول! تم ہٹ جاؤ۔ میں اس بزدل اور کمینے کا سر کچل دینا چاہتا ہوں۔ یہ شخص سانپ ہے اور ہم سب کو ڈس لینا چاہتا ہے۔"

میں نے اس خوف کے پیش نظر کہ کہیں کنول اپنی جگہ سے ہٹ نہ جائے' غیر محسوس انداز میں اس کی بانہوں کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا۔ میرے ہاتھوں پر رعشہ طاری تھا۔ معاً" ایک خیال بجلی کی سی تیزی سے ذہن میں آیا کہ کنول اگر نصیر کے پستول کی گولی کا نشانہ بن جائے تو ایک جھگڑا ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے۔ اس پل میرا چہرہ دمک کر بجھ بھی گیا۔ وہ کم بخت صرف میرا دشمن تھا۔ وہ میری موت کا خواہش مند تھا۔ کنول کے مر جانے سے بھی میری ذات کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا اور پھر اس واقعے کی بھنک اگر مہ جبیں کے باپ کے کانوں میں پڑ گئی تو وہ ای کو اپنے گھر کی دہلیز بھی پار نہیں کرنے دے گا۔

"آپ انہیں نہیں مار سکتے۔" کنول پرجوش لہجے میں چلائی۔ "میں ان کی خاطر اپنی جان بھی دے سکتی ہوں۔"

نصیر کے ہاتھوں میں پستول کانپ رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں کی کپکپی لحہ بہ لحہ بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ کنول کی بات سن کر مسکرایا۔ "بے بی! یہ کسی ڈرامے کی ریہرسل نہیں ہو رہی ہے۔ اس پستول میں چھ بالکل اصلی گولیاں موجود ہیں۔ میں صرف ایک گولی میں اس کا کام تمام کر سکتا ہوں۔" اس نے ایک قدم ہماری جانب بڑھایا۔ اسی وقت کمرے کے باہر راہداری میں ایک ساتھ کئی لوگوں کے دوڑ کر آنے کی آوازیں سنائی دیں تو وہ بوکھلا گیا۔ اس نے ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ ایک زاویئے سے میرا نشانہ لینے لگا تو کنول تڑپ کر

پستول کے سامنے آ گئی۔ میری نگاہ دروازے پر لگی ہوئی تھی اور جسم سن ہوا جا رہا تھا۔ نصیر کوئی اناڑی نہیں تھا۔ اگر غصہ اس کے قابو میں ہوتا اور وہ ہائی بلڈ پریشر کا مریض نہیں ہوتا تو وہ بڑی آسانی سے اپنے ارادوں میں کامیاب ہو جاتا۔ اس کا پستول والا ہاتھ اس بری طرح کانپ رہا تھا کہ پستول بار بار اس کی گرفت سے نکلا جا رہا تھا۔ سب سے پہلے کمرے میں گل داخل ہوا۔ گل کو دیکھ کر نصیر اور بھی بوکھلا گیا۔ اس نے جیسے تیسے میرا نشانہ لے کر گولی چلا دی۔ کنول کی نگاہ صرف پستول پر جمی ہوئی تھی۔ جیسے ہی نصیر لبلبی پر اپنی انگلی رکھ کر اسے حرکت دینے والا تھا' کنول نے اپنی پوری طاقت سے مجھے ایک طرف دھکیلا اور میں فرش پر گر پڑا۔ گولی سنسناتی ہوئی دیوار سے جا ٹکرائی۔ میں کنول کے منہ سے ایک ہولناک کراہ سن کر حواس باختہ ہو گیا۔ نصیر کو دوسری گولی چلانے کا موقع نہیں مل سکا۔ گل اور دوسرے دو نوکر جو کمرے میں داخل ہو چکے تھے' وہ نصیر پر جھپٹ پڑے اور اس کے ہاتھ سے پستول چھین کر اسے بے بس کرنے لگے۔ جب میں نے نصیر کو نوکروں کے نرغے میں دیکھا تو سرعت سے کھڑے ہو کر کنول پر توجہ کی۔ وہ اپنے دائیں ہاتھ سے اپنا بایاں بازو پکڑے ہوئے تھی۔ اس کے بازو سے خون کی دھار پھوٹ پڑی تھی۔ وہ پلنگ پر نڈھال سی ہو کر بیٹھنے لگی تو میں اس کے پاس جا پہنچا۔ "کنول! کنول!" میں نے وحشت سے پوچھا۔ "گولی کہاں لگی ہے؟"

"دل میں۔" وہ شوخی سے بولی۔

"دل میں!" میں نے ہراساں ہو کر دل کی جگہ دیکھا' وہاں کسی زخم یا خون کا نام و نشان تک نہیں تھا' البتہ سانسوں کا زیر و بم اور دل کی دھڑکن سنائی دے رہی تھی۔ وہ مجھے خوف زدہ اور پریشان پا کر مسکرائی۔

"کچھ نہیں ہوا فرید! گولی میرے بازو کو چھوتی ہوئی چلی گئی ہے۔" جب میں نے اس کا ہاتھ ہٹا کر زخمی بازو دیکھنے کی کوشش کی تو وہ بولی۔ "فرید! تم یہاں سے فوراً" چلے جاؤ۔ نہیں تو انکل کی حالت اور بگڑتی چلی جائے گی۔ ان کا بلڈ پریشر بہت ہائی ہوتا جا رہا ہے۔"

میں نے نصیر کی جانب دیکھا۔ وہ واقعی اپنے آپ میں نہیں تھا۔ وہ فحش گالیاں بکتے ہوئے مجھے دھمکیاں دیئے جا رہا تھا۔ میں خود بھی اس جھنجھٹ سے نکلنا چاہتا تھا۔ کنول نے مجھے یہاں سے نکل جانے کے لئے کہا تو میں نے ایک ساعت کی بھی تاخیر نہیں کی۔ میں

سنسناتا ہوا کمرے سے ہی نہیں' اس بنگلے سے بھی باہر نکل گیا۔

میں نے ایک خالی ٹیکسی روکی اور کسی کٹتے ہوئے شہتیر کی مانند اس میں جا پڑا۔ مجھے ایک نئی زندگی ملی تھی۔ یہ زندگی مجھے اس کنول نے دی تھی جس کی زندگی میں خود چھین لینے کے درپے تھا۔ اگر کنول مجھے دھکا دے کر فرش پر نہ گرا دیتی تو میری لاش خون میں لت پت پڑی ہوئی ہوتی۔ کنول کے احسانات کا بوجھ میری ذات پر برابر بڑھتا جا رہا تھا۔

جب میں نے ٹیکسی موٹر مکینک کے ہاں رکوائی اور اسے رخصت کیا تو معلوم ہوا کہ دس پندرہ منٹ کا کام باقی ہے۔ میں ایک قریبی ہوٹل میں جا بیٹھا۔ جب میں نے دو تین گلاس پانی حلق میں اتارا جب کہیں جا کر میری طبیعت ٹھکانے پر آئی اور میں اطمینان کے گہرے سانس لینے لگا۔ میرے اعصاب کسی قدر پرسکون ہو گئے تو میں بڑی سنجیدگی سے کنول کے بارے میں سوچنے لگا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کنول آخر مجھ سے اس قدر شدید محبت کیوں کرنے لگی ہے۔ آخر یہ محبت کیسی ہوتی ہے؟ کیوں ہو جاتی ہے؟ کتنی ہی لڑکیاں میری زندگی میں بہار بن کر آئیں اور خزاں بن کر چلی گئیں' صرف ایک لڑکی مہ جبیں کے حسن نے مجھے متاثر کیا۔ کیا میں بھی مہ جبیں کو اتنی ہی شدت سے چاہتا اور محبت کرتا ہوں جتنا کنول مجھے چاہتی ہے؟

میں نے سائیں سائیں کرتے ہوئے دماغ کے گوشوں اور دل کی گلیوں میں مہ جبیں کو ٹٹولا' تلاش کیا۔ وہ محبت کا گداز بن کر چھپی ہوئی تھی۔ اس کی کسک میرے سینے میں موجود تھی۔ میں یہاں بیٹھ کر اپنے آپ کو مجنوں بنانا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے مہ جبیں کو پانے کے لئے بہت دور جانا تھا۔ میں ہوٹل سے باہر نکل آیا۔

رات دس بجے' میں نے یاسمین شہریار کے فلیٹ کی اطلاعی گھنٹی کا بٹن دبایا تو مجھے چند ثانیے انتظار کرنا پڑا۔ دروازہ بڑی آہستگی سے کھلا۔ یاسمین شہریار میری نظروں کے سامنے کسی حسین مجسمے کے مانند کھڑی ہوئی تھی۔ اس بت طناز کی بڑی بڑی حسین آنکھوں کے طلسم میں شراب کی سی مستی کے بادل امڈ امڈ کر افق تا افق چھا رہے تھے۔ اس کے ترشے ہوئے لبوں پر ایک سحر انگیز تبسم بڑے والہانہ انداز سے میرا استقبال کر رہا تھا۔ جیسے ہی میری نگاہ اس کے دہکتے ہوئے سراپا پر تھرتھرائی تو وہ کسی انجانی خواہش کی امید پر للچائی ہوئی منجمد ہو کر رہ گئی۔ وہ گہری کالی ساڑھی اور بغیر آستین کے بے حد مختصر بلاؤز میں قیامت

جگا رہی تھی۔ میں تو ان حشر سامانیوں کے ہاتھوں قتل ہو کر رہ گیا۔

"ہیلو! مسٹر فرید احمد!" میرے کانوں میں جل ترنگ بجنے لگے تو میں چونک کر حسن کے طلسم سے نکل آیا۔ اس نے اپنا حسین اور سڈول ہاتھ میری جانب مصافحے کی غرض سے بڑھایا۔ جب میں نے اس سے مصافحہ کیا تو یوں محسوس ہوا جیسے میں نے کسی انگارے کو چھولیا ہو۔ میرے اندر ایک آگ سی بھر گئی تھی۔

یاسمین شہریار کے فلیٹ کی طلسماتی فضا نے مجھے اسیر کر لیا تھا۔ فلیٹ کی آرائش و زیبائش میں موصوفہ کا کم' دولت کا اعجاز زیادہ تھا۔ فی الحقیقت میری آنکھوں نے کبھی ایسا مرعوب کر دینے والا نظارہ نہیں دیکھا تھا۔ بے پناہ دولت ہو تو ایک جھونپڑی کو بھی اندر سے محل بنایا جا سکتا ہے۔

وہ مجھے ملاقاتی کمرے میں لے آئی۔ اس فلیٹ میں ہم دونوں کے علاوہ کوئی اور نہیں تھا۔ ایک گہرا سناٹا طاری تھا جو اس کی مترنم ہنسی اور نغموں کے جادو میں بکھر گیا۔ رسمی باتیں ہوتی رہیں لیکن میں کہیں اور تھا۔ میری سانسیں سینے میں الجھ رہی تھیں۔ میرا دل سینے میں بری طرح دھڑک رہا تھا۔ اس نے کچھ دیر بعد مے نوشی کے بارے میں پوچھا تو میں انکار نہ کر سکا۔ وہ مجھے اپنی خواب گاہ میں لے آئی۔ اس نے دیوار میں نصب الماری میں سے شراب کی بوتل اور گلاس نکالے۔ وہ ساقی بن گئی اور میں بلا نوش! وقت کی سوئیاں اٹھلاتی ہوئی چل رہی تھیں' پھر اس نے مجھے شراب کند پیش کی۔

میں نے اس سے پہلے کبھی پرانی شراب نہیں چکھی تھی۔ میں تو نئی شراب کا رسیا تھا۔ مجھے آج معلوم ہوا تھا کہ پرانی شراب نئی شراب کے مقابلے میں کہیں تیز' ترش اور لذیذ ہوتی ہے۔ وہ اس قدر تیزی سے اپنا اثر دکھاتی ہے کہ اس کا گہرا نشہ نس نس میں کیف و سرور بن کر آدمی کو مدہوش کر دیتا ہے۔ میں بھی نشے میں بدمست پڑا ہوا' اپنے آپ کو نڈھال' بے جان اور بے حد تھکا ہوا محسوس کرنے لگا۔ پینے کی خواہش تھی مگر ترس رہا تھا۔ سیراب ہو کر بھی ایک تشنگی کا احساس باقی تھا۔ سامنے بوتل کھلی ہوئی پڑی تھی۔ شراب چھلک رہی تھی۔

میں نے خواب کی سی مدہوشی میں اس کی سرگوشیاں اور مترنم ہنسی کی گھنٹیاں بجتی ہوئی سنیں۔ جانے وہ مجھ سے کیا کچھ پوچھ رہی تھی۔ مجھے صرف اتنا ہوش تھا کہ میرے

اعصاب پر کنول کا فسوں چھایا ہوا ہے اور میں ہذیانی کیفیت سے اس کا نام لے رہا ہوں۔

کتنی ہی دیر بعد نشہ کسی قدر اتر گیا تو میں نے یاسمین شہریار کو دیکھا۔ صاف شفاف آسمان پر وہ کسی چاند کے مانند مسکرا رہی تھی۔ کمرے میں جیسے چاندنی چھلک رہی تھی۔ اس نے شیفتگی سے پوچھا۔ "آپ نے میرے بارے میں کیا سوچا؟"

میں اس وقت خالی الذہن تھا اور چاروں طرف بکھری ہوئی چاندنی کو دیکھنے میں ایسا محو کہ اس کا مطلب سمجھ نہیں سکا۔ میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھ کر کچھ پوچھنا چاہا تو وہ بول اٹھی۔ "میں اپنے کچھ اور معاملات کے بارے میں پوچھ رہی ہوں۔"

اس کے لبوں پر معنی خیز مسکراہٹ بکھر گئی۔ "آپ کچھ معاملات طے کرنا چاہتے تھے نا!"

مجھے یکایک یاد آیا تو میں اپنے آپ کو سمیٹ کر اٹھ بیٹھا۔ "جی!" میں نے اپنے بوجھل سر کو ایک جھٹکا دیا جو نشے سے بھاری ہو رہا تھا۔ "آپ کا کیس ایک ایسے نازک اور مشکل ترین مرحلے میں ہے کہ مجھے اس کے لئے بہت بڑا خطرہ مول لینا ہو گا۔ میری نوکری بھی جا سکتی ہے اور مستقبل بھی تباہ ہو سکتا ہے۔" میں رکا اور الفاظ موزوں کرنے لگا تاکہ اسے اور دہشت زدہ کر دوں۔ اسے اس کیس کی اہمیت بتا دوں' جبھی وہ مجھ سے تعاون کرنے پر مجبور ہو سکتی تھی۔

اس نے التجا آمیز لہجے میں کہا۔ "پلیز! مسٹر فرید! آپ کو میرے لئے کچھ نہ کچھ کرنا ہو گا۔ میں چاہتی ہوں کہ میرے ساتھ جو ناانصافی ہو رہی ہے' وہ نہ ہو۔"

"یہ سب کچھ ایک شرط پر ہو سکتا ہے۔"

"کیسی شرط؟" اس نے شدید حیرانی سے جواب دیا۔ "میں آپ کو پچاس ہزار روپے دے چکی ہوں۔"

"آپ اپنے کیس پر تین لاکھ روپے بھی خرچ کرلیں تو بھی وہ بہت کم ہیں۔" میں نے کہا۔ "اگر آپ نے ایک مرتبہ دل کھول کر رقم خرچ کر دی تو آپ اس کا فائدہ ہمیشہ اٹھاتی رہیں گی۔"

"تو کیا مجھے مزید ایک لاکھ روپے آپ کی نذر کرنے پڑیں گے؟"

میرے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ ابھر آئی۔ "لیکن میں اتنی بڑی رقم کے عوض آپ سے ایک حقیر سی شے چاہتا ہوں۔"

"کون سی شے؟" اس کی حسین آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ میں اس کے چہرے پر گہرے استعجاب کو نمایاں ہوتے ہوئے دیکھ کر جھک سا گیا اور کسی قدر تذبذب سے بولا۔

"زہر!" مجھے اپنی آواز کسی گہرے کنویں کی تہہ سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

"زہر!" وہ اپنی جگہ سے اچھل پڑی اور مجھے عجب انداز سے دیکھنے لگی۔ "آپ زہر کا کیا کریں گے؟"

میں نے چند ثانیے جواب دینے میں گریز کیا اور ڈھلکی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"مجھے ضرورت ہے۔"

"زہر تو بازار میں بھی مل سکتا ہے!" وہ متحیر اور پریشان نظر آ رہی تھی۔ "بازار میں ایسی بہت ساری چیزیں کھلے عام فروخت ہو رہی ہیں' جن میں زہر کی آمیزش ہوتی ہے۔"

"لیکن وہ میرے کام نہیں آ سکتا ہے۔"

"بازار میں سریع الاثر زہر بھی دستیاب ہے اور ہر کوئی جانتا ہے کہ اس زہر......"

میں نے فوراً ہی اس کی بات کاٹی۔ "مجھے ایک ایسے زہر کی ضرورت ہے جسے "سلو پائزن" کہا جاتا ہے' وہ اس طرح سے اور اس صورت میں ملے کہ اسے کھانے والا ایک دو مہینے میں اس دنیا سے رخصت ہو جائے۔" میں اسے اپنے مطلب کی بات سمجھانے لگا۔ "وہ انجکشن کی شکل میں نہیں بلکہ کیپسول کے اندر بھرا ہوا ہو تاکہ اسے دوا سمجھ کر کھایا جا سکے۔"

"لیکن مسٹر فرید!" یکایک اس کا لہجہ تند ہو گیا۔ "میں ایک ڈاکٹر ہوں۔ موت کا فرشتہ نہیں۔ ہم لوگ انسان کی جان بچانے کی خاطر اپنی جان کی بازی لگا دیتے ہیں۔ ہم زندگی دینے والے کسی کی زندگی کیسے چھین سکتے ہیں؟"

"لیکن آپ لوگ تو درندوں سے بھی سفاک ہیں۔" میں نے مزید کچھ کہنا چاہا تو اس نے مجھے کہنے کا موقع نہیں دیا۔

"اس بحث کا یہاں موقع نہیں ہے۔ آپ زہر مانگ رہے ہیں' کسی انسان کی جان لینے اور اس سے کھیلنے کے لئے؟"

"جی ہاں!" میں نے کھل کر اعتراف کیا۔ "مجھے اپنے اس دشمن کی جان لینی ہے' جس نے میری زندگی میں زہر گھول دیا ہے۔" میرا لہجہ سخت اور جذباتی ہو گیا۔ "میں اس

کے خون میں زہر گھول دینا چاہتا ہوں تاکہ وہ تڑپ تڑپ کر مرجائے۔"

اس کے لبوں پر چبھتی ہوئی مسکراہٹ ابھر آئی۔ "شاید اس بدنصیب کا نام کنول ہے؟"

"ایں!" میں بھونچکا ہو گیا اور میرا سر تیزی سے گھومنے لگا' پھر میں ششدر سا ہو گیا تھا کہ اسے کنول کے بارے میں کیوں کر معلوم ہوا۔ جب میرے چکر تھمے تو میں نے حیرت زدہ لہجے میں پوچھا۔ "آپ کیسے جانتی ہیں؟"

"میں نے اپنے جادو کے زور سے معلوم کر لیا ہے۔" اس کی آواز میں شوخی تھی۔

میں نے اس کے سراپا پر ایک نظر ڈالی اور زبردستی مسکرانے کی کوشش کی۔ "میں یہ تو تسلیم کرتا ہوں کہ آپ کسی جادوگرنی سے کم نہیں ہیں اور میں آپ کے طلسم کا اسیر بنا ہوا ہوں' لیکن آپ کے اس جادو پر مجھے شبہ ہے۔ شاید میری مدہوشی نے میرا راز منکشف کر دیا ہے؟"

"جی ہاں!" اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اس نے صاف دلی سے اعتراف کیا۔ "آپ نیند میں بڑبڑا رہے تھے۔ کنول! میں زندہ نہیں چھوڑوں گا' تمہیں قتل کر دوں گا۔ تم میری مہ جبیں کو چھین لینا چاہتی ہو۔ بس اب تم چند دنوں کی مہمان ہو؟"

میں سناٹے میں رہ گیا لیکن جلد ہی اپنے آپ کو سنبھال کر اس سے پوچھا۔ "آپ نے میرے بارے میں کیا سوچا؟"

"میں آپ کو مزید ایک لاکھ روپے دینا پسند کروں گی لیکن میں کسی انسانی زندگی سے نہ کھیلوں گی اور نہ ہی آپ کو کھیلنے کی اجازت دوں گی۔" وہ سرد مہری سے بولی۔

"تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ کی اور میری راہیں جدا جدا ہو گئیں۔"

"پلیز! آپ مجھے مجبور نہ کریں بلکہ کسی اور ڈاکٹر سے رجوع کریں!" اس کے لہجے میں عاجزی تھی۔ "یہ تم مجھے اپنے جرم میں کیوں گھسیٹ رہے ہو؟"

"جہاں زہر دینا اور انسانی زندگی سے کھیلنا جرم ہے' اسی طرح قومی دولت ہڑپ کرنا بھی ایسا ہی سنگین جرم ہے۔" میں نے ترپ کا پتا پھینکا۔ جب آپ ایک جرم کرنا چاہتی ہیں تو دوسرا جرم بھی سہی! آخر اس میں مضائقہ ہی کیا ہے۔ ہم دونوں ایک ہی حمام میں ہیں۔"

وہ متذبذب اور پریشان ہونے لگی۔ اس کی حسین آنکھیں سوچ میں غرق تھیں اور چہرے پر فکرمندی کے آثار تھے۔ میں نے جارحانہ انداز میں کہا۔ "دیکھئے مس یاسمین شہریار! ہمارے درمیان اب کوئی حجاب اور غیرت نہیں رہی۔ ہم دونوں ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ لہٰذا آپ میری مشکل حل کریں۔ مگر آپ نے ایسا نہیں کیا تو پھر آپ کی ساری دولت "پھر" سے اڑ جائے گی لیکن میرا کچھ نہیں بگڑے گا۔ آپ نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی! میں کسی کرائے کے قاتل کی مدد سے اپنی راہ کا پتھر ہٹا لوں گا۔"

یک لخت اس نے چونک کر پوچھا۔ "کنول کون ہے' یہ وہی لڑکی تو نہیں ہے جس نے اسٹیج کی دنیا میں دھوم مچا رکھی ہے؟"

"جی ہاں یہ وہی کنول صاحبہ ہیں!" میرا لہجہ طنز میں ڈوبا ہوا تھا۔ "اب آپ نے کیا سوچا' کیا فیصلہ کیا ہے؟"

"میں کنول کے فن سے متاثر ہو کر اس سے ایک دو مرتبہ مل بھی چکی ہوں۔" اس پر جیسے حیرتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ "آخر آپ کو اس کی ذات سے ایسی شدید نفرت اور دشمنی کس لئے ہو گئی ہے؟ آخر آپ اس کی جان لینے کے درپے کیوں ہیں؟ اگر آپ اس ہیرے کو پانے کے لئے' اپنے کسی رقیب کو زہر دینے کی سوچتے تو میں آپ کو حق پر سمجھتی' لیکن آپ؟" میں اسے کنول کی وکالت میں بولتے ہوئے پا کر جھنجلا گیا۔

"مجھے آپ کے ان قیمتی مشوروں کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" میرا لہجہ ضرورت سے زیادہ تلخ ہو گیا۔ "میں نے آپ سے زہر مانگا تھا' اگر آپ میری مدد کر سکتی ہیں تو بتا دیں؟ میں آپ کا انکار سننے کے لئے بھی تیار ہوں۔"

یکبارگی اس کی حسین آنکھوں میں ہزاروں بلب جگ مگ جگ مگ کرنے لگے' چہرہ دہک کر سرخ ہو گیا۔ وہ لہرائی اور میز پر رکھی ہوئی بوتل اٹھا کر' اسے کھولنے لگی۔ وہ کھنکتے ہوئے لہجے میں بولی۔ "آپ کے مزاج میں بڑی گرمی ہے۔" اس نے مجھے وارفتگی سے دیکھا۔ "پلیز! غصہ ترک کر دیں' ہم دونوں ایک دوسرے کے بغیر ایک قدم بھی نہیں چل سکتے۔ اب ہم لازم و ملزوم ہو کر رہ گئے ہیں' کیوں نہ اس خوشی میں ......؟" اس نے چھلکتا ہوا گلاس میری طرف بڑھایا۔ "ایک دور ہو ہی جائے؟ میں آپ کو ایسا زہر دوں گی کہ اس کا ڈنک...." اس نے کھل کھلا کر اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور میری طرف تیکھی نظروں

سے دیکھ کر اپنا گلاس بھرنے لگی۔ مجھے کیا انکار ہو سکتا تھا' ندیوں کے مانند پھر ایک بار پرانی شراب سے سیر ہونے لگا۔

جب میں صبح اس کے فلیٹ سے نکلا تو وہ بستر پر بڑی ترچھی ہو کر بکھری ہوئی پڑی تھی۔ اس پر کچھ ایسی مدہوشی کی کیفیت طاری تھی کہ وہ بستر سے اٹھ کر مجھے دروازے تک رخصت کرنے نہیں آسکتی تھی۔ میں اپنے گھر پہنچا تو مجھ پر ایک عجیب سی سرشاری چھائی ہوئی تھی۔ میرے سر سے ایک بہت بڑا بوجھ اتر گیا تھا۔ یاسمین شہریار میرے جال میں پھنس کر کسی پنچھی کے مانند بے بس ہو گئی تھی۔ وہ ایک ڈاکٹر نہیں بلکہ ایک طوائف سے بھی بدتر تھی۔ اسے ایک طوائف کے مانند دولت کی ہوس تھی۔ وہ اپنی دولت بچانے کے لئے اتنی دور جا سکتی تھی جتنی دور اسے لے جایا جائے' وہ اپنے لالچی پن سے میرا شکار ہو گئی تھی۔

مجھ پر اپنی کامرانی کا نشہ طاری تھا۔ میری خوشی کی انتہا اس لئے بھی نہیں تھی کہ میں نے آخر کار ایک معرکہ سر کر لیا تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کامیابیاں میرے قدم چومیں گی۔ نصیر نے مجھے قتل کرنے کی وحشیانہ حرکت کی تھی۔ اس کے اقدام قتل کی حرکت سے کل مجھے ہی فائدہ پہنچتا۔

یاسمین شہریار نے زہریلے کیپسول کی تیاری کے لئے مجھ سے دو تین دن کی مہلت مانگی تھی۔ اس نے مجھے تاکید کی تھی کہ میں اس کے کلینک پر نہ آؤں بلکہ جب کبھی آنا ہو' میں رات دس بجے اس کے فلیٹ پر پہنچ جاؤں .....وہ میرا انتظار کرے گی۔ میں نے اپنے دل میں سوچ لیا تھا کہ اس وقت تک اس کا مسئلہ حل نہیں کروں گا جب تک کنول مر نہیں جاتی۔ وہ ایک موٹی مرغی تھی۔ میں اس کے گلے پر کند چھری پھیرنا چاہتا تھا۔

میں نہا دھو کر کپڑے تبدیل کر کے' کھانے کے کمرے میں پہنچا تو بھوک کھل اٹھی۔ میز پر امی اور رضیہ موجود تھیں۔ میں ناشتہ کرتے وقت اپنے آپ میں مگن اور رات کے دل فریب تصور میں ڈوبا ہوا زیر لب مسکرا رہا تھا۔ معاً" رضیہ بول اٹھی۔ "آج بھائی جان اس قدر خوش ہیں جیسے انہیں ہفت اقلیم کی دولت مل گئی ہے۔"

میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ اور گہری ہو گئی۔ میں نے پلیٹ پر سے اپنی نگاہ اٹھا کر رضیہ کے چہرے پر مرکوز کر دی' رضیہ کا چہرہ آج مجھے کسی قدر نکھرا ہوا اور صاف شفاف سا

لگا جیسے اس کے چہرے پر سے جمی گرد کو شبنم کے قطروں نے چوم چوم کر دھو دیا ہو' لیکن دوسرے لمحوں میری رگوں میں جیسے خون ابل پڑا' میں غصے میں چیخ پڑا۔ "رضیہ!"

رضیہ کے ساتھ ساتھ امی نے چونک کر ایسی حیران حیران نظروں سے دیکھا جیسے مجھ پر اچانک پاگل پن کا دورہ پڑ گیا ہو۔ وہ دونوں وحشت زدہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگیں۔ میں نے اپنی مٹھی کس کر' غصے سے دانت پیستے ہوئے میز پر اتنی زور سے مکا مارا کہ میز پر رکھے ہوئے سارے برتن بج اٹھے۔ رضیہ کے ہاتھ میں چائے کی پیالی لرز گئی۔ اس نے امی کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ میں نے ہذیانی لہجے میں پوچھا۔ "یہ آویزے کہاں سے آئے ہیں؟"

"آویزے؟" رضیہ کے ہاتھ کانپنے لگے' پیالی میں سے چائے چھلک پڑی' اس پر سراسیمگی طاری ہو گئی' اس کا چہرہ فق ہو کر رہ گیا اور میں نے کھڑے ہو کر کرسی کو پیچھے کی جانب دھکا دے کر گرا دیا اور گرجتے ہوئے پوچھا۔ "بتاتی کیوں نہیں ہو کہ یہ آویزے کہاں سے آئے؟"

اسی وقت اندر سے رئیسہ بھاگتی ہوئی آئی۔ میں غیظ و غضب کی حالت میں کانپنے لگا تو امی نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ "بیٹے! تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ یہ آویزے کوئی چوری کا مال تو نہیں ہے۔ کل ہی اس کی سہیلی نے تحفے میں دیئے ہیں۔ اس میں اس قدر چراغ پا ہونے کی کیا بات ہے؟"

میں نے امی کا ہاتھ جھٹک دیا۔ "میں آپ سے نہیں' رضیہ سے پوچھ رہا ہوں۔" میں رضیہ کو گنگ پا کر اور بھڑک گیا۔ "میری بات کا جواب کیوں نہیں دیتیں؟"

رضیہ نے چائے کی پیالی طشتری میں رکھ دی۔ اس کا چہرہ پسینے میں بھیگ گیا اور آنکھوں سے جرم کا احساس جھلکنے لگا۔ اس نے پلکیں جھپکا کر نظریں نیچی کر لیں۔ "امی جو کچھ کہہ رہی ہیں' سچ ہے۔" اس کی آواز حلق میں پھنس رہی تھی۔ "یہ آویزے میری ایک سہیلی نے مجھے تحفے میں دیئے ہیں۔"

"اس سہیلی کا نام کیا ہے؟" میرا جسم لرزنے لگا۔

وہ گڑبڑا سی گئی۔ اس نے میری جانب دیکھا تو میری خون برساتی آنکھوں نے اس کے اوسان خطا کر دیئے۔ اس کی زبان لڑکھڑانے لگی۔ "میری ایک سہیلی ہے شبانہ! اس نے

مجھے یہ تحفہ دیا ہے۔"

"لیکن بیٹی!" امی نے چونک کر بے یقینی کے انداز میں کہا۔ "تم نے تو مجھے بتایا تھا کہ .... یہ تحفہ نائلہ نے دیا ہے۔"

"ہم..... میں نے جانے کس خیال میں کہہ دیا تھا۔" وہ ہکلانے لگی۔

"تم جھوٹ بول رہی ہو!" میں نے میز پر رکھی ہوئی چھری اٹھائی تو امی تڑپ کر کھڑی ہو گئیں۔ ادھر رضیہ کا چہرہ ہلدی کے مانند پیلا پڑ گیا۔ امی چیخ پڑیں۔

"فرید! تمہیں بیٹھے بٹھائے اچانک کیا ہو گیا ہے؟"

"میں اسے جان سے مار دوں گا۔" میں نے وحشت سے کہا۔ "یہ آویزے اسے نائلہ نے نہیں دیئے ہیں۔"

"اگر اسے یہ آویزے نائلہ نے نہیں دیئے ہیں تو کسی اور سہیلی نے دیئے ہوں گے۔" امی میرا گریبان پکڑ کر چکارنے لگیں۔ "آخر تو اس قدر غصے کیوں ہو رہا ہے؟" امی کا لہجہ تند ہو گیا۔ "یہ دو سہیلیوں کا معاملہ ہے۔ اگر کوئی ایسی قیمتی چیز تحفے میں دے تو کیا ہم اسے منع کر دیں۔ یہی ہو سکتا ہے کہ کسی موقع پر ہم اس کا قرض چکا دیں۔"

مجھ پر جنون طاری ہونے لگا۔ میں نے چھری میز پر دے ماری اور بھرائی ہوئی آواز میں چیخ کر کہا۔ "آپ اس کمینی سے پوچھیں۔ کیا اس نے ان قیمتی آویزوں کے بدلے اپنی متاع حیات نہیں لٹا دی؟ کیا اس شخص کا نام یامین نہیں ہے؟"

رضیہ کی آنکھیں خوف سے پھٹ گئیں اور وہ اس طرح دہل کر رہ گئی جیسے میں نے چھری اس کے سینے میں اتار دی ہو۔ دوسرے لمحے وہ چکراتی ہوئی کرسی سے نکل کر فرش پر گری اور بے ہوش ہو گئی۔

مجھے اس وحشت کے عالم میں دفتر نہیں آنا تھا لیکن میں پھر بھی آ گیا۔ ایک نئی افتاد میرے گھر پر آن پڑی تھی۔ میں وہاں رہ کر کیا کرتا! اگر میں وہاں رکتا تو شاید میرے ہاتھوں سے رضیہ کا خون ہو جاتا۔ امی نے آخر میرے منہ پر یہ کہہ کر تھوک دیا تھا کہ "تو کون سا پاک باز ہے۔" یہ ایک خنجر تھا جو میرے سینے میں اتر گیا۔ یہ ایک سچ تھا جو زہر سے زیادہ کڑوا تھا۔ میں نے دوسروں گھروں کی عزتیں لوٹی تھیں اور آج میرے گھر کی عزت لٹ گئی تھی۔ میں اپنی کرسی پر بیٹھا تو میرا دماغ ماؤف تھا۔ ہر چیز کاٹنے کو دوڑ رہی تھی۔ میں نے

اپنے دل میں فیصلہ کر لیا تھا تھا کہ یہاں سے نکل کر کسی ریستوران یا پارک کے کسی گوشے میں جا بیٹھوں گا۔ شاید کسی طور میرے دل کو قرار ملے۔

میں نے سوچا بھی تھا کہ یامین سے ملوں اور اسے قتل کر دوں۔ لیکن یامین سے الجھ کر میں اپنی مٹی اور خراب کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس میں یامین کا کوئی قصور نہیں تھا۔ سارا کیا دھرا اور غلطی رضیہ کی تھی۔ رضیہ کی نہیں بلکہ میری تھی۔ میری نہیں بلکہ امی کی تھی۔ دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا۔ میں اندر ہی اندر کھولنے لگا۔ آخر امی دن بھر گھر میں بیٹھی کیا کرتی رہتی ہیں؟ انہیں اپنی جوان بیٹیوں کی پرواہ کیوں نہیں ہے؟ وہ ان کے لباس اور بے راہ روی تک سے غافل ہو کر رہ گئی ہیں۔

میں دفتر سے باہر نکل رہا تھا کہ چپڑاسی نے آ کر مجھے بتایا کہ میرا کوئی ٹیلی فون آیا ہے۔ میں ٹیلی فون کی جانب لپک گیا' دوسری طرف فخرو بھائی تھے۔ ان کی آواز میں ارتعاش تھا۔ "فرید بھائی! جلدی سے کنول کے ہاں پہنچو۔"

"کیا ہوا؟" میں گھبرا گیا۔ "خیریت تو ہے؟"

"بس خیریت ہی نہیں ہے!" فخرو بھائی حواس باختہ ہو رہے تھے۔ "تم جلدی سے پہنچو' میں ٹیلی فون پر کچھ نہیں بتا سکتا۔" انہوں نے میرے جواب کا انتظار کئے بغیر کھٹاک سے ٹیلی فون رکھ دیا۔

میں سمجھ گیا کہ بات بڑی نازک ہے۔ غالباً" نصیر نے دیوانگی میں کوئی سنگین قدم اٹھا لیا ہے۔ اگر نصیر نے کنول کو ختم کر دیا ہے تو یہ میرے لئے بہت بڑی اور اہم خبر تھی' ایک ایسی خبر جس سے میری زندگی کا رخ یکسر بدل سکتا تھا۔ میں طرح طرح کے خیالات اور اندیشوں میں جکڑا' سنسناتے ہوئے تیر کی مانند کنول کے ہاں پہنچا تو فخرو بھائی کو بے چینی سے برآمدے میں ٹہلتے ہوئے دیکھا۔ کنول کے تینوں نوکر افسردگی سے سر جھکائے یوں بیٹھے تھے جیسے اس گھر میں موت ہو گئی ہو۔

میں نے جیسے ہی احاطے میں اسکوٹر روکا' فخرو بھائی برآمدے سے نکل کر بڑی تیزی سے میرے پاس آئے۔ میں ان کے ہم راہ ملاقاتی کمرے میں بڑھا تو وہ بولے۔ "کنول کو اغوا کر لیا گیا ہے!"

میں چلتے چلتے ٹھٹک کر رک گیا۔ مجھے اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔ میں نے حیرت

زدہ ہو کر کہا۔ "کنول اغوا کر لی گئی ہیں؟" میں یہ سمجھا کہ فخرو بھائی سٹھیا گئے ہیں۔ میں نے انہیں گھورتے ہوئے پوچھا۔ "فخرو بھائی! خیریت ہے تو ہو؟ کنول کو کس نے اغوا کیا؟ اسے اغوا کون کر سکتا ہے؟"

"اسے نصیر نے اغوا کر لیا ہے۔" فخرو بھائی نے جز بز ہو کر کہا۔ "شاید تم نہیں جانتے' وہ کس قدر خطرناک آدمی ہے۔"

میں نے بظاہر اچھل کر اپنی حیرت کا اظہار تو کیا لیکن اندرونی طور پر دل بہت خوش ہوا۔ جان چھوٹی' سر سے ایک بلا تو ٹلی۔ نصیر جیسا بدمعاش کنول کا جو بھی حشر کرے' مجھے اس کی فکر نہیں تھی۔ نصیر نے کنول کو اس لئے اغوا کیا کہ اس نے نصیر کے ڈراموں میں پارٹ ادا کرنے سے انکار کر دیا تھا اور وہ مجھ سے آدی کرنا چاہتی تھی۔

جب ہم دونوں ملاقاتی کمرے میں آئے تو تینوں نوکر بھی ہمارے پیچھے پیچھے اندر داخل ہو گئے۔ میں اور فخرو بھائی صوفے پر بیٹھ گئے' یہ تینوں ایک ساتھ ایک جگہ کھڑے تھے۔ گل مجھے تفصیلات بتانے لگا۔

"نصیر صاحب ایک گھنٹے بعد نارمل ہو گئے۔ انہوں نے کنول سے اپنے رویے اور حرکتوں کی معافی مانگی۔ انہوں نے کنول سے کہہ دیا کہ اب اسٹیج ڈراموں کے لئے وہ کوئی نئی کنول تلاش کر لیں گے۔ رات آٹھ بجے نصیر صاحب نے بازار سے مٹھائی منگوا کر ہم سب کو کھلائی اور ایک سو روپے کا نوٹ دے کر کہا کہ تم تینوں فلمیں دیکھ کر آؤ۔ ہم تینوں آخری شو دیکھنے چلے گئے۔ رات گئے لوٹے تو گھر خالی پڑا' سائیں سائیں کر رہا تھا۔ پہلے تو ہم یہ سمجھے کہ وہ دونوں فلم دیکھنے گئے ہوں گے۔ رات دو بجے تک ان لوگوں کی واپسی نہیں ہوئی تو تشویش ہوئی۔ جب ہم تینوں کنول کے کمرے میں گئے تو اس کی حالت بتا رہی تھی کہ یہاں کوئی دھینگا مشتی ہوئی ہے۔ سارا سامان بے ترتیب پڑا تھا۔ کیا کریں؟ کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ صبح ہوتے ہی بٹ گیا اور فخرو بھائی کو بلا لایا۔ فخرو بھائی کا بھی یہی کہنا ہے کہ کنول کو اغوا کر لیا گیا ہے۔" جب گل تفصیلات سنا چکا تو فخرو بھائی نے ان تینوں کو باہر بھیج دیا۔

کل کے سنگین واقعے کے پس منظر سے کنول کے گھر کے نوکر پوری طرح واقف نہیں ہو سکے تھے۔ وہ لوگ فخرو بھائی کو کوئی بات ٹھیک سے بتا نہیں سکے تھے۔ وہ اس اغوا کا

محرک جاننے کے لئے کل میرے ساتھ پیش آنے والا واقعہ سننا چاہتے تھے۔ جب میں نے اصل بات من و عن بتائی تو وہ دنگ رہ گئے اور چند لمحوں کے بعد چونک کر بولے۔ "بھائی اگر تم واقعی اتنی دور چلے گئے ہو تو کنول کے ساتھ نا انصافی مت کرنا۔ کسی نہ کسی طرح کنول کا پتا لگا کر اس غریب کو اس ذلیل آدمی کے پنجے سے نجات دلاؤ اور فوراً" ہی اس سے شادی کر لو۔" ان کے لہجے میں ترحم تھا۔ "اس لڑکی نے تمہاری خاطر کیا کچھ پاپڑ نہیں بیلے؟ وہ محض تمہاری خاطر عزت' شہرت اور دولت کو ٹھکرا رہی ہے' لیکن تم پتھر کے بنتے جا رہے ہو؟"

میں نے ایک بار پھر فخرو بھائی پر واضح کر دیا کہ میں اپنے دل سے مہ جبیں کا خیال نہیں نکال سکتا۔ میں نے نصیر کے ہاتھوں سے کنول کو چھٹکارا دلانے کے لئے معذوری کا اظہار کیا۔

فخرو بھائی کو میری بات ناگوار گزری تھی۔ وہ خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگے اور پھر یک لخت چونک کر بولے۔ "کیا تمہیں اس بات کا اندازہ ہے کہ نصیر نے کنول کو کیوں اغوا کیا ہے؟"

میں نے اثباتی انداز میں سر ہلا کر جواب دیا۔ "بات صاف ہے' کنول نے اداکاری کرنے سے انکار کر دیا تو وہ چراغ پا ہو گیا' کیوں کہ وہ نہیں چاہتا کہ سونے کے انڈے دینے والی مرغی ہاتھ سے نکل جائے۔"

"تم غلط سمجھے!" فخرو بھائی پر اسرار لہجے میں گویا ہوئے۔ "شاید تم دل میں یہ سوچ کے خوش ہو رہے ہو گے کہ میری جان چھوٹی؟ نہیں فرید بھائی' تمہاری جان نہیں چھوٹی بلکہ ایک اور عذاب میں پھنس گئی ہے۔"

"آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟" میں نے شدید حیرانی سے پوچھا۔ "میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا؟"

"اس نے کنول کو اس لئے اغوا کیا ہے کہ وہ تمہیں بلیک میل کر سکے!"

"وہ مجھے بلیک میل کرے گا؟ لیکن کس طرح؟" میں ہونقوں کی طرح انہیں دیکھنے لگا۔

"کیا تم بچے ہو جو ایک چھوٹی سی بات نہیں سمجھ رہے ہو؟" فخرو بھائی نے کہا۔ "وہ

تم سے انتقام لینے پر تل گیا ہے کیوں کہ تم نے اس کے مستقبل کا ستیاناس کر دیا ہے۔ اس نے شاید کنول کو یہ کہہ کر ورغلایا ہو گا کہ تم فرید کو بلیک میل کر کے نہ صرف اس کی دولت ہتھیا سکتی ہو بلکہ اس سے شادی بھی کر سکتی ہو۔ تمہارے پاس ایک ایسا ٹرمپ کارڈ موجود ہے جو فرید کو نچا سکتا ہے۔" فخرو بھائی میرے چہرے پر الجھن کے آثار دیکھ کر بولے۔ "جبھی کنول نے یہ تاثر دیا ہے کہ اسے زبردستی اغوا کر لیا گیا ہے تاکہ تم اس کی تلاش میں خوار ہوتے رہو اور ایک روز وہ تمہارا بچہ تمہارے قدموں میں ڈال دے گی۔ کیا سمجھے برخوردار؟"

میرا سینہ اندر سے لپٹنے لگا۔ میں رضیہ کے واقعے سے اس قدر رنجیدہ اور ملول ہو گیا تھا کہ دل اچاٹ ہو کر رہ گیا۔ سینے میں ایک گہرا گھاؤ پڑ چکا تھا جس سے درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ کنول کا اغوا مرے پر سو درے تھے لیکن کنول ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ یہ مذموم حرکت نصیر کی تھی۔ اس نے کنول کو اغوا اس لئے کیا تھا کہ مجھے بلیک میل کیا جا سکے۔ فخرو بھائی نے میری خوش فہمی دور کر دی تھی اور میں بھنور میں پھنس گیا تھا جس سے نکلنا میرے لئے ناممکن تھا۔

ہم دونوں سر جوڑ کر بیٹھے رہے اور سوچنے لگے۔ نصیر کنول کو اغوا کر کے کہاں اور کس مقام پر لے گیا' ہم دونوں کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی۔ خاصی دیر کے بعد فخرو بھائی نے مجھ سے کہا۔ "بٹ' نصیر کا پرانا ملازم ہے' ممکن ہے وہ جانتا ہو کہ نصیر' کنول کو کس جگہ لے گیا ہے۔ اگر تم اس کی جیب گرم کر دو تو شاید وہ کوئی ٹھکانہ بتا سکے۔"

فخرو بھائی میرا عندیہ لے کر کمرے سے باہر نکل گئے۔ کچھ دیر بعد وہ لوٹے تو بٹ ان کے ساتھ تھا۔ میں نے اپنے پرس سے سو روپے کا ایک نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھایا تو اس نے کسی بچے کی مانند' مٹھائی سمجھ کر اسے جھپٹ لیا۔ فخرو بھائی نے بڑی محبت سے اس کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ "شاید تمہیں معلوم ہو گا کہ نصیر کنول کو کہاں لے گیا ہے؟"

"جی نہیں!" بٹ صاف طور پر انکاری ہو گیا۔ "مجھے نہیں معلوم' وہ کنول کو کہاں لے گیا ہے؟" بٹ کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ دانستہ ہم سے کوئی بات چھپا رہا ہے اور اسے نصیر کے ٹھکانے کی بابت علم ہے۔ نصیر نے اسے جاسوس بنا کر آنٹی کے ہاں' اس لئے رکھا

تھا کہ اسے کنول اور آنٹی کی سرگرمیوں کے بارے میں پل پل کی خبریں ملتی رہیں۔ وہ شاید اس سازش کی بھی ایک کڑی تھا۔ فخرو بھائی اس کے شکار سے مایوس نہ ہوئے بلکہ کسی قدر تیزی سے بولے۔

"تم صرف ٹھکانہ بتا دو' ہم خود نصیر صاحب سے نمٹ لیں گے۔" فخرو بھائی کا لہجہ دھمکی آمیز ہونے لگا۔ "اگر تم نے نصیر صاحب کے ٹھکانے کے بارے میں نہیں بتایا اور کنول کو کچھ ہو گیا تو ہم سارا الزام تم پر دھر دیں گے کیوں کہ تم نصیر صاحب کے ملازم ہو' پولیس تمہیں بھی قتل کے الزام میں گرفتار کرلے گی۔"

فخرو بھائی کا چلایا ہوا تیر اپنے نشانے پر بیٹھا۔ بٹ ایک دم بدحواس سا ہو گیا اور متذبذب ہو کر بولا۔ "لیکن نصیر صاحب! مجھے بخشیں گے نہیں۔"

میں نے اپنی جیب سے سو روپے کا ایک نوٹ نکال کر اس کی جانب لہرایا۔ "یہ تمہیں انعام میں اس وقت مل سکتا ہے' جب تم اس کے ٹھکانے کے بارے میں بتاؤ گے۔"

وہ کئی لمحوں تک متذبذب کا شکار رہا۔ آخر کار اس نے زبان کھولی۔ "وہ کنول کو ملیر کے علاقے میں' اپنے ایک بنگلے میں لے گئے ہیں۔" بٹ نے ایک کاغذ پر نقشہ بنا کر مجھے پتہ سمجھایا۔ میں نے اس سے پوچھ پوچھ کر پتہ اچھی طرح ذہن نشین کرلیا۔ میں نے سو روپے کا نوٹ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا اور وہ خوش ہو گیا۔

فخرو بھائی نے اس سے دریافت کیا۔ "کیا اس بنگلے میں غنڈے یا بدمعاش رہتے ہیں۔ اگر ہیں تو ان کی تعداد کتنی ہوگی؟"

"اس بنگلے میں ایک بوڑھا مالی رہتا ہے۔" بٹ نے جواب دیا۔ "اس بنگلے کا گیٹ اور اس کی دیواریں اتنی اونچی ہیں کہ ایک آدمی آسانی سے انہیں نہیں پھلانگ سکتا۔"

میں نے بغیر کسی تاخیر کے اسی وقت فخرو بھائی کو اپنے ساتھ لیا اور بڑی تیزی سے سکوٹر اڑاتا ہوا ملیر کی جانب روانہ ہو گیا۔ میں دن کی روشنی میں اس بنگلے کو ایک نظر دیکھنا چاہتا تھا۔ اس بنگلے کے اندر داخل ہونے کا راستہ بھی تلاش کرنا تھا کیونکہ بٹ نے ہم سے کہا تھا کہ اس کا گیٹ اور دیواریں اتنی اونچی اونچی بنی ہوئی ہیں کہ ان پر چڑھنا ایک دشوار کام ہے۔ جب ہم اس بنگلے پر پہنچے تو بٹ کی باتوں کی تصدیق ہو گئی۔ اس کی منڈیر پر پہنچنا واقعی مشکل تھا لیکن گیٹ پر سے چڑھ کر اندر اتر جانا اتنا دشوار بھی نہیں تھا۔ میں ایک

طرح سے مطمئن ہو گیا۔ یہ بنگلہ ملیر ندی کے مشرقی حصے کے ایک ویرانے میں بنا ہوا تھا۔ اس کے قرب و جوار میں کوئی مکان دکھائی نہیں دیا۔

میں نے اس بنگلے کے تین چار چکر لگائے جو چار ہزار گز کے اندر بنا ہوا تھا۔ باہر سے کچھ اندازہ نہیں ہو سکا کہ اس بنگلے کے اندر کتنے آدمی موجود ہیں۔ یہاں کسی شخص کی موجودگی کا گمان بھی نہیں ہو رہا تھا۔ اگر کنول قید کی گئی ہو گی تو اسے کس کمرے میں رکھا گیا ہو گا؟ بنگلے پر ایک گہرا سناٹا طاری تھا۔ میں اس سے فائدہ اٹھا کر بنگلے کے اندر کود جانا چاہتا تھا۔ معاً میرے دل میں شبے کی ایک لہر اٹھی کہ کہیں بٹ نے جھوٹ بول کر ہمیں دھوکا تو نہیں دیا۔ جب میں نے اپنا خیال فخرو بھائی پر ظاہر کیا تو انہوں نے بڑے وثوق سے کہا۔ "میں بٹ کے مزاج کو جانتا ہوں' وہ ایک اچھا آدمی ہے۔ آنٹی کی ناگہانی موت کے بعد اس کی ساری ہمدردیاں کنول کے ساتھ وابستہ ہو گئی ہیں۔"

رات دس بجے میں نے فخرو بھائی کو اپنے ساتھ لیا تو ایک ہاکی ان کے ہاتھ میں تھما دی جو محلے کے ایک لڑکے سے مانگ کر لایا تھا۔ میں نے بازار سے ایک چاقو بھی خرید کر جیب میں رکھ لیا تاکہ حفظ ماتقدم کے طور پر ساتھ رہے۔ جانے کیسے حالات پیش آئیں۔ ان دونوں چیزوں سے اپنی اپنی جانوں کا دفاع اور حفاظت کی جا سکتی تھی۔ لیکن فخرو بھائی پر خوف و ہراس کی سی کیفیت طاری تھی۔ وہ مجھے دہشت زدہ انداز سے پکڑے ہوئے تھے اور مرتعش آواز میں بار بار کہتے تھے۔ "ارے فرید بھائی! وہاں زیادہ دنگا ونگا مت کرنا۔ اگر زیادہ بدمعاش ہوئے تو واپس لوٹ آنا۔ خون خرابے سے کچھ حاصل نہیں ہو گا' ہم لوگ پولیس کو اطلاع دے دیں گے۔ کیا سمجھے؟ کیوں فرید بھائی! تم ساری بات سمجھ گئے نا!"

میں نے زیر لب مسکرا کے اثبات میں سر ہلا دیا۔ کوئی دو مرتبہ ان کے ہاتھ سے ہاکی چھوٹ کر سڑک پر گر پڑی تھی۔ مجھے احساس ہوا کہ وہ لحہ بہ لحہ خوف زدہ ہوتے جا رہے ہیں اور ان کا چہرہ دل کے مریض کی طرح سفید ہو کر رہ گیا ہے۔ میں نے انہیں تسلی و تشفی دی' حوصلہ بڑھایا' ایک کولڈ ڈرنگ کارنر پر ٹھنڈے مشروب کی بوتل پلائی تو ان کے اعصاب کسی قدر معمول پر آئے۔

اگر چاندنی رات نہ بھی ہوتی تو تب بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کسی بھی قسم کی کامیابی کے لئے اندھیرا بڑا مددگار ثابت ہوتا ہے۔ جب ہم اس بنگلے کے گیٹ پر پہنچے تو فخرو بھائی

لرزتی ہوئی آواز میں چیخے۔ "فرید بھائی! گیٹ کھلا ہوا ہے۔"

میں نے سکوٹر روک دیا۔ گیٹ کے دونوں پٹ پوری طرح کھلے ہوئے تھے اور باہر سے بنگلے کا برآمدہ دکھائی دے رہا تھا' جس میں ایک ہلکی سی روشنی ٹمٹمارہی تھی۔ میرے ذہن میں بجلی کی سی تیزی سے جو خیال آیا' وہ یہ تھا کہ شاید کنول فرار ہو گئی ہے۔ کیونکہ گیٹ کھلا ہوا تھا۔ فخرو بھائی سکوٹر کے بلب کی روشنی میں زمین پر دیکھ رہے تھے۔ یک لخت انہوں نے میرا شانہ پکڑ کر ہلایا۔ "فرید بھائی! یہ دیکھو!" انہوں نے ہاکی لہرا کر زمین کی طرف اشارہ کیا۔ "کسی کار کے پہیوں کے نشانات ہیں۔" میں نے جھک کر دیکھا تو محسوس ہوا کہ کچھ دیر پہلے یہاں سے کوئی کار بڑی تیزی سے گزری ہے۔

میں نے سکوٹر دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا اور فخرو بھائی کا بازو پکڑ کر انہیں اندر کی جانب بڑھا۔ ان کا جسم کسی خزاں رسیدہ پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔ ان کی حالت غیر ہوئی جا رہی تھی' تاہم میں نے اس کی پرواہ نہیں کی۔ ان کی موجودگی سے میرے دل کو بڑی ڈھارس بندھی ہوئی تھی۔ میرا حوصلہ بلند ہوتا جا رہا تھا۔ جب ہم دونوں برآمدے میں سے ہوتے ہوئے' اس کمرے میں داخل ہوئے جس کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور اندر روشنی ہو رہی تھی تو ہم یکایک اچھل کر ساکت ہو گئے۔ اس کمرے کے فرش پر نصیر زخمی حالت میں بے ہوش پڑا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ لہولہان نظر آیا۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی نے مار مار کر بھرکس نکال دیا ہو۔ میری اور فخرو بھائی کی حیرت اور سوالیہ نظروں کا تبادلہ ہوا۔ ظاہر ہے' اس کی یہ درگت کنول تنہا نہیں بنا سکتی تھی۔ یہ کسی وحشی انسان ہی کا کام تھا۔ کمرے کا بکھرا ہوا سامان بتا رہا تھا کہ کم از کم چار پانچ آدمیوں نے مل کر اپنی قوت کا مظاہرہ کیا ہے۔ فخرو بھائی تو نصیر پر جھک گئے اور میں نے جانے کس امید پر آوازیں دیں۔ "کنول! کنول!"

یک لخت اس کمرے سے ملحق غسل خانے کے اندر کھٹ کھٹ ہونے لگی اور ایک غیر مانوس مردانہ آواز گونجی۔ "دروازہ کھولو۔ خدا کے لئے دروازہ کھولو۔" میں حیران سا دروازے کے پاس پہنچا تو خیال آیا کہ شاید چوکیدار ہو گا۔ جب میں نے دروازہ کھولا تو میرا قیاس درست نکلا۔

چوکیدار ایک ادھیڑ عمر کا شخص تھا اور حد سے زیادہ پریشان اور خوف زدہ دکھائی دے رہا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر چونکا' پھر فخرو بھائی پر اس کی نظر پڑی تو اس کا خوف کسی قدر کم ہوا۔

اس نے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ "آپ لوگ کون ہیں؟" میں نے یکبارگی پلٹ کر نصیر کی جانب دیکھا' وہ ہولے ہولے کراہ رہا تھا اور فخرو بھائی آہستہ آہستہ اس کا شانہ ہلا کر اسے ہوش میں لانے کی کوشش کر رہے تھے۔

"نصیر بھائی' او نصیر بھائی' جاگو! ہم تمہاری مدد کو آ گئے ہیں۔" میں نے چوکیدار کی طرف گھوم کر کہا۔ "ہم دونوں نصیر صاحب کے دوست ہیں۔" میں نے اپنے سینے میں سانسیں روک کر کہا۔ "یہ بتاؤ کنول کہاں ہے؟"

"کنول؟" چوکیدار کی آنکھیں انجانے خوف سے پھٹ گئیں اور اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ "یہاں ایک عورت اور اس کے ساتھ چار بدمعاش آئے تھے' وہ کنول کو اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔ جاتے جاتے انہوں نے نصیر صاحب کی پٹائی کر دی اور مجھے غسل خانے میں بند کر گئے۔"

میں نے ششدر ہو کر پوچھا۔ "عورت! کون عورت تھی وہ؟ کیا تم اسے جانتے ہو؟"

اس نے نفی میں اپنا سر ہلایا' اس کی آواز کپکپانے لگی۔ "میں نے اسے اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ یہیں دیکھا تھا لیکن میں نے ایسی خطرناک اور زوردار عورت کبھی نہیں دیکھی۔" اس کے جسم میں جھرجھری سی آ گئی۔ "صاحب! وہ تو شیرنی تھی شیرنی! اس نے نصیر صاحب کے منہ پر ایک ایسا طمانچہ رسید کیا کہ وہ زمین پر گرے تو فوراً" اٹھ نہیں سکے تھے۔"

چوکیدار نے اس عورت کا تذکرہ اس انداز سے کیا کہ میرے جسم میں بھی نامعلوم خوف سے جھرجھری آ گئی۔ میں نے بے یقینی سے پوچھا۔ "کیا وہ لوگ اپنے ساتھ کنول کو زبردستی لے گئے ہیں؟"

"جی نہیں۔" چوکیدار دیوار کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا۔ "وہ عورت اور بدمعاش اس لڑکی کے ساتھی معلوم ہوتے تھے۔" میں چونک سا گیا۔ وہ کون عورت تھی جو کنول کی مدد کو یہاں پہنچ گئی؟ میرے ذہن میں کتنے ہی سوالات ابھرنے لگے۔ اس عورت کو کیسے خبر ہوئی کہ کنول کو اغوا کر کے اس جگہ چھپا دیا گیا ہے؟ اس نے نہ صرف اس ٹھکانے کا سراغ لگایا بلکہ وہ کنول کو چھڑا کر بھی لے گئی تھی۔ وہ عورت جو کوئی بھی تھی نصیر اور کنول کو جانتی تھی بلکہ نصیر کو شاید اس قدر قریب سے جانتی تھی کہ اسے نصیر کے ارادوں کا علم ہو

گیا تھا جبھی تو وہ یہاں آسانی سے پہنچ بھی گئی تھی۔

میری نگاہ ایک سیاہ رنگ کی چمکتی ہوئی چیز پر پڑی جو فرش پر میز کے نیچے پڑی دکھائی دی۔ میں نے تیزی سے آگے بڑھ کر اسے اٹھایا تو وہ ایک بھرا ہوا پستول تھا۔ میں وہ پستول لے کر چوکیدار کے پاس پہنچا تو اس کا چہرہ فق ہو کر رہ گیا۔ میں نے اس پر سراسیمگی طاری دیکھ کر پوچھا۔ "یہ پستول کس کا ہے؟"

اس کے حلق سے پھنسی ہوئی آواز نکلی۔ "نصیر صاحب کا!"

"تمہارے صاحب اس پستول سے کوئی کام نہیں لے سکے؟" میں نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

"وہ تو اس پستول سے اس لڑکی کو دھمکا رہے تھے۔" چوکیدار کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ وہ اپنے الفاظ پر جیسے پریشان دکھائی دینے لگا۔ اس نے میرے چہرے پر حیرت کے آثار دیکھے تو بات بناتے ہوئے بولا۔ "نہیں جی! میرا مطلب ہے ....." اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ میں نے اس کے سینے پر پستول رکھ دیا۔ "سچ سچ بتاؤ! نہیں تو میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

وہ خوف سے تھر تھر کانپنے لگا۔ اس کی پیشانی اور جبڑوں پر پسینے کی بوندیں ابھر آئی تھیں۔ "میں بتاتا ہوں۔" اس کی آواز حلق میں پھنسنے لگی۔ "صاحب اس لڑکی کو پستول دکھا کر ڈرا رہے تھے اور جان سے مار دینے کی دھمکیاں دے رہے تھے۔"

"کیوں؟" میں نے اس کے سینے پر سے پستول ہٹا کر اس کا گریبان پکڑ لیا۔ "پوری کہانی سناؤ۔" میں نے اس کی کنپٹی پر پستول رکھ دیا تو اس کی حالت اور غیر ہونے لگی۔ "آپ وعدہ کریں جی! کہ صاحب سے نہیں کہیں گے؟" وہ تھوک نگلنے لگا تو میں نے اس کا گریبان چھوڑ دیا۔

میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "میں اسے اپنے سینے میں راز رکھوں گا۔"

"نصیر صاحب اس لڑکی کو کوئی دوا کھلانا چاہ رہے تھے۔" اس نے سہم کر کہنا شروع کیا۔ "دو گولیاں تھیں، لیکن وہ لڑکی انہیں کھانے سے صاف انکار کر رہی تھی۔ نصیر صاحب نے اس کے سینے پر پستول بھی رکھ دیا تھا، پھر بھی وہ اپنی ضد پر اڑی رہی۔" چوکیدار کی سانسیں سینے میں الجھتی جا رہی تھیں۔ وہ خاموش ہو کر گہری سانسیں لینے لگا تو میری الجھن

اور بے تابی بڑھنے لگی۔

میں نے اس کے گریبان کو جھٹک دیا۔ "جلدی بتاؤ' ورنہ تمہارا صاحب ہوش میں آ جائے گا۔"

"وہ کہہ رہی تھی کہ یہ بچہ میرا ہے' میری محبت کی نشانی ہے' میں اسے قتل نہیں کروں گی۔ میں اس کے لئے اپنی جان بھی دے سکتی ہوں۔" چوکیدار ٹھہر ٹھہر کر کہنے لگا۔ لیکن نصیر صاحب کہہ رہے تھے۔ "اگر تم بچے کی ماں بن گئیں تو میرے کاروبار کا ستیاناس ہو جائے گا۔ تم اور میں دونوں بھوکے مرجائیں گے۔ میں نے تمہاری زندگی بچانے کے لئے ہزاروں روپے خرچ کئے ہیں' آخر وہ رقم کون دے گا۔" لڑکی نے کہا تھا کہ وہ رقم میں دوں گی۔ ان دونوں کے درمیان آپس میں تکرار ہو رہی تھی کہ اچانک چار مسلح بدمعاش اور وہ عورت اندر داخل ہوئی۔ ان لوگوں کے ہاتھوں میں ریوالور اور بندوقیں تھیں۔ اس عورت کو دیکھتے ہی لڑکی دوڑ کر اس سے لپٹ گئی اور نصیر صاحب کے منہ سے نکلا۔ "تم؟" اس کے بعد ان لوگوں اور نصیر صاحب میں تکرار اور گالیوں کا تبادلہ ہوتا رہا۔ آخر ان [illegible]اروں بدمعاشوں نے مل کر نصیر صاحب کی پٹائی شروع کر دی۔ جب صاحب بے ہوش کر [illegible]ر پڑے' تب ان لوگوں نے مجھے غسل خانے میں بند کر دیا اور لڑکی کو اپنے ساتھ لے [illegible]ئے۔"

میں نے اپنے ذہن پر زور دیا لیکن کچھ یاد نہ آ سکا۔ ہسپتال میں کنول کی عیادت [illegible]رنے جو عورتیں میری موجودگی میں آئی تھیں' ان میں سے کوئی ایسی عورت میری نظروں [illegible]ے نہیں گزری جو اس قدر زوردار اور کنول کو چاہنے والی ہو۔ کنول نے بھی مجھ سے کسی [illegible]یی عورت کا تذکرہ نہیں کیا تھا اور نہ ہی اس کی ضرورت پیش آئی تھی۔ میں نے چوکیدار [illegible]ی کنپٹی پر سے پستول ہٹا لیا اور نصیر کی جانب بڑھا' وہ ابھی تک ہوش میں نہیں آیا تھا۔ [illegible]رو بھائی بھی سیدھے ہو کر کھڑے ہو گئے۔ "اس غریب کی ضرورت سے زیادہ ہی خاطر [illegible]اضع ہو گئی ہے۔ کہیں یہ مر نہ جائے۔"

"ایسے لوگ آسانی سے نہیں مرتے!" میں نے ہنس کر کہا۔

فخرو بھائی میرے ہاتھ میں پستول دیکھ کر چونکے۔ "تو کیا تم اسے اپنے ساتھ لے کر [illegible]ئے تھے؟"

"نہیں۔" میں نے کہا۔ "یہ پستول نصیر صاحب کا ہے۔ وہ اس پستول سے کنول کا دل بہلا رہے تھے۔"

"ایں؟" ان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ چونکہ وہ نصیر کو ہوش میں لانے کی جدوجہد کر رہے تھے۔ اس لئے ان کے پیچھے جو ڈرامہ ہوا' وہ اس سے تقریباً" بے خبر تھے۔ میں نے انہیں سارا قصہ سنا دیا تو وہ متفکر ہو کر بولے۔ "اب کیا کریں۔ یہ تو ہوش ہی میں نہیں آ رہا ہے۔"

"تو اس پر فاتحہ پڑھ لیتے ہیں!" میں نے شوخی سے کہا۔

"اے بھائی!" فخرو بھائی نے مجھ سے ہمدردانہ لہجے میں احتجاج کیا۔ "تم اس کی زندگی پر فاتحہ پڑھ رہے ہو؟ کمال کرتے ہو فرید بھائی!"

اسی لمحے میرے ذہن کی سطح پر ایک خیال سانپ کے پھن کی طرح لہرانے لگا تو میں ہڑبڑا سا گیا اور میری آنکھوں کے سامنے چھائی ہوئی گہری دھند چھٹنے لگی۔ اس وقت مجھے احساس ہو رہا تھا کہ میں نے نصیر کو اپنا جانی دشمن سمجھ کر سخت حماقت کی ہے۔ مجھ سے یک ایسی فاش غلطی سرزد ہو گئی تھی جس کے باعث آج مجھے دربدر کی خاک چھاننی پڑ رہی ہی اور میں قدم قدم پر رسوا ہو رہا تھا۔ میں نے اپنا ماتھا پیٹ لیا کہ مجھے اس سے پہلے ان توں کا خیال کیوں نہیں آیا' ورنہ مجھے اتنی دور جانے کی ضرورت ہی نہ پڑتی۔ فخرو بھائی کا ، اندازہ بھی غلط ثابت ہو گیا کہ نصیر نے کنول کو محض اس لئے اغوا کیا یا ورغلایا ہے کہ سے بلیک میل کیا جا سکے۔ دراصل میں اور نصیر ایک ہی کشتی کے سوار تھے۔ نصیر میری اس نانی سے چھٹکارا پانا چاہتا تھا جو کنول کی کوکھ میں پرورش پا رہی تھی۔ کنول ماں بن کر نصیر کا ستقبل تباہ کر سکتی تھی' اسی لئے نصیر کے ہاتھوں کے طوطے اڑے ہوئے تھے۔ اس نے گل پن یہ کیا کہ کنول کو اغوا کر لیا۔ ادھر میں بھی کنول سے اس لئے نجات پانا چاہتا تھا کہ ، میرے اور مہ جبیں کے درمیان ایک چٹان بن کر کھڑی ہو گئی تھی۔ اب میرے اور نصیر کے درمیان غلط فہمی کی دیوار گر چکی تھی۔ مجھے ہر قیمت پر اپنے دشمن کو دوست بنانا تھا' س لئے کہ ہم دونوں کی راہیں جدا جدا نہیں بلکہ ایک ہی تھیں' البتہ منزل الگ الگ تھی۔

بہت مشکل سے نصیر کو ہوش میں لایا جا سکا۔ ہوش میں آتے ہی اس کی نگاہ جیسے ہی

مجھ پر پڑی' وہ بھڑک اٹھا۔ اس پر غصے کی ایسی جنونی کیفیت طاری ہوئی کہ وہ ہذیان بکنے لگا اور اس کی حالت بگڑنے لگی۔ اگر فخرو بھائی ساتھ نہ ہوتے تو شاید وہ قابو میں نہ آتا۔

لیکن پھر صبح جب میں وہاں سے نکلا تو نصیر میرا دوست بن چکا تھا۔ غلط فہمی دور ہو گئی۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے سے معافیاں مانگ کر دل صاف کر لئے۔ اب کوئی عداوت نہیں رہی تھی۔ میں نے نصیر کو ٹھنڈے دل سے سمجھایا۔ "کنول کوئی بچی نہیں ہے کہ رعب اور دھمکیوں میں آ جائے۔ وہ ایک خطرناک' ہوشیار اور سنبھلی ہوئی لڑکی ہے۔ اسے اپنے دام میں لانے کے لئے نرمی اور محبت کا رویہ اختیار کرنا ہو گا۔ کسی بھی صورت میں اس کے دل میں اپنی جگہ بنا کر اسے پوری طرح اپنے اعتماد میں لینا ہو گا۔ اس طرح اس نشانی کو ضائع کرنا کچھ مشکل نہیں ہو گا۔ جب وہ اس وجود سے محروم ہو جائے گی تو اپنا غم بھلانے کے لئے اسٹیج کی دنیا کا سہارا لے گی۔ اس نشانی کو ضائع کرنے کا منصوبہ بھی جلد ہی سوچ لیں گے۔" نصیر کی سمجھ میں میری باتیں آ گئیں لیکن میں نے اس پر اپنا منصوبہ ظاہر نہیں کیا۔ ویسے بھی یہ کسی طرح مناسب نہیں تھا کیونکہ مجھے تو شکار پھانسنے کے لئے چارے کی ضرورت تھی۔ نصیر میرے لئے چارا بن گیا تھا۔ میں اس کے ہاتھوں کنول کو موت کے منہ میں پہنچا کر اپنا راستہ صاف کرنا چاہتا تھا۔ کنول کی موت سے نصیر کی گردن پھنس جاتی اور میرا بال تک بیکا نہیں ہوتا۔

اس سفاک عورت کے بارے میں پوچھنے پر نصیر نے بتایا۔ "اس عورت کا نام تبسم ہے... وہ کنول کی آنٹی کی عزیز ترین سہیلی ہے اور اسمگلروں کے بین الاقوامی گروہ سے تعلق رکھتی ہے۔ کسی وجہ سے وہ کنول کو بے حد چاہتی ہے' بالکل بہنوں کی طرح! اس کے آنٹی سے کبھی تعلقات رہے تھے اور انہوں نے محض تبسم کی خاطر ہی یہ بنگلہ خریدا ہوا تھا' یہاں چرس اور ہیروئن رکھی جاتی تھی۔ کسی مسئلے پر ان دونوں کے درمیان تلخ کلامی اور عداوت ہو گئی تو تعلقات بھی ختم ہو گئے۔ تبسم کو جانے کس طرح یہ اطلاع مل گئی کہ کنول کو اغوا کر لیا گیا ہے۔ وہ کنول کی تلاش میں نکلی تو اپنے ساتھ کچھ بدمعاشوں کو بھی لے لیا اور یہاں پہنچ گئی۔" نصیر نے کانپتے اور لرزتے ہوئے خوف زدہ لہجے میں مجھے تاکید کی۔ "تم اس عورت سے بچ کر رہنا' وہ پری زاد خانم سے کہیں زیادہ خطرناک ہے!"

تبسم کے بارے میں تفصیل سے جان کر مجھے بھی نہ جانے کیوں اس عورت سے

ایک خوف سا محسوس ہوا لیکن میں نے یہ سوچ کر اپنے دل کو ڈھارس دی کہ میں تبسم کو اپنے آپ سے الجھنے کا کوئی موقع نہیں دوں گا۔ میں تو کنول کو محبت کے جال میں پھانس کر موت کی گہری نیند سلانے والا تھا۔ تبسم کے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہوتی کہ کنول کی موت کا ذمے دار کون ہے؟

گھر جانے سے پہلے میں نے کنول کے ہاں ایک چکر لگایا تو معلوم ہوا کہ کنول گھر نہیں پہنچی ہے' البتہ بٹ نے بتایا کہ کل رات آٹھ بجے آنٹی کی سہیلی تبسم' کنول سے ملنے آئی تھیں۔ جب انہیں بتایا گیا کہ نصیر کنول کو اغوا کر کے لے گیا ہے تو وہ چراغ پا ہو کر چلی گئیں۔

میں نے فخرو بھائی کو ان کے گھر چھوڑ دیا اور سیدھا اپنے دفتر چلا گیا۔ میں اپنے گھر جانا نہیں چاہتا تھا۔ گھر جاتا تو وہ مجھے کاٹنے لگتا' رضیہ کا چہرہ دیکھتے ہی میرے دل پر چھریاں پھرنے لگتیں اور رگوں میں کھولن ہونے لگتی ہے۔ مجھے رضیہ سے شدید نفرت ہو گئی تھی۔ [illegible]ر میں ان حالات کی گردش میں جکڑا ہوا نہ ہوتا تو خدا معلوم اپنی بہن کا کیا حشر کرتا۔

[illegible]سہ پہر کے وقت فخرو بھائی کا ٹیلی فون آیا کہ میں کنول کے ہاں پہنچوں۔ کنول اپنے [illegible]ھر آگئی ہے اور مجھ سے ملنا چاہتی ہے۔ جب میں کنول کے ہاں پہنچا تو فخرو بھائی برآمدے [illegible]ں بے چینی سے میرا انتظار کر رہے تھے۔ وہ مجھے دیکھ کر بولے۔ "نصیر ابھی کچھ دیر پہلے [illegible]ہاں پہنچا ہے اور کنول کے کمرے میں موجود ہے۔"

جب ہم دونوں کنول کے کمرے کے پاس پہنچے تو ٹھٹھک کر رہ گئے۔ نصیر کی بھرائی [illegible]وئی آواز کمرے میں گونج رہی تھی۔ "کنول! تم کس قدر نیک دل اور اچھی ہو' اس بات کا [illegible]حساس آج مجھے ہو رہا ہے۔ ہمارے مدتوں سے خوشگوار تعلقات چلے آ رہے ہیں۔ میں نے [illegible]نہیں محض ایک اداکارہ نہیں بلکہ اپنی بیٹی کی طرح سمجھا ہے اور آنٹی کو اپنی سگی بہن سمجھتا رہا۔" وہ چند لمحوں کے لئے خاموش ہوا' پھر دکھ سے کہنے لگا۔ "میں ہوس میں آ کر اس [illegible]ر خود غرض اور اندھا ہو گیا تھا کہ تمہارے جذبات و احساسات کا بھی خیال نہیں کیا' [illegible]مہارے نازک سے دل کو ٹھیس پہنچائی۔ میں نے کیسے کیسے جذبوں کا خون نہیں کیا؟ میں [illegible]ت شرمندہ ہوں کنول! تم مجھے جو چاہے سزا دے لو۔ میں اف تک نہیں کروں گا۔" وہ [illegible]چوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

میں ایک ہدایت کار کی اداکاری پر اش اش کر اٹھا۔ نصیر نے اپنا پارٹ اس عمدگی سے ادا کیا تھا کہ کنول کا دل پسیجنے میں کوئی کسر نہیں رہ گئی تھی۔ فخرو بھائی اس اداکاری کو سمجھ نہیں سکے تھے۔ وہ جذباتی ہو کر آب دیدہ ہونے لگے۔ میں اس اداکاری کا ردعمل دیکھنے کے لئے اندر داخل ہوا تو کنول نے خالی خالی نظروں سے میرا استقبال کیا۔ اس کا چہرہ ہر قسم کے جذبات سے عاری اور سپاٹ دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی گمبھیر لہجے میں کہا۔ "فرید! میں تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی' تم نے اچھا کیا جو ٹھیک وقت پر پہنچ گئے۔"

جانے کیوں مجھ پر شرمندگی کا احساس ہونے لگا۔ میں نے نصیر کی جانب دیکھنا شروع کر دیا کیونکہ مجھ میں اتنی تاب نہیں رہی تھی کہ اس کی بڑی بڑی' خالی خالی اور ویران آنکھوں میں جھانک سکوں جن میں مجھے شکوے اور شکایتیں بھری ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ جب ہم دونوں کرسیوں پر براجمان ہو گئے تو اس نے بڑی اداسی سے کہا۔ "میں تمہاری زندگی بھر ممنون رہوں گی کہ کل رات تم نے اپنی جان' میری خاطر خطرے میں ڈال دی اور مجھے بچانے کو پہنچ گئے۔" میں کرسی پر کسمسایا تو وہ بولی۔ "فخرو بھائی نے مجھے کل رات کے واقعے کے بارے میں بتایا تھا۔ میں نہیں جانتی کہ تمہارا یہ احسان کب' کیسے اور کس وقت اتار سکوں۔"

کنول چپ ہوئی تو اس کے چہرے پر تھکاوٹ تھی۔ اس کی خشک آنکھوں میں وحشت نمایاں ہونے لگی۔ اس نے مجھے مخاطب کیا تو وہ اپنی آواز کا کرب نہیں چھپا سکی۔ "میں نے تمہیں اس لئے بلایا ہے کہ ایک خوش خبری سنا سکوں۔ اتفاق سے انکل بھی آ گئے۔ یہ خوش خبری جتنی اہم تمہارے لئے ہے' اتنی ہی انکل کے لئے بھی ہے۔ شاید آپ دونوں اس خوش خبری کو سن کر چین کی سانسیں لے سکیں!"

"خوش خبری!" میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ میں اس لمحے کوئی اندازہ نہ کر سکا کہ وہ کون سی ایسی خوش خبری سنانے والی ہے۔ میں نے ششدر ہو کر سوالیہ نظروں سے کنول کی جانب دیکھا اور پھر نصیر کو دیکھنے لگا جو اپنے چہرے سے رومال ہٹا کر کنول کو حیران حیران نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ کنول نے ہم دونوں پر باری باری اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی اور بھری ہوئی آواز میں کسی قدر سنجیدگی سے کہا۔ "آپ دونوں خوش ہو جائیں گے کہ...... میں کسی بچے کی ماں بننے والی نہیں ہوں۔ میں نے محض جھوٹ بولا تھا۔"

مجھے یہ تو نہیں معلوم کہ نصیر کے دل پر کیا گزری لیکن وہ اپنا رونا بھول کر مسکرا اٹھا تھا البتہ مجھے خوشی سے سکتہ سا ہو گیا۔ میرے چہرے پر خوشی پھوٹ پڑی۔ اگر نصیر اور فخرو بھائی موجود نہ ہوتے تو میں کنول کو بے اختیار اپنے بازوؤں میں بھر لیتا۔ کنول اپنے الفاظ کا رد عمل ہم دونوں کے چہروں پر پڑھ رہی تھی۔ جیسے جیسے ہمارے چہرے دمکتے جا رہے تھے' ویسے ویسے اس کا چہرہ تاریک ہوا جا رہا تھا۔ یکبارگی اس کے سراپا میں ارتعاش پیدا ہوا۔ وہ دکھ بھرے لہجے میں بولی۔ "میں نے یہ افسانہ اس لئے گھڑا تھا کہ آپ دونوں کو آزماؤں۔ آپ دونوں میری آزمائش پر پورے نہیں اتر سکے۔ یہ میری نادانی تھی کہ میں نے آپ دونوں پر اندھا بھروسہ کیا جس کی مجھے بڑی سنگین سزا ملی ہے۔" وہ پوری طرح میری جانب متوجہ ہوئی۔ "تم نے میری محبت' خلوص اور جذبے کو اس قدر ٹھیس پہنچائی ہے کہ شیشہ دل چکنا چور ہو گیا ہے۔" کنول کی سانسوں کا زیرو بم سینے میں الجھنے لگا۔ اس نے مجھے شکایتی نظروں سے دیکھا تو میں اپنی پلکیں جھپکانے لگا۔ کنول کی آنکھوں میں جیسے بادل امڈ امڈ کر جمع ہو رہے تھے۔ "تم نے مجھ سے صاف صاف یہ کیوں نہیں کہہ دیا کہ میرے دل کی گہرائیوں میں کسی اور کی تصویر......" کنول اپنا جملہ مکمل نہ کر پائی تھی کہ اس کی آواز حلق میں ڈوب گئی۔

کنول نے میرے دل کا چور پکڑ لیا تھا۔ میں سٹپٹا کر رہ گیا۔ مجھ پر ایک ایسی ندامت طاری ہوئی کہ اس نے میری زبان گنگ کر کے رکھ دی۔ میں تذبذب سے کنول کو دیکھ رہا تھا کہ نصیر بول پڑا۔ "کیا تم نے مجھے معاف نہیں کیا؟"

"میں نے آپ دونوں کو سچے دل سے معاف کر دیا ہے۔" وہ کرب ناک لہجے میں بولی۔ "اور میں اس شہر سے اور آپ لوگوں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جدا ہو رہی ہوں۔" اس کی تھرتھراتی ہوئی آواز نے میرے کانوں میں رس گھول دیا تھا لیکن نصیر پر جیسے کوئی بجلی گر پڑی ہو۔ وہ یکایک تڑپ کر اپنی جگہ سے اٹھا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو کر انگاروں کی طرح دہکنے لگیں۔ وہ اپنی پوری قوت سے چیخا۔ "کنول! تم یہاں سے نہیں جا سکتیں! میں تمہیں نہیں جانے دوں گا! آخر تم یہاں سے جانا کیوں چاہتی ہو؟"

کنول کی آنکھوں میں امڈتے ہوئے بادل' جیسے برسنے پر تلے ہوئے تھے۔ اس نے ذرا" ہی اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے نازک نازک ہونٹ آپس میں سختی سے پیوست

ہو گئے۔ اس کے بشرے پر حزن و ملال برسنے لگا۔ اس کا متغیر چہرہ بتا رہا تھا کہ کسی بھی لمحے ایک بہت بڑا طوفان آ سکتا ہے۔ آنکھوں سے پانی برسنے لگا تو وہ کبھی نہیں تھمے گا۔ وہ کئی لمحوں کے بعد رندھی ہوئی آواز میں بولی تو اس کی آواز جیسے بہت دور سے آ رہی تھی۔

"اب میں اس شہر میں رہ کر کیا کروں گی! یہاں میرا اپنا کوئی نہیں ہے' سبھی خود غرض اور بے وفا ہیں۔"

"لیکن میرا کیا ہو گا؟" نصیر نے ہذیانی انداز سے اپنے بال نوچ لئے۔

"اتنی بڑی دنیا میں حسین اور نازک اندام لڑکیوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔" اس کا لہجہ زخم خوردہ تھا۔ "آپ کو ایک نہیں' ایسی سینکڑوں کو لیں مل جائیں گی جو آپ کے صرف ایک اشارے پر ناچتی' تھرکتی ہوئی آپ کی دولت اور شہرت کی بھینٹ چڑھتی رہیں گی۔ آپ موقع شناس ہیں' دونوں ہاتھوں سے زمانے کو لوٹ لیں۔"

"میں تمہیں کسی قیمت پر یہاں سے نہیں جانے دوں گا۔" نصیر پر جیسے پاگل پن کا دورہ پڑ گیا تھا۔

"میں ابھی اور اسی وقت یہاں سے تبسم باجی کے ہاں جا رہی ہوں!" اس نے طنز میز آہستگی سے کہا۔ "شاید آپ تبسم باجی کو تو نہیں بھولے ہیں نا؟" اس نے رک کے میر کی آنکھوں میں جھانکا۔ "میں آپ کی وہ رقم ادا کر کے جا رہی ہوں جو آپ نے میری ان بچانے پر خرچ کی تھی۔ میں آپ کا کوئی احسان لینا نہیں چاہتی ہوں۔" اس نے نصیر کے قریب پہنچ کر اس کے سینے پر اپنا سر رکھ دیا۔ "انکل! اگر میں اسٹیج پر آئی بھی تو میں س اداکاری کے جوہر نہیں دکھا سکوں گی جو آپ اور تماشائی چاہتے ہیں۔ پلیز! آپ مجھے پنی ایک بیٹی کی طرح جانے کی اجازت دے دیں۔ میں آپ کو ہمیشہ یاد رکھوں گی۔"

نصیر پر خود فراموشی اور تذبذب کی کیفیت طاری تھی۔ وہ ذہنی ابتلا کا شکار ہو کر کوئی بصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔ نصیر کو ساکت دیکھ کر وہ میرے پاس چلی آئی۔ "فرید! تم مجھے بھول نہیں جاؤ گے؟" اس کی آواز میں وارفتگی تھی۔ "تم نے میرے دل پر اپنی محبت کے گہرے نقش بھی ثبت کئے ہیں اور بے وفائی کے چرکے بھی لگائے ہیں۔ میں نہیں چاہتی کہ تنا بڑا دکھ اور اذیت کس طرح سہ لوں گی؟ اس لئے....." اس کا لہجہ اس قدر شدید ہو گیا کہ وہ خود پر قابو نہ پا سکی' اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب امل پڑا تو وہ پلٹ کر

مجھے یہ تو نہیں معلوم کہ نصیر کے دل پر کیا گزری لیکن وہ اپنا رونا بھول کر مسکرا اٹھا تھا البتہ مجھے خوشی سے سکتہ سا ہو گیا۔ میرے چہرے پر خوشی پھوٹ پڑی۔ اگر نصیر اور فخرو بھائی موجود نہ ہوتے تو میں کنول کو بے اختیار اپنے بازوؤں میں بھر لیتا۔ کنول اپنے الفاظ کا رد عمل ہم دونوں کے چہروں پر پڑھ رہی تھی۔ جیسے جیسے ہمارے چہرے دمکتے جا رہے تھے' ویسے ویسے اس کا چہرہ تاریک ہوا جا رہا تھا۔ یکبارگی اس کے سراپا میں ارتعاش پیدا ہوا۔ وہ دکھ بھرے لہجے میں بولی۔ "میں نے یہ افسانہ اس لئے گھڑا تھا کہ آپ دونوں کو آزماؤں۔ آپ دونوں میری آزمائش پر پورے نہیں اتر سکے۔ یہ میری نادانی تھی کہ میں نے آپ دونوں پر اندھا بھروسہ کیا جس کی مجھے بڑی سنگین سزا ملی ہے۔" وہ پوری طرح میری جانب متوجہ ہوئی۔ "تم نے میری محبت' خلوص اور جذبے کو اس قدر ٹھیس پہنچائی ہے کہ شیشہ دل چکنا چور ہو گیا ہے۔" کنول کی سانسوں کا زیرو بم سینے میں الجھنے لگا۔ اس نے مجھے شکایتی نظروں سے دیکھا تو میں اپنی پلکیں جھپکانے لگا۔ کنول کی آنکھوں میں جیسے بادل امڈ امڈ کر جمع ہو رہے تھے۔ "تم نے مجھ سے صاف صاف یہ کیوں نہیں کہہ دیا کہ میرے دل کی گہرائیوں میں کسی اور کی تصویر......" کنول اپنا جملہ مکمل نہ کر پائی تھی کہ اس کی آواز حلق میں پھنس گئی۔

کنول نے میرے دل کا چور پکڑ لیا تھا۔ میں سٹپٹا کر رہ گیا۔ مجھ پر ایک ایسی ندامت طاری ہوئی کہ اس نے میری زبان گنگ کر کے رکھ دی۔ میں تذبذب سے کنول کو دیکھ رہا تھا کہ نصیر بول پڑا۔ "کیا تم نے مجھے معاف نہیں کیا؟"

"میں نے آپ دونوں کو سچے دل سے معاف کر دیا ہے۔" وہ کرب ناک لہجے میں بولی۔ "اور میں اس شہر سے اور آپ لوگوں سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو رہی ہوں۔" اس کی تھرتھراتی ہوئی آواز نے میرے کانوں میں رس گھول دیا تھا لیکن نصیر پر جیسے کوئی بجلی گر پڑی ہو۔ وہ یکایک تڑپ کر اپنی جگہ سے اٹھا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو کر انگاروں کی طرح دہکنے لگیں۔ وہ اپنی پوری قوت سے چیخا۔ "کنول! تم یہاں سے نہیں جا سکتیں! میں تمہیں نہیں جانے دوں گا! آخر تم یہاں سے جانا کیوں چاہتی ہو؟"

کنول کی آنکھوں میں امڈتے ہوئے بادل' جیسے برسنے پر تلے ہوئے تھے۔ اس نے ذرا" ہی اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے نازک نازک ہونٹ آپس میں سختی سے پیوست

ہو گئے۔ اس کے بشرے پر حزن و ملال برسنے لگا۔ اس کا حتمی
ایک بہت بڑا طوفان آ سکتا ہے۔ آنکھوں سے پانی برسنے لگا
لمحوں کے بعد رندھی ہوئی آواز میں بولی تو اس کی آواز جیسے
"اب میں اس شہر میں رہ کر کیا کروں گی! یہاں میرا اپنا کوئی نہیں
غرض اور بے وفا ہیں۔"

"لیکن میرا کیا ہو گا؟" نصیر نے ہذیانی انداز سے اپنے بال نوچ لئے۔

"اتنی بڑی دنیا میں حسین اور نازک اندام لڑکیوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔" اس کا لہجہ زخم خوردہ تھا۔ "آپ کو ایک نہیں' ایسی سینکڑوں کنولیں مل جائیں گی جو آپ کے صرف ایک اشارے پر ناچتی' تھرکتی ہوئی آپ کی دولت اور شہرت کی بھینٹ چڑھتی رہیں گی۔ آپ موقع شناس ہیں' دونوں ہاتھوں سے زمانے کو لوٹ لیں۔"

"میں تمہیں کسی قیمت پر یہاں سے نہیں جانے دوں گا۔" نصیر پر جیسے پاگل پن کا ... ہو گیا تھا۔

"میں ابھی اور اسی وقت یہاں سے تبسم باجی کے ہاں جا رہی ہوں!" اس نے طنز ...تلخی سے کہا۔ "شاید آپ تبسم باجی کو تو نہیں بھولے ہیں نا؟" اس نے رک کے ...آنکھوں میں جھانکا۔ "میں آپ کی وہ رقم ادا کر کے جا رہی ہوں جو آپ نے میری ...نے پر خرچ کی تھی۔ میں آپ کا کوئی احسان لینا نہیں چاہتی ہوں۔" اس نے نصیر ...ب پہنچ کر اس کے سینے پر اپنا سر رکھ دیا۔ "انکل! اگر میں اسٹیج پر آئی بھی تو میں ...کاری کے جوہر نہیں دکھا سکوں گی جو آپ اور تماشائی چاہتے ہیں۔ پلیز! آپ مجھے ... بیٹی کی طرح جانے کی اجازت دے دیں۔ میں آپ کو ہمیشہ یاد رکھوں گی۔"

نصیر پر خود فراموشی اور تذبذب کی کیفیت طاری تھی۔ وہ ذہنی ابتلا کا شکار ہو کر کوئی ...بس کر پا رہا تھا۔ نصیر کو ساکت دیکھ کر وہ میرے پاس چلی آئی۔ "فرید! تم مجھے بھول ...جاؤ گے؟" اس کی آواز میں وارفتگی تھی۔ "تم نے میرے دل پر اپنی محبت کے نقش بھی ثبت کئے ہیں اور بے وفائی کے چرکے بھی لگائے ہیں۔ میں نہیں چاہتی کہ ...دکھ اور اذیت کس طرح سہ لوں گی؟ اس لئے....." اس کا لہجہ اس قدر شدید ہو گیا ...خود پر قابو نہ پا سکی' اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب ابل پڑا تو وہ پلٹ کر

کمرے سے باہر نکل گئی۔

جب میں کنول کے گھر سے نکلا تو اپنے آپ کو کسی قدر ہلکا پھلکا اور تروتازہ محسوس کر رہا تھا' جیسے عمر قید کی سزا سے نجات ملی ہو۔ میں نے سوچا کہ میں اپنی بے پناہ خوشیوں کا جشن' آج یاسمین شہریار کے فلیٹ میں چل کر کیوں نہ مناؤں کیونکہ سانپ بھی مر گیا تھا اور لاٹھی بھی نہیں ٹوٹی تھی۔

میں اپنے گھر گیا تاکہ کپڑے تبدیل کر کے اور سج دھج کر یاسمین شہریار کے ہاں پہنچوں۔ گھر کی فضا خاصی مکدر تھی۔ رئیسہ نے مجھے بتایا کہ رضیہ صبح سے اپنے کمرے میں بند ہے۔ وہ سارا دن روتی رہی ہے' کمرے میں اس کی سسکیاں گونجتی رہی ہیں' اس نے کچھ کھایا پیا بھی نہیں ہے۔ جانے کیوں مجھے رضیہ پر ترس آگیا' شاید اس لئے کہ کنول سے نجات پانے کی خوشی میں۔ میں اس قدر سرشار ہو رہا تھا کہ میں نے رضیہ کو معاف کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اب ہو بھی کیا سکتا تھا۔ تیر تو کمان سے نکل چکا تھا۔

میں رات دس بجے پبلک ٹیلی فون آفس میں پہنچا تو اتفاق سے میرا ایک دوست ڈیوٹی پر تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر کسی کام سے باہر گیا تو میں نے یاسمین شہریار کے فلیٹ کا ٹیلی فون نمبر گھمایا۔ یاسمین شہریار نے مجھ سے کہا تھا کہ میں اس کے گھر فون ضرور کروں کیونکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ وہ کسی بڑے آپریشن کے باعث کلینک میں رک جاتی ہے۔ وہ ٹیلی فون پر مل گئی۔ "ہیلو فرید صاحب!" وہ کھنکتی ہوئی بولی۔ "اگر آپ پانچ منٹ دیر سے ٹیلی فون کرتے تو شاید میں نہ ملتی۔ میں اس وقت ایک نجی پارٹی میں جا رہی ہوں اور رات بھر وہیں رہوں گی۔" میرا دل اندر سے بجھ گیا۔ میں نے افسردگی سے پوچھا۔ "کل رات پہنچ جاؤں؟"

"کیوں نہیں!" میں نے اس کا لہجہ چبھتا ہوا محسوس کیا۔ "کل تو میں آپ کا بڑی بے تابی سے انتظار کروں گی' لیکن آپ خالی ہاتھ نہیں آئیں گے؟"

میں نے انجان بن کر پوچھا۔ "کیا مطلب ہے آپ کا؟"

وہ ہنسی تو استہزائیہ انداز صاف جھلک رہا تھا۔ "کل آپ میرے کیس کی فائل اور میرے دیئے ہوئے پچاس ہزار روپے بھی لا کر لوٹا دیں۔ ورنہ!"

اس کے آخری جملے میں ایسی دھمکی تھی کہ میری رگوں میں ایک جھنجھناہٹ سی دوڑ گئی۔ اس کا بدلا ہوا سفاک رویہ اور تیور بتا رہے تھے کہ اب اسے میری کوئی پرواہ نہیں

رہی ہے۔ اسی لئے اس کے لہجے میں کھنک تھی۔ وہ کس بات پر کھنک رہی تھی' میں سمجھ نہیں سکا تھا۔ اس کا کیس آج بھی میرے ہاتھ میں تھا۔ اس کے اندر یہ تغیر کیسا؟ یہ کیا سے کیا ہو گیا ہے؟ میں نے اپنے لہجے کو قابو میں کیا۔ "آپ کے اور میرے درمیان معاملات تو طے ہو گئے تھے۔ آپ یکایک پلٹا کیوں کھا رہی ہیں؟ آخر آپ کیا چاہتی ہیں؟"

"میں یہ چاہتی ہوں کہ تم زندگی بھر میری مٹھی میں رہو۔" اس کی ہنسی میں فاتحانہ انداز بول رہا تھا۔

"کیا آپ کو اپنے بارے میں کوئی خوش فہمی ہو گئی ہے؟"

"تم جو چاہو سمجھو؟" اس کا لہجہ یکسر بدل گیا۔ وہ سنجیدگی سے بولی۔ "تم کل فائل اور پچاس ہزار روپے لے کر میرے فلیٹ پر پہنچ رہے ہو یا نہیں؟"

"اگر میں نہیں پہنچوں تو؟" میں نے بڑی تلخی سے تکرار کی۔

"تو کل تم حوالات میں بند نظر آؤ گے؟"

میرے لبوں پر تمسخر ابھر آیا۔ "آخر آپ کو کس بات پر اتنا گھمنڈ ہے؟"

"تو کیا تم جاننا چاہتے ہو؟" اس نے جیسے اشتیاق سے پوچھا۔

"یقیناً"!" میرے لہجے میں طنز بھرا ہوا تھا۔

"ایک منٹ صبر کرو۔" میں نے ریسیور میز پر رکھ کر آواز سنی' اس کے پیروں کی یں اور کسی چیز کا شور کمرے میں سنائی دے رہا تھا۔ میں نے میز پر کسی چیز کے رکھنے کی واز بھی سنی۔ اس نے ریسیور اٹھا کر پوچھا۔

"کیا تم تیار ہو؟"

جانے کیوں میرا دل دھڑک اٹھا۔ میں نے مرتعش لہجے میں جواب دیا۔ "جی ہاں۔"

میں نے بٹن دبنے کی آواز سنی۔ میرے کانوں میں میری ہی آواز گونجنے لگی۔ "کنول ں تمہیں قتل کر دوں گا... زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" میں نشے کے لہجے میں ہذیان بک رہا ا۔ میرے ہاتھ سے ریسیور چھوٹ کر گرتے گرتے بچا۔ اس نے ٹیپ چلانا بند کر دیا۔ "یہ ابتداء تھی۔ اب درمیان سے سنو۔" اس کی آواز میرے جسم کو بے رحمی سے کاٹنے لگی' یری رگوں میں خون منجمد ہونے لگا' مجھ پر سکتہ سا ہو گیا۔ چند لمحوں کے بعد خواب گاہ کی گفتگو سنائی دے رہی تھی۔ میں نے اپنے دوست کو اندر داخل ہوتے دیکھ کر جلدی سے

ریسیور کو کریڈل پر پٹخ دیا۔ میں مفلوج سا ہو کر رہ گیا۔ میرے دوست نے میرا چہرہ دیکھا تو وہ اس طرح چونکا جیسے کسی نے ڈنگ مار دیا ہو۔ "کیا ہوا فرید؟ خیریت تو ہے؟ تمہارا چہرہ پیلا کیوں ہو رہا ہے؟"

جانے کیسے اور کیونکر میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ "میرے بچپن کے ایک دوست کا انتقال ہو گیا ہے۔"

اچانک یاسمین شہریار ہڑبڑا کر بستر سے اٹھ بیٹھی۔ اس نے میرے قریب پہنچ کر وحشت سے مجھے دیکھا اور سمٹ کر اپنی کانپتی انگلیوں سے میرے بازو کو اپنی گرفت میں لیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ اس کی انگلیاں برف کی طرح یخ ہو رہی ہیں اور برفانی لہریں میری رگوں میں سنسناتی ہوئی اترتی جا رہی ہیں۔ وہ سرک کر میرے روبرو آئی اور اپنے آپ کو میرے سینے میں اس طرح چھپانے لگی جیسے میرے وجود میں سما جانا چاہتی ہو۔ اسے اس قدر خوف زدہ دیکھ کر میں بھی سہما جا رہا تھا۔ جب میرے بازو اس کے گرد اپنا حصار قائم کرنے لگے تو ان میں ہلکا سا ارتعاش تھا۔ میں نے اس کے سفید اور پتھر چہرے کو دیکھا۔ اس کے دھڑکتے سینے میں ایک ایسا طوفان برپا تھا جس پر جلد قابو پانا اس کے بس کا نہیں رہا تھا۔ ایک ایک لمحہ صدی بن کر گزر رہا تھا۔ چند لمحوں بعد اس کے لب وا ہوئے اور وہ جھرجھراتی ہوئی آواز میں بولی۔ "فرید! تم کیا سوچنے لگے؟ میں نے تمہیں بتایا ہے نا؟ وہ کیا کہہ رہا تھا؟ اس کا لہجہ کسی بے رحم قاتل کی طرح زہریلا اور دھمکی آمیز تھا۔ اس کا ایک ایک لفظ اب بھی میرے سینے میں خنجر کی طرح اترتا جا رہا ہے۔" ...... یہ تمہاری زندگی کی آخری رات ہے جی بھر کے جشن منا لو کل صبح تم بستر پر مردہ پائی جاؤ گی۔ یہ پیغام تم اپنے آشنا کو بھی سنا دینا!" وہ بلک پڑی۔ "کیا وہ اپنی دھمکی پر عمل کر کے رہے گا؟ کیا وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا؟" اس پر ہذیانی کیفیت طاری ہونے لگی۔

"یاسمین! یاسمین!" میں نے اسے بری طرح جھنجوڑ ڈالا اور پھر سرگوشی کے انداز میں بولا۔ "تم تو بڑے مضبوط اعصاب کی عورت ہو؟ تم نے صرف ایک گیدڑ کی بھبکی پر اپنے حواس کھو دیئے؟"

شاید میری بات اس کے دل میں اتر گئی تھی۔ اس نے میرے سینے سے اپنا چہرہ ہٹا کر

میری طرف دیکھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں وحشت اور ویرانیاں چھائی ہوئی تھیں۔ وہ بدستور لرزیدہ لہجے میں بولی۔ "تم اسے دھمکی کہہ رہے ہو۔ کیا اس نے کچھ دیر پہلے مجھ پر قاتلانہ حملہ نہیں کیا تھا؟"

"تم اپنے حواس قابو میں کر کے، خوب سوچ کر بتاؤ کہ وہ آواز مرد کی تھی یا عورت کی؟"

"میں نے تمہیں بتایا نا کہ میں آواز کی تمیز نہیں کر سکی ہوں؟" اس نے مرتعش لہجے میں کہا۔ "اس نے جو الفاظ کہے اس سے بھی یہ اندازہ نہیں ہو سکا کہ آخر وہ کون ہے؟ مرد یا عورت؟"

"مرد اور عورت کے لب و لہجے اور آواز میں نمایاں فرق ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔ "اگر تم اپنے ذہن پر ذرا سا زور دو تو شاید کسی نتیجے پر پہنچ سکو۔"

"وہ جو کوئی بھی ہے میری جان کے درپے ہے۔" وہ سہم کر بولی۔

"دشمن کی شناخت ہو جائے تو دل سے خوف بڑی حد تک نکل جائے گا۔"

"کیا تمہارے خیال میں وہ تبسم ہو سکتی ہے؟" اس نے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"نہیں، تبسم نہیں ہو سکتی۔ میں نے وثوق سے کہا۔

"کیوں؟" اس کا جسم تھرا سا گیا۔ "وہ تبسم ہی ہے۔ وہ سفاک عورت ہمارے تعاقب میں یہاں تک پہنچ گئی ہے۔ اس کے کانوں میں شاید بھنک پڑ گئی ہو گی کہ ہم دونوں مل کر اس کے خلاف کوئی منصوبہ بنا رہے ہیں۔ جبھی وہ مجھے سکا سکا کر مار دینا چاہتی ہے۔" یاسمین شہریار بری طرح سہمی ہوئی تھی۔

"یہ دھمکی آمیز اور دہشت زدہ کر دینے والا ٹیلی فون تبسم کا نہیں ہو سکتا۔" میں اسے سمجھانے لگا۔ "تبسم کو ٹیلی فون پر ہمیں خوف زدہ کرنے کی ضرورت بھی کیا ہے؟ اس کی بجائے اس کے سامنے ایک سیدھا سا راستہ کھلا ہوا ہے۔ اسے میری موجودگی کی خبر ملتی تو وہ اپنے ساتھ پولیس کی بھاری جمعیت لے کر یہاں پہنچ جاتی اور میرے ساتھ ساتھ تمہیں بھی گرفتار کرا دیتی۔ اسے بالکل خبر نہیں ہے کہ ہم دونوں نے مل کر نہ صرف اس کے خلاف کوئی منصوبہ بنایا ہے بلکہ یکجان دو قالب بھی ہو گئے ہیں، اگر اسے یہ بات معلوم ہوتی تو ہم لاہور میں نہیں بلکہ اس شہر کی حوالات میں ہوتے۔"

"کیا اس وقت ہماری حالت قیدیوں سے بدتر نہیں ہے؟" اس نے وحشت سے پوچھا۔ "کیا موت ہم دونوں کے تعاقب میں نہیں ہے؟"

"تم نے الفاظ پر غور نہیں کیا کہ دھمکی صرف تمہیں دی گئی ہے۔" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "دھمکی دینے والا وہی شخص ہے جسے تم نے محبت کا فریب دے کر اپنی خلوتوں کا ساتھی بنایا تھا۔ تمہارے کلینک کا وارڈ بوائے جس نے چلتی ٹرین میں تمہارا گلا گھونٹنے کی کوشش کی تھی۔ وہ محبت میں ناکام ہونے کے بعد تمہیں ایک دوسرے مرد کے ساتھ دیکھ کر دل شکستہ ہو گیا ہے اور تم سے تمہاری زندگی چھین لینا چاہتا ہے۔ آج بھی غالباً" اسی نے تم پر قاتلانہ حملہ کیا تھا۔"

میں نے اپنی بات ختم کی تو اس کے چہرے پر اذیت کی لہر اٹھی۔ وہ میرے بازوؤں سے نکل آئی۔ "میں ابھی اور اسی وقت پولیس کو ٹیلی فون کرتی ہوں۔" اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

"میں سب سے پہلے قاتلانہ حملے کی رپورٹ درج کراؤں گی۔ پولیس کو یہ بھی بتاؤں گی کہ وہ دوبارہ مجھ پر قاتلانہ حملہ کرنے والا ہے۔ لہٰذا میری حفاظت کی جائے اور اسے ہر قیمت پر گرفتار کر لیا جائے۔ پولیس یقیناً اسے گرفتار کر لے گی۔"

جونہی وہ ٹیلی فون کرنے کی نیت سے پلنگ سے نیچے اتری' میں نے جھپٹ کر اس کا ہاتھ تھام لیا اور بولا۔ "اس سے کیا ہو گا؟

اس نے مجھے بے معنی نظروں سے دیکھا۔ "ہمیں سکون نصیب ہو جائے گا۔"

"تم پاگل ہو گئی ہو۔" میں جھنجلا کر بولا۔ "اگر تمہارا سرپھرا عاشق گرفتار ہو گیا تو وہ ہم دونوں کی عزت اور تمہاری شہرت تباہ کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھے گا۔ وہ تمہاری سیاہ کاریوں کی داستان عام کرا دے گا۔"میں نے توقف کر کے اس کی پتھرائی ہوئی آنکھوں کو دیکھا تو میرے جسم میں جھرجھری دوڑ گئی۔ میں چند لمحے بعد بولا۔ "وہ کراچی سے تمہارے تعاقب میں لگا ہوا ہے۔ اس بات کا قوی امکان ہے کہ اس نے لاہور میں ہم دونوں کی سرگرمیوں پر کڑی نظر رکھی ہو۔ اگر اس نے پولیس کو بتا دیا کہ ہم دونوں رات کے وقت تبسم کے بنگلے میں داخل ہوئے تھے تو اس صورت میں تم بھی قتل کی اس سنگین واردات کی مجرم ٹھہرائی جاؤ گی۔"

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور تھکی تھکی سی آواز میں بولی۔ "تم ٹھیک کہتے ہو۔ میں نے اس پہلو پر تو سوچا ہی نہیں تھا۔"

"سوچا نہیں تو اب سوچو؟" میری آواز بھی مرتعش ہو رہی تھی۔ "اب ہمارا کام سوچنا ہی رہ گیا ہے۔"

یاسمین شہریار نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے کھڑکیوں اور دروازے کی طرف دیکھا۔ "مگر وہ آج رات مجھے قتل کر دینا چاہتا ہے۔"

"تم اس کی دھمکی کی فکر نہ کرو۔" میں نے اسے تسلی دی۔ "نفرت اور غصے کے عالم میں کہہ دینا آسان ہے لیکن اس پر عمل کرنا بہت مشکل ہے .... تم ایسا کرو کہ اپنا پستول مجھے دے دو۔"

"پستول!" اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ "تو کیا تم اسے قتل کر دو گے؟"

"نہیں۔" میں نے آہستہ سے اس کے کان میں کہا۔ "لیکن اس نے ہماری جان لینے کی کوشش کی تو کیا ہم چپ چاپ اپنی موت کا تماشہ دیکھیں گے؟ اس پستول سے ہم اپنی حفاظت اور مزاحمت تو کر سکتے ہیں۔ اسے خوف زدہ کر کے بھگا تو سکتے ہیں۔"

"لیکن تم اسے قتل مت کرنا۔" اس نے التجا آمیز انداز میں کہا۔ "میں اسے زندہ دیکھنا چاہتی ہوں۔"

"کیوں؟" میں حیرت سے یاسمین شہریار کو دیکھنے لگا جس کی آنکھوں میں اپنے قاتل کے لئے رحم کی التجا تھی' جس کے رخساروں پر موت کے سائے کے ساتھ ساتھ محبت کی سرخی بھی دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے اپنی زندگی میں عورت کا یہ روپ آج تک نہیں دیکھا تھا۔

میری بات کے جواب میں اس کے لبوں پر ایک غم ناک اور تاسف انگیز مسکراہٹ بکھر گئی۔ "فرید!" وہ آہستہ سے بولی۔ "میں نے جمیل سے واقعی محبت کی تھی۔ شاید اسی لئے کہ وہ ان نوجوانوں اور مردوں سے یکسر مختلف تھا' جو میرے جسم اور دولت کے بھوکے تھے' جو مجھے خوش کر کے مجھ سے روپے وصول کرتے تھے' لیکن اس نے خلوت میں ہمیشہ مجھ سے محبت بھری باتیں کی تھیں۔ وہ مجھ سے کہتا تھا' جب تم ایک عورت ہو تو ایک مرد کو ہمیشہ کے لئے اپنا کیوں نہیں بنا لیتیں؟ تم مجھ سے شادی کر لو۔ میں تمہاری کمائی پر نہیں

اپنی کمائی پر زندہ رہوں گا' مگر مجھے اپنی بدنامی کا خوف تھا۔ ایک نامور لیڈی ڈاکٹر جس کے پاس عزت' شہرت اور دولت ہوں وہ کس طرح اپنے کلینک کے وارڈ بوائے سے شادی کر سکتی ہے! میں نے ہمیشہ شادی سے انکار کر دیا۔ اس نے مجھے دھمکیاں دینا شروع کر دیں کہ میں برائی کا راستہ ترک کر دوں لیکن میں ایسا نہیں کر سکی اور وہ میرا دشمن بن گیا۔" وہ لمحے بھر کو خاموش ہوئی اور ایک گہری سانس لے کر بولی۔ "مگر اب میرے اندر کی عورت جاگ اٹھی۔ میں نہیں چاہتی کہ جمیل کو کچھ ہو جائے۔ خدا کے لئے تم اسے قتل نہ کرنا! محض ڈرا دھمکا کر بھگا دینا۔" وہ اپنا لباس سنبھالتی ہوئی الماری کی طرف بڑھی تو اس کی چال میں شرابیوں کی سی لڑکھڑاہٹ تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے خوف و ہراس نے اس کے جسم کا سارا خون نچوڑ لیا ہو۔ یہ وہ عورت تھی۔ جو مریضوں کو موت کے منہ سے نکالتی تھی لیکن آج جب اس نے اپنے آپ کو موت کے دہانے پر پایا تو اس کے ہاتھ پیر پھول رہے تھے۔

میں نے کمرے کی ساری بتیاں گل کر دیں۔ پھر ہم دونوں فرش پر چادر بچھا کر لیٹ گئے۔ پستول میرے دائیں ہاتھ کی مضبوط گرفت میں تھا۔ یاسمین شہریار میرے بائیں ہاتھ کے حصار میں سکڑی' سمٹی اور سہمی ہوئی پڑی تھی۔ شاید وہ اپنی محبت کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ تاریکی کے باعث مجھے اس کے چہرے کے تاثرات کا کوئی اندازہ نہیں ہو سکا۔

یہ میری زندگی کی عجیب و غریب بھیانک اور سوگوار رات تھی۔ اس کے باوجود میں اپنے ماضی میں کھو گیا۔ کنول نے میری زندگی کی دہلیز پر قدم رکھا ہی تھا کہ مہ جبیں نے میرے دل کے دروازے پر دستک دے دی۔

میں کنول کے حسن کا پجاری تھا لیکن پھر مہ جبیں کے حسن نے کنول کو ماند کر کے رکھ دیا۔ کنول میری پجارن بن گئی تھی اور میں مہ جبیں کا دیوانہ ہو گیا۔ پھر حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ میں ایک قاتل بن گیا۔ میں یہ جانتے ہوئے بھی کہ اب قانون کے ہاتھوں سے بچنا مشکل ہے' اپنے آپ کو دھوکا دے رہا تھا۔ قانون کا آہنی پنجہ کسی بھی لمحے میری گردن دبوچ سکتا تھا۔ مجھے احساس تھا کہ میرے گھر والوں کو جب میرے قاتل ہونے کی اطلاع ملی ہو گی تو کیا کہرام مچا ہو گا۔ وہ لوگ نہ جانے کس قیامت کا سامنا کر رہے ہوں گے؟ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ گھر والوں کو کس طرح سارے حالات سے آگاہ کروں۔

یہی کچھ سوچتے سوچتے میری آنکھ لگ گئی۔ صبح جب میں جاگا تو کمرے میں ہر طرف

دھوپ کی ٹھنڈی کرنیں پھیلی ہوئی تھیں۔ سامنے والی کھڑکی کا سمٹا ہوا پردہ دیکھ کر میں یک لخت چونک اٹھا اور سراسیمگی سے یاسمین شہریار کی جانب دیکھا۔ وہ میرے شانے پر اپنا سر رکھے میٹھی نیند سو رہی تھی۔ اس کا ایک بازو میرے سینے سے لپٹا ہوا تھا۔ معاً" مجھے خیال آیا کہ شاید اسی نے کھڑکی پر سے پردہ ہٹایا ہو گا۔ میں نے آہستگی سے اسے جھنجھوڑا تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی اور مجھے متوحش نظروں سے دیکھنے لگی۔ جب میں نے اس کی توجہ کھڑکی کے پردے کی جانب مبذول کرائی تو وہ سن ہو کر رہ گئی۔ "مم.... میں نے تو پردہ نہیں ہٹایا۔" اس نے شدید حیرانی سے کہا۔ "میں تمہیں سوتا پا کر ساری رات جاگتی رہی تھی۔ پھر جانے کس وقت میری بھی آنکھ لگ گئی۔"

میرے جسم میں خوف کی سرد لہر دوڑ گئی۔ دشمن ہماری نیند اور غفلت سے فائدہ اٹھا کر اندر چلا آیا تھا لیکن نہ معلوم کیوں اس نے اپنی دھمکی کو عملی جامہ نہیں پہنایا تھا۔ وہ چاہتا تو نہ صرف یاسمین شہریار کو بلکہ مجھے بھی قتل کر سکتا تھا۔ ہم دونوں پوری طرح اس کی دسترس اور رحم و کرم پر تھے۔ دوسری جانب یاسمین شہریار کا چہرہ بھی سفید پڑ گیا تھا۔

جلد ہی مجھے اس راستے کا سراغ مل گیا جہاں سے وہ اندر آیا تھا۔ ملحق غسل خانے کا عقبی دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے اپنے حواس پر قابو پایا اور پھر یاسمین شہریار کو بھی تسلی دی کہ اب خطرہ ٹل گیا ہے۔ دشمن کسی وجہ سے اپنا ارادہ ترک کر کے واپس چلا گیا ہے اور شاید اب نہ آئے۔

سہ پہر تک یاسمین شہریار کسی قدر نارمل اور پرسکون ہو گئی۔ شام کو دونوں ملازمین دو دن کی چھٹی لے کر نتھیا گلی چلے گئے۔ وہ اپنی بیمار بیٹی کی عیادت کے لئے گئے تھے۔ اس وقت تک ہم دونوں کے دلوں سے ڈر اور خوف نکل چکا تھا۔ رات آئی تو یاسمین شہریار کے مہکتے بدن کی حشر سامانیوں نے میرا دل بہلایا۔ ہم دونوں رات کے آخری پہر تک جشن مناتے رہے۔

دوسرے روز میری آنکھ کھلی تو اطلاعی گھنٹی مسلسل بج رہی تھی۔ میں فوراً" بستر سے اٹھا۔ دیوار گیر گھڑی میں وقت دیکھا تو دن کے دو بج رہے تھے۔ اسی وقت یاسمین شہریار سراسیمگی کے عالم میں دوڑتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ غالباً" وہ مجھ سے پہلے اٹھ کر دروازہ کھولنے چلی گئی تھی۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور آنکھیں خوف سے پھٹی جا

رہی تھیں۔ وہ گرتی پڑتی میرے قریب پہنچی اور مجھ سے لپٹ گئی۔ میرے ذہن میں فوری طور پر جو خیال آیا وہ یہ تھا کہ اس کا سر پھرا عاشق پھر آن دھمکا ہے اور اس بار یقیناً اسے قتل کر دینے کے ارادے سے آیا ہے۔

یاسمین شہریار نے کچھ کہنا چاہا مگر اس کی زبان ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ بہ مشکل تمام وہ اٹک اٹک کر بولی۔ "فرید..... فرید ...وہ .... تبسم۔"

"تبسم....." میرے سینے میں جیسے کوئی تیز نوکیلا خنجر اترتا چلا گیا۔ میرا جسم اور زبان جیسے مفلوج ہو گئی۔ پہلے تو مجھے اس کی بات پر یقین نہ آیا۔ میں نے وحشت زدہ ہو کر پوچھا۔ "کیا وہ اپنے ساتھ پولیس لے کر آئی ہے؟"

"نہیں۔" یاسمین شہریار کی آواز اس کے حلق میں پھنس رہی تھی۔ "وہ تنہا آئی ہے۔ اس کی کار احاطے میں کھڑی ہے۔"

"تو وہ کہاں ہے؟" میں نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے پوچھا۔

"ملاقاتی کمرے میں بیٹھی ہے اور تمہیں بلا رہی ہے۔"

یاسمین شہریار پر غشی کی سی کیفیت طاری تھی۔ "وہ شاید سودے بازی کرنے آئی ہے۔ اگر اس کا ارادہ سودے بازی کا نہ ہوتا تو وہ یہاں تنہا نہ آتی بلکہ اپنے ساتھ پولیس کو لے آتی۔ وہ اس وقت غصے میں بھری ہوئی ہے۔"

میں پستول جیب میں رکھتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھا تو یاسمین شہریار نے آہستگی سے کہا۔ "فرید! ہوش اور عقل مندی سے کام لینا' یہ سوچ کر کہ ہم دونوں اس کی مٹھی میں ہیں۔ اسے قتل کرنا بے سود ہو گا۔ بہتر یہ ہے کہ تم اسے فریب دے کر اپنا کام نکال لو۔"

"میں اس اذیت سے تنگ آگیا ہوں۔" میرا لہجہ تلخ ہو گیا۔ "میں آج اس ناگن کا سر کچل کر رکھ دوں گا۔ روز روز کی اذیت سے ایک دن کی اذیت اچھی ہے۔"

"پلیز فرید!" اس نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔ "اپنے آپ پر قابو رکھنا۔ اگر تم نے اسے قتل کر دیا تو ایک نئی مصیبت کھڑی ہو جائے گی۔"

"یہاں اس کی لاش آسانی سے ٹھکانے لگ سکتی ہے۔" میں نے سرگوشی کی۔ "کیسا اچھا اتفاق ہے کہ آج تمہارے ملازم بھی یہاں موجود نہیں ہیں۔ اس قتل کا کوئی عینی گواہ

اور شہادت بھی نہیں ملے گی۔ شاید اس نے پولیس کو مری میں میری موجودگی کی اطلاع بھی نہیں دی ہے ورنہ اس سے پہلے پولیس یہاں پہنچ جاتی۔"

یاسمین شہریار کی آنکھوں میں ایک وحشیانہ چمک ابھر آئی۔ اس کا چہرہ نہ جانے کس خیال سے یکبارگی دمک اٹھا تھا۔ وہ اپنے اندرونی جوش کو دباتے ہوئے بولی۔ "ہاں ہاں! تم اسے قتل کر دو، وہ ایک زہریلی ناگن ہے۔ ہم اس کی لاش کار میں رکھ کر کسی گہرے کھڈ میں گرا دیں گے۔ پولیس کو اس قتل کا کوئی سراغ نہیں ملے گا۔ کسی کو معلوم نہ ہو سکے گا کہ اس کا کیا حشر ہوا۔" اس نے نفرت اور غصے سے اپنی دونوں مٹھیاں بھینچ لیں۔

میرے وجود میں ایک دھماکہ سا ہوا۔ یاسمین شہریار میرے جذبات کو ہوا دے کر تبسم کو قتل کرنا چاہتی تھی۔ تبسم نے بھی اسی طرح میرے ہاتھوں ایک شخص کو موت کے گھاٹ اتروایا تھا۔ میں نے ایک لمحے کو کچھ سوچا اور پھر ملاقاتی کمرے کی طرف بڑھنے لگا۔ اسے قتل کر دینے کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں رہا تھا۔

یاسمین شہریار بھی میرے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ میں ملاقاتی کمرے کی دہلیز پر پہنچ کر رک گیا۔ تبسم صوفے پر بڑی تمکنت سے بیٹھی ہوئی ایک انگریزی رسالے کی ورق گردانی کر رہی تھی۔ اس کا چہرہ سپاٹ نظر آ رہا تھا۔ اس نے ہماری آہٹ سن کر اپنا سر اوپر اٹھایا اور اس کے لبوں پر ایک استہزائیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ "بہت خوب میرے سرتاج! ایک شریف عورت کے شوہر ہوتے ہوئے بھی ایک بدکار عورت کے ساتھ عیش کر رہے ہو؟ جانتے ہو اس بدکاری کی کیا سزا ہے؟ تم دونوں کو سنگسار کیا جا سکتا ہے۔"

"تم اور شریف؟" میں نے بھنا کر جواب دیا۔ "تو اس شریف عورت کے لئے کیا سزا ہے جو نہ صرف تین چار شوہروں کی بیوی ہے بلکہ نوجوانوں کو پھانس کر اپنی خواہشات کی تسکین کرتی ہے۔ جو ایک طوائف سے کہیں زیادہ بدتر اور کہیں زیادہ ذلیل ہے؟"

"بکواس بند کرو!" وہ رسالہ میز پر پٹخ کر چیخی۔ "تم نہ صرف بدکار ہو بلکہ ایک قاتل بھی ہو۔ میں جب چاہوں تمہیں پھانسی کے پھندے تک پہنچا سکتی ہوں۔"

"تمہارے پاس کوئی ثبوت ہے؟" میں نے تمسخر سے کہا۔

"میرے پاس ایسا ثبوت موجود ہے کہ تمہارے فرشتوں کو بھی اس کی خبر نہیں ہو گی۔"

"کیا تم محض زبانی جمع خرچ سے عدالت کو ورغلانا چاہتی ہو۔ قانون ٹھوس ثبوت مانگتا ہے۔"

"میرے پاس ٹھوس ثبوت موجود ہے۔" اس نے صوفے پر اپنے قریب رکھا ہوا پرس اٹھا کر کھولا اور اس میں سے ایک رول کی ہوئی فلم نکال کر میری جانب اچھال دی۔ "کیا یہ ٹھوس ثبوت کافی نہیں ہے؟"

میں نے اس فلم کے پرنٹ دیکھے تو میرے ہاتھوں میں رعشہ آ گیا۔ کسی نے بڑی مہارت سے اس رات کے قتل کی واردات کو فلم میں بند کر لیا تھا۔ میرے ہاتھوں سے رول چھوٹ کر فرش پر گر پڑا اور میں اپنی جگہ ساکت و جامد کھڑا رہ گیا۔

یاسمین شہریار نے جھک کر رول اٹھایا اور پرنٹ دیکھنے لگی۔

تبسم فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف دیکھ رہی تھی۔ یک لخت وہ یاسمین شہریار کی طرف متوجہ ہوئی۔ "تم بھی بڑی ذلیل نکلیں۔ آخر میرے شوہر کو ورغلا دیا نا! تم اسے اپنے ساتھ لاہور لے آئیں اور اسی رات میرے گھر پر ہلا بول دیا۔ تمہارا خیال تھا کہ تم مجھے اور میرے ساتھی کو بے ہوش کر دینے کے بعد اپنی تصویریں اور کاغذات حاصل کر لو گی؟... کیوں؟"

"یہ جھوٹ ہے!" یاسمین شہریار کی آواز کھوکھلی سی تھی۔ "تم مجھ پر اتنا بڑا الزام نہ لگاؤ۔"

"تم جلدی میں سرنج اور کلوروفام کا رومال بھول گئی تھیں۔" تبسم طنزیہ انداز سے مسکرائی۔ "ان رومالوں پر تمہارے کلینک کے نام کڑھے ہوئے تھے۔ اگر یہ رومال نہیں ملتے تو میں سمجھتی کہ شاید کسی چور نے میرے گھر میں گھس کر ہنگامہ کیا ہے؟ جب میں نے کراچی ٹیلی فون کیا تو معلوم ہوا کہ تم مری گئی ہو۔ میں نے مری فون کیا تو تمہارے ملازم نے بتایا کہ تم آج کسی وقت مری پہنچنے والی ہو۔ میں سمجھ گئی کہ تم نے میرے شوہر کو بھکا کر اپنے ساتھ ملا لیا ہے اور اب اسے مری لے جا کر میرے خلاف سازشیں کرتی رہو گی۔" یاسمین شہریار لاجواب ہو کر بغلیں جھانکنے لگی۔ اس کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ یک لخت تبسم میری جانب متوجہ ہوئی۔ "تم نے کیا فیصلہ کیا؟"

"کیسا فیصلہ؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"میرے ساتھ نہیں چلو گے؟" اس نے مجھے ترچھی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم میرے ساتھ چلو گے تو قتل بھی چھپ جائے گا۔ میں نے یہ الزام ایک نامعلوم چور کے سر تھوپ دیا ہے۔ تمہاری زندگی اب میرے ہاتھ میں ہے۔"

"اگر میں تمہارے ساتھ نہ چلوں تو؟"

"تو پھر کل تم پولیس کی قید میں ہو گے۔" اس نے جواب دیا۔ "میں اس وقت یہاں سے اسلام آباد جا رہی ہوں۔ اسلام آباد سے کراچی چلی جاؤں گی۔ میں تمہیں یہ بھی بتا دینا چاہتی ہوں کہ تم دونوں اپنی اپنی چیزوں کے حصول کے لئے جو کوشش کر رہے ہو اس کا خیال ترک کر دو کیونکہ میں اپنی جان سے بھی زیادہ ان کی حفاظت کرتی ہوں۔"

"مجھے تمہاری دھمکیوں کی بالکل پرواہ نہیں ہے۔" میں نے پرسکون لہجے میں کہا۔ "میں نے ابھی اور اسی وقت فیصلہ کر لیا ہے کہ اپنے آپ کو قانون کے حوالے کر دوں۔ اگر مجھے سزا ملی تو تمہاری توقع سے بہت کم ملے گی اور میں تم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نجات پا لوں گا۔ میں عدالت کو بتا دوں گا کہ میری بیوی درحقیقت ایک طوائف ہے۔ اسے اپنے آشنا کے ساتھ رنگ رلیاں مناتے دیکھ کر میں مشتعل ہو گیا اور اس شخص کو قتل کر بیٹھا مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ قتل ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کرایا گیا ہے۔ میں بطور ثبوت یہ فلم پیش کروں گا۔ ظاہر ہے کہ اس شخص کو قتل کرانا مقصود تھا' جبھی تو اس قتل کی فلم بھی بنائی گئی ہے۔" میں نے بڑھ کر یاسمین شہریار کے ہاتھ سے فلم رول لے لیا۔

تبسم کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ وہ فوراً" صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئی اور سخت لہجے میں بولی۔ "یہ رول مجھے واپس کر دو۔"

"میں تمہیں یہ رول تو نہیں البتہ طلاق دے سکتا ہوں۔" میں نے فلم رول اپنی جیب میں ٹھونستے ہوئے کہا۔ "طلاق! طلاق! طلاق!"

"یہ طلاق نہیں ہو سکتی۔" تبسم ہزیانی انداز سے چیخی۔ "کیا تم نے طلاق کو گڈے گڑیا کا کھیل سمجھ رکھا ہے کہ جب دل چاہے بیوی کو طلاق دے دو' اس کی زندگی تباہ کر دو۔"

"میں نے نہیں بلکہ تم نے ہر شریف شخص کی عزت کو ایک مذاق اور کھیل سمجھ رکھا ہے۔" میں نے نشتر زنی کرتے ہوئے کہا۔ "یہ طلاق کیوں نہیں ہو سکتی! یہ طلاق بھی

اسی طرح دی جا رہی ہے جس طرح تم نے مجھ سے شادی کی ہے۔ کیا اس طرح شادیاں ہوتی ہیں؟ تم جیسی ذلیل اور کمینی عورت اسی سلوک کی مستحق تھی۔ چلو' دفع ہو جاؤ میری نظروں سے!" مجھے خود پر جیسے اختیار نہیں رہا تھا۔

تبسم لمحہ بھر کے لئے سناٹے میں آ گئی۔ وہ شاید سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ میں اس کے ساتھ اس قدر اہانت آمیز سلوک بھی کر سکتا ہوں۔ اس نے شاید یہ باور کر لیا تھا کہ میں ایک بے جان کٹھ پتلی کی طرح اس کے اشاروں پر ناچتا رہوں گا لیکن آج میں نے اس کے طلسم کو پاش پاش کر دیا تھا۔ مجھے اب اس بات کا کوئی خوف نہیں تھا کہ وہ یہاں سے نکل کر سیدھی پولیس اسٹیشن جا کر میرے خلاف قتل کی رپورٹ درج کرا دے۔ میں نے خود کو قانون کے حوالے کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ میری اس سرکشی اور بغاوت کو دیکھ کر وہ چراغ پا ہو گئی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں نفرت کی چنگاریاں بھڑکنے لگیں اور چہرے پر جسم کا سارا خون سمٹ آیا۔ وہ غصے سے کانپنے لگی۔ "فرید! آج تم نے مجھے اس قدر ذلیل اور بے عزت کیا ہے کہ میں تمہیں معاف نہیں کروں گی۔ تمہیں قدم قدم پر ذلیل کروں گی۔ تم دیکھ لینا' میں تمہیں کس طرح پھانسی کے پھندے پر لٹکاتی ہوں! تم نہیں جانتے' میں تبسم ہوں۔"

تبسم نے یک لخت رک کر غضبناک نظروں سے یاسمین شہریار کو دیکھا۔ "تم کیا چاہتی ہو؟ کیا کوئی حسرت تمہارے دل میں رہ گئی ہے؟"

یاسمین شہریار میں جواب دینے کی جرات نہ تھی۔ اس نے میری آنکھوں میں جھانکا۔ "فرید! تم اسے گولی مار دو۔ یہ زہریلی ناگن بھاگی جا رہی ہے۔ تم کیا سوچ رہے ہو؟"

تبسم پلٹی اور تن کر کھڑی ہو گئی۔ "تو تمہارے یہ ارادے ہیں! لیکن سوچ لو جان من تمہارا حشر جو ہو گا تم اس کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتیں! اگر مجھے کچھ ہو گیا تو قیامت آ جائے گی۔ تمہیں کہیں پناہ نہیں ملے گی۔"

"فرید!" یاسمین شہریار نے مجھے پھر جھنجھوڑا۔ "یہ ڈرا دھمکا رہی ہے۔ تم اس کی باتوں میں نہ آؤ۔"

میں نے اپنی جیب سے پستول نکالا تو یاسمین شہریار کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ وہ میرے سامنے سے ہٹ گئی تاکہ میں تبسم کا نشانہ لے سکوں۔ تبسم نے میرے ہاتھ میں

پستول دیکھا تو اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ وہ خوف زدہ ہو کر ایک قدم پیچھے ہٹی' لیکن اس نے جلدی ہی اپنے حواس پر قابو پا لیا۔ اس کی تھرتھرائی مگر گرج اور آواز کمرے میں گونجی۔ "میں بزدل نہیں ہوں۔ میں موت سے نہیں ڈرتی! لیکن کیا یہ مردانگی ہے کہ تم ایک نہتی عورت کو اپنا نشانہ بنا رہے ہو؟"

"یہ تمہیں طعنہ دے کر اپنی جان بچانا چاہتی ہے۔" یاسمین شہریار چیخ کر بولی۔ "تم اس کی باتوں میں نہ آؤ۔"

"تم میری نہیں اس چڑیل کی باتوں میں آ جاؤ۔" تبسم نے تضحیک سے کہا۔ "یہ وہ عورت ہے جس میں انسانیت بالکل نہیں ہے۔"

"تم اپنی زبان بند رکھو۔" یاسمین شہریار پلٹ کر اس پر برس پڑی۔ "تم اپنے دن بھول گئیں! تم جیسی کمینی عورت کون ہو سکتی ہے! میں نے تمہیں سہارا دیا۔ مگر تم احسان فراموش نکلیں' تم نے میری کمزوریوں سے فائدہ اٹھایا۔ مجھے غلط راہ پر ڈال دیا۔ تم مجھے بلیک میل کر کے میری زندگی اجیرن بناتی رہی ہو۔ تم نے میری ساری دولت ہڑپ کر لی۔" یہ کہہ کر وہ میری جانب پلٹی تو اس کا سینہ زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ "فرید! اسے گولی مار دو۔"

"نہیں مس یاسمین شہریار!" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا اور اپنا سر انکار میں ہلایا۔ "میں تبسم کو قتل نہیں کروں گا۔"

"کیوں؟" اس کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ وہ مجھے پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

"تو کیا تم چاہتی ہو کہ میں دوسری حماقت کروں؟" میں نے کہا۔ "ایک شدید غلطی کرنے کے بعد اسے پھر دہراؤں۔"

"اس میں حماقت کی کیا بات ہے؟" وہ حیرانی سے بولی۔ "ہم اپنے راستے کا کانٹا ہٹا رہے ہیں۔ جس نے ہماری زندگی عذاب کر دی ہے۔ یہ ایک بلا ہے' ڈائن ہے!"

"تمہاری زبان سے یہ الفاظ اچھے نہیں لگتے۔" تبسم نے پھنکار کر کہا۔ "تم خود کیا ہو؟ تم نے کبھی آئینہ دیکھا ہے!"

"تم دونوں انتہائی خود غرض' مکار اور کمینی عورتیں ہو۔" میں نے نفرت سے کہا۔ "اس رات میں چاہتا تو اس شخص سے جو اس حرافہ کا پہلا شوہر تھا اپنی جان بچا سکتا تھا یا

اسے زخمی کر کے فرار ہو سکتا تھا لیکن میں ایسا نہیں کر سکا' اس لئے کہ اس ڈائن نے مجھے اشتعال دلایا' مجھے بھڑکا کر اس بات پر آمادہ کیا کہ میں میز پر سے خنجر اٹھا کر اس کے پیٹ میں جھونک دوں۔ میں اس وقت اس قدر حواس باختہ ہو گیا تھا کہ میں نے اس کے ایک ایک لفظ پر اس طرح عمل کیا کہ جس طرح یہ چاہتی تھی۔ آخر ایک ناکردہ گناہ کی سزا اس شخص کو مل گئی اور میں قاتل بن گیا۔ اس طرح اس عورت کا دامن صاف رہا۔ میرے ہاتھوں اس نے اپنے دشمن کا صفایا کروا دیا۔ آج تم بھی اسی طرح میرے ہاتھوں اسے قتل کروا کر اپنا دامن صاف رکھنا چاہتی ہو؟ تم کیوں اسے قتل نہیں کر دیتیں!" میں نے اس کے ہاتھ میں پستول تھما دیا۔ "میں آج حواس میں ہوں۔ میں دوبارہ اپنے ہاتھ خون میں رنگنا نہیں چاہتا۔"

یاسمین شہریار کے ہاتھ سے پستول چھوٹ کر فرش پر گر گیا۔ جیسے میں نے اس کے ہاتھ پر دہکتا ہوا انگارا رکھ دیا ہو۔ اس کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ وہ خوف زدہ ہو کر ایک قدم پیچھے ہٹی تو دیوار سے جا لگی۔ اس کے چہرے سے پسینہ چھوٹ پڑا۔ تبسم نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا' وہ تیر کی طرح باہر نکل گئی۔ وہ تبسم کو بے بسی سے جاتے دیکھتی رہی۔ جیسے ہی تبسم نظروں سے اوجھل ہوئی۔ وہ صوفہ پر بے جان سی ہو کر گر پڑی۔ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تو مجھے اس پر ترس آ گیا۔ میں اس کے پاس جا بیٹھا۔ وہ روتے روتے میرے سینے پر ٹک گئی۔ اس نے سسکیوں کے درمیان کہا۔ "میں بہت بزدل ہوں فرید! ورنہ اس عورت کو ضرور قتل کر دیتی۔"

"میں تم سے کہیں زیادہ بزدل ہو گیا ہوں یاسمین!" میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور آہستہ آہستہ اس کا سر سہلانے لگا۔ تبسم کی کار اسٹارٹ ہونے کی آواز احاطے میں گونجنے لگی' پھر دور ہونے لگی اور معدوم ہو گئی۔ ہر طرف ایک آسیب زدہ سناٹا چھا گیا۔ میں آنکھیں بند کئے ایک وحشت انگیز خواب دیکھ رہا تھا۔ آج کسی بھی وقت پولیس مجھے گرفتار کرنے کے لئے پہنچ سکتی تھی۔ میری پوری زندگی تباہ و برباد ہونے والی تھی۔ میں نے جو کچھ پایا تھا وہ سب کچھ کھو دیا تھا۔ میرے پاس کچھ نہیں رہا تھا۔ میرے مقدر نے مجھے ذلت و رسوائی کے سوا کچھ نہیں دیا تھا۔ مجھے یک لخت محسوس ہوا کہ کوئی چپکے سے دبے پاؤں چلتا ہوا اس کمرے میں داخل ہوا ہے اور خاموشی سے سامنے والے صوفہ پر بیٹھ گیا

ہے۔ اس کی نگاہیں ہم دونوں پر جمی ہوئی ہیں۔ میرے کان اس کی سانسوں کی آواز صاف طور سے محسوس کر رہے تھے۔ میں جیسے مفلوج ہو گیا۔ یہ کون ہو سکتا ہے؟ یاسمین شہریار کا عاشق جمیل؟ وہ جو رات کو آیا تھا۔ اس نے نہ جانے کیوں ہمیں بخش دیا تھا۔ وہ اس وقت پھر کس لئے آیا ہے؟

میں نے آہستہ سے اپنی آنکھیں کھول دیں اور اپنی جگہ سے اچھل پڑا۔ یہ کوئی خواب نہیں حقیقت تھی۔ صوفے پر کنول بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے پیروں کے پاس سیاہ رنگ کا ایک بڑا سا بریف کیس رکھا ہوا تھا۔ وہ یاسمین شہریار کا پستول اپنے ہاتھ میں لئے مجھے دیکھ رہی تھی۔ یاسمین شہریار نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ اسے بھی یقیناً کسی کی موجودگی کا احساس ہو گیا تھا۔ جیسے ہی اس کی نظر کنول پر پڑی اس کے منہ سے تحیر زدہ آواز نکلی۔ "کنول تم؟"

مجھ میں اتنی تاب نہیں رہی تھی کہ کنول سے نگاہیں چار کر سکتا۔ کنول نے یاسمین شہریار کے اظہار حیرت پر کچھ نہ کہا۔ اس کی آنکھیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ ان آنکھوں میں ایک عجیب سی حسرت ناک خواہش جھانک رہی تھی۔ اس کے ہونٹ اس طرح بند تھے جیسے غم نے انہیں سی دیا ہو۔ میں اندر ہی اندر کٹتا جا رہا تھا۔ اس کی خاموشی میرے لئے سوہان روح بنتی جا رہی تھی۔ میں چاہ رہا تھا کہ کنول زبان کھولے۔ مجھے یاسمین شہریار کے سامنے ذلیل کرے، طعنے دے، میرے دل پر چوکے لگائے۔ میں اسی لائق تھا۔

یاسمین شہریار اپنے آنسو پونچھتی ہوئی اٹھی۔ وہ کنول کے پاس بیٹھنا چاہ رہی تھی۔ کنول نے اس پر پستول تان لیا۔ "چلو! ادھر ہی بیٹھو اپنے محبوب کے پاس!"

اس نے میرے دل پر دہکتا ہوا انگارا رکھ دیا تھا۔ میں تڑپ گیا۔ میرے ہاتھ پیروں میں جیسے جان نہیں رہی تھی۔ میں نے بہ وقت تمام کنول کو مخاطب کیا۔ "سنو! تمہیں میرے بارے میں ...."

اس نے چونک کر میری بات کاٹی۔ "فرید!" اس کی آواز میں بلا کا کرب چھپا ہوا تھا۔ "تمہیں اپنی صفائی میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ میں جانتی ہوں کہ تمہیں مجھ سے نہیں مہ جبیں سے محبت ہے۔ تم نے اپنی غرض کی خاطر مجھ سے محبت کی۔ کیا یہ جھوٹ ہے؟"

"کنول! کنول!" میری آواز حلق میں پھنسنے لگی۔ "کیا تم میرے زخموں پر نمک چھڑکنے آئی ہو؟"

"زخم!..... کیا تم جانتے ہو کہ زخم کیا ہوتا ہے؟ وہ کیسا مزا دیتا ہے؟ نہیں فرید! تم نہیں جانتے۔ زخم تو صرف انہا ملتا ہے جو محبت کرتے ہیں۔ تبسم نے تم سے شادی کر کے میرے دل پر کاری زخم لگایا ہے کہ تم اس کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ میں اس روز سے تبسم کی دشمن بن گئی جس روز مجھے یہ معلوم ہوا کہ تبسم نے تم سے شادی کر لی ہے۔ دنیا کی کوئی عورت تمہیں مجھ سے نہیں چھین سکتی! پھر تبسم کیسے چھین سکتی ہے میری محبت!"

وہ چپ ہوئی تو میں نے ایک سرد آہ بھری۔ "کنول' میں نے زمانے کی بہت ٹھوکریں کھائی ہیں۔ اب میرے پاس کچھ نہیں رہا ہے۔ میں فرید نہیں ہوں ایک قاتل ہوں۔ میں نے ایک شخص کو اس کے ناکردہ گناہ کی سزا دی ہے۔ میں آج کسی بھی وقت گرفتار ہو سکتا ہوں۔ اگر گرفتار نہیں ہوا تو کل اپنے آپ کو قانون کے حوالے کر دوں گا۔ اگر میں نے اپنے آپ کو قانون کے حوالے نہیں کیا تو تبسم مجھے ایک لمحہ چین لینے نہیں دے گی۔ اچھا ہوا تم میری بربادی کا تماشا دیکھنے چلی آئیں۔ کچھ دیر کی بات ہے پولیس مجھے گرفتار کرنے کے لئے آ رہی ہو گی۔"

"تم ایک انسان کے کب سے قاتل ہو گئے؟ تم تو محبت کے قاتل ہو؟" کنول نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"تمہیں اختیار ہے۔ تم جو چاہو کہہ سکتی ہو؟"

"وہ قتل نہیں ایک ڈرامہ تھا۔" کنول کے لبوں پر پھیکا تبسم پھیل گیا۔ "تم بھی فریب کھا گئے اور اپنے آپ کو قاتل سمجھ بیٹھے۔"

"وہ ڈرامہ تھا؟" میں چونک گیا۔ "نہیں کنول ڈرامے ایسے نہیں ہوتے میں نے اپنے ہاتھوں سے اس بدنصیب شخص کو قتل کیا ہے۔"

"تم تبسم کو نہیں جانتے! ایسے ڈرامے کھیل کر اس نے کتنے ہی مردوں کو پھانس رکھا ہے۔" کنول کہنے لگی۔ "وہ خنجر نقلی تھا۔ اس نے تم سے چیخ کر کہا ہو گا کہ اس شخص کے پیٹ میں خنجر جھونک دو اور تم نے ایسا ہی کیا ہو گا تو اس نے خنجر کے دستے سے پکڑ لیا ہو گا اور خنجر کا دستہ تمہارے ہاتھ سے نکل گیا ہو گا۔" کنول اپنی رو میں کہے جا رہی تھی

اور میں حیرت سے اس کی شکل دیکھے جا رہا تھا۔ "خنجر اس کے پیٹ میں اترتے ہی خون کا فوارہ ابل پڑا۔ وہ خنجر تھامے ہوئے منہ کے بل گر پڑا۔ تم اس کے پیٹ پر سے کپڑا ہٹا کر دیکھتے تو اس شخص کی ضرورت سے زیادہ نکلی ہوئی توند کا راز سمجھ میں آ جاتا۔ وہ پیٹ پر ایک تھیلی باندھ کر آیا تھا۔ جس میں سرخ رنگ کی گاڑھی روشنائی بھری تھی۔"

کنول کی زبانی تبسم کے فریب اور مکروہ سازش کی سنسنی خیز کہانی سن کر مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا جبکہ قدم قدم پر میں اس کی بے رحمی کا نشانہ بنا تھا۔ کوئی ایسا شخص جس کا واسطہ تبسم سے نہ پڑا وہ وہ کبھی اس کہانی کی سچائی پر یقین نہیں کر سکتا کہ وہ عورت اس قدر ذہین ایسی شاطر اور ایسی خطرناک ہو سکتی ہے۔ اس عورت کی درندوں جیسی سفاکی کی صفت کا احساس مجھے اب ہو رہا تھا۔ اس نے فی الحقیقت مجھے زندہ درگور کر دیا تھا۔ اگر کنول آج پھر ایک بار میرے لئے نجات دہندہ بن کر نہ آتی تو جانے میرا کیا حشر ہوتا۔ اس نے پہلے مجھے پری زاد خانم کی قید سے رہائی دلا کر ایک نئی زندگی دلائی تھی اور آج پھر حیات نو بخشی تھی۔

کنول کا دل کش حسن ایسا بھی گیا گزرا نہیں تھا کہ دل میں اتر نہ جائے۔ بلاشبہ وہ بے حد حسین تھی' ایسی حسین کہ کسی بھی مرد کی نگاہ اس پر پڑے تو اسے دیکھتا رہ جائے۔ میں بھی اس کے حسن پر ریجھ گیا تھا۔ اس کے حسن کا چرچا مجھے کشاں کشاں کھینچ کر اس کی دہلیز پر لے گیا تھا۔ ان دنوں اس نے اسٹیج کی دنیا میں اپنے بے پناہ حسن کے جلوؤں' جسمانی نشیب و فراز کی نمائش اور عشوہ و انداز سے ایک دنیا کو پاگل بنا رکھا تھا۔ مرد اسے پہلی نظر میں دیکھ کر بے قابو ہو جاتے تھے۔ وہ ایک عورت نہیں' اداکارہ تھی۔ اسے مردوں کے دلوں کو مسخر کرنا آتا تھا۔ میں اس کی محبت اور چاہت کے ہر انداز کو اداکاری سمجھ بیٹھا لیکن میرا یہ خیال جلد ہی غلط ثابت ہو گیا۔ میں حیران سا تھا کہ میں نے اس کے دل میں اپنے لئے کیسے جگہ بنا لی جبکہ اس کی خلوتوں میں کتنے مرد آتے اور چلے جاتے تھے۔ اگر مجھے اچانک مہ جبیں نہ ملتی تو شاید میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کنول کی محبت کو اپنا لیتا۔ مجھے کنول کی محبت کا شدید احساس تب ہوا جب مہ جبیں کو میں اپنے دل میں پوری طرح بسا چکا تھا۔ میں نے کنول کی محبت ٹھکرا دی لیکن وہ مجھے اپنے دل سے نہیں نکال سکی۔ جیسے وہ اداکاری کے لئے نہیں' صرف مجھ سے محبت کرنے کے لئے پیدا ہوئی تھی۔ میں اس کا مجرم بنا بیٹھا

تھا۔

"کنول!" میں نے بہ مشکل اسے مخاطب کیا۔

کنول نے میری جانب اس طرح سے دیکھا جیسے اس کی آنکھیں مجھ سے کہہ رہی ہوں۔ کیا تم میری محبت کا بدلہ دینا چاہتے ہو؟ نہیں فرید' میں نے کسی غرض کے تحت تمہیں اس جہنم سے نہیں نکالا۔ میں تم سے کچھ لینے اور مانگنے نہیں آئی۔ میں تمہارے نزدیک ایک عورت نہیں صرف اداکارہ ہوں۔ "فرید!" وہ آہستگی سے بولی۔ "میں نے یہ سب کچھ اس لئے نہیں کیا کہ تم پر احسان مقصود ہو۔ کسی شکریے کی ضرورت نہیں۔ میں نے تمہیں تبسم کے جال سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نجات دلوا دی ہے۔ اب تم واپس چلے جاؤ' وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ میں نے اس کے سارے پر کاٹ دیئے ہیں۔"

"یہ تمہارا وہم ہے۔" میں نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ "اس کے ہاتھ میں ابھی بھی ترپ کے پتے موجود ہیں۔"

کنول کے لبوں پر غیر اختیاری افسردہ مسکراہٹ ابھر آئی۔ "تمہاری اور اس کی شادی کی تصویریں' وڈیو فلم کیسٹ اور تمہاری باتوں کا ٹیپ کیا ہوا کیسٹ....." اس نے اپنی بات ادھوری ہی چھوڑ دی۔

میں اس کی نگاہوں کی تاب نہیں لا سکا اور نظریں نیچی کر لیں۔

"آج میں نے ایک سفاک عورت کے وجود کو ریزہ ریزہ کر دیا ہے۔" کنول نے بریف کیس کی جانب اشارہ کیا۔ "اس بریف کیس میں نہ صرف تمہاری' یاسمین شہریار کی بلکہ کتنی عورتوں اور مردوں کی غلاظت موجود ہے جس سے اس نے لوگوں کی زندگی اجیرن بنا رکھی تھی۔"

مجھ پر اور یاسمین شہریار پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ ہم دونوں نے بے پناہ خوشی سے سرشار ہو کر ایک دوسرے کی شکل دیکھی۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ یاسمین شہریار کی حالت بھی مجھ سے مختلف نہیں تھی۔ کنول کی نگاہیں ہمارے چہروں پر مرکوز تھیں۔ میں نے اس کی آنکھوں میں نمی دیکھی۔ اس کی آنکھوں کا رنگ بدلا بدلا سا تھا۔

"سچ کنول!" فرط مسرت سے میں بول اٹھا۔ "تم نے ایک ایسا عظیم کارنامہ انجام دیا

ہے کہ مجھے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خرید لیا ہے۔"

"مجھے لفظوں کا فریب مت دو فرید!" کنول کے چہرے اور لہجے میں تیزی و تندی تھی۔ "میں نے تبسم سے اپنی جنگ لڑی ہے۔ یہ جنگ اس کے اور میرے درمیان تھی۔ جنگ اور محبت میں ہر چیز جائز ہے۔ آج میں نے اس کا طلسم پاش پاش کر دیا ہے۔ میں نے اس کی نخوت' تکبر' امارت' درندگی' شان و شوکت اور بھی کچھ چھین لیا ہے۔ وہ پھر سے ایک عورت بن جائے گی۔"

"تمہیں یہ بریف کیس ملا کہاں سے؟" یاسمین شہریار کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔

"اس بریف کیس یا غلاظت کی تلاش میں تم دونوں بھی اس کے گھر پر گئے تھے نا؟" کنول کا لہجہ سپاٹ تھا۔ "میں نے اس کی غیر موجودگی میں اس بریف کیس کو تلاش کیا تھا۔ وہ مجھ سے اس قدر قریب تھی کہ اکثر مزے لے لے کر بتاتی رہتی تھی کہ وہ کس کس کو بلیک میل کر رہی ہے' کس طرح ستا کر لطف لے رہی ہے۔ وہ اذیت پسند عورت تھی۔ مجھے اس نے بس یہ نہیں بتایا تھا کہ بریف کیس کو کہاں چھپا کر رکھتی ہے۔ میرے علم میں یہ بات ضرور تھی کہ وہ بریف کیس ساتھ لئے پھرتی ہے۔ اس نے اپنا بریف کیس کار کی ڈگی میں رکھا ہوا تھا۔ مجھے یہ خیال یوں آیا کہ جب میں یہاں آئی تو تبسم اور تم لوگوں کے درمیان باتیں ہو رہی تھی۔ معاً" مجھے خیال آیا تو میں نے اس کی کار کے اندر جھانکا اور کار کی ڈگی کھول لی۔"

"تم نے بغیر چابی کے ڈگی کیسے کھول لی؟" یاسمین شہریار نے پوچھا۔

"یہ محض اتفاق تھا کہ کار کی چابیاں اگنیشن میں لگی ہوئی تھیں۔" کنول نے جواب دیا۔ "ورنہ میں کار کی ڈگی کسی بھی تار سے کھول لیتی۔ میں نے اپنے والد کے گیراج میں کئی برس کام کیا ہے۔"

یاسمین شہریار اپنی جگہ سے اٹھی تو اس کے انگ انگ سے ایک عجیب سی سرشاری ٹپک رہی تھی۔ جب وہ کنول کی جانب بڑھی تو اس نے یاسمین شہریار پر پستول تان لیا۔ "ڈاکٹر! تم اپنی جگہ پر خاموشی سے بیٹھی رہو۔"

یاسمین شہریار ٹھٹک کر رک گئی۔ اس کے چہرے سے ساری خوشی کافور ہو گئی۔ اس

نے حیرانی سے کنول کو دیکھا۔ "کنول! میں تمہاری دوست ہوں۔"

"تم اپنی جگہ جا کر بیٹھ جاؤ۔" کنول کا لہجہ تحکمانہ تھا۔ اس کے تیور ایک دم بدل گئے۔ یاسمین شہریار نے ایک زر خرید غلام کی طرح اس کے حکم کی تعمیل کی۔ اس کے چہرے پر خوف کے سائے پھیلنے لگے۔ کنول نے اسے مخاطب کیا۔ "مس شہریار! رات تمہاری قسمت اچھی تھی کہ میرا نشانہ چوک گیا ورنہ تم زندہ نہ بچتیں۔ وہ چاقو زہر میں بجھا ہوا تھا۔"

مجھ پر اور یاسمین شہریار پر سکتہ سا چھا گیا۔ یاسمین شہریار نے چونک کر خوف زدہ آواز میں پوچھا۔ "وہ تم تھیں؟" اس کے لہجے میں حیرت اور دکھ نمایاں تھا۔ "تم میری جان کی دشمن کیوں بن گئی تھیں؟ میں نے تمہارا کیا بگاڑا تھا؟ اور وہ ٹیلی فون ..." اس نے اپنا فقرہ ناتمام چھوڑ دیا۔

"وہ ٹیلی فون بھی میرا تھا اور رات میں تمہیں قتل کرنے بھی آئی تھی۔" کنول کی آواز تیز اور وحشیانہ تھی۔ "تم کیا ہر وہ عورت میری دشمن ہے جسے میں فرید کے پہلو میں دیکھوں۔ تم نے میرے فرید پر اپنا جادو چلا دیا' اسے ڈس لیا جبکہ اس پر میرا حق ہے۔ یہ کیسا تماشا ہے کہ میں جس سے محبت کرتی ہوں وہ تم جیسی عورتوں کی خلوتوں کا ساتھی بن جاتا ہے! کیا تمہیں خبر نہ تھی کہ فرید میرا ہے؟ میں نے اپنا سب کچھ اسے سونپ دیا ہے۔ پھر تم نے کیوں اس میں اپنا زہر سرایت کر دیا' کیا مجھے تڑپانے' ترسانے اور سسکا سسکا کر مارنے کے لئے؟"

"کنول! میری بات تو سنو!" اس نے تیزی سے بات کاٹ کر کچھ کہنا چاہا۔

کنول نے اسے سختی کے ساتھ جھڑک دیا۔ "اپنی صفائی پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں جانتی ہوں کہ تم کیا ہو؟ لیکن یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لو کہ فرید میرا ہے' صرف میرا ہے!"

میں کنول کی شدت محبت دیکھ کر گھبرا سا گیا۔ وہ آج بھی اسی شدت سے مجھے چاہ رہی تھی۔ اس کے تیور اس قدر خطرناک تھے کہ میری رگوں میں سنسناہٹ دوڑنے لگی۔ یاسمین شہریار کسی معصوم بچی کی طرح یوں سہم گئی جیسے کسی شیطان نے اسے ڈرا دیا ہو۔ "کنول!" اس کی آواز بھرا گئی۔ "خدا کے لئے مجھے معاف کر دو۔ تمہارا فرید۔ تمہیں مبارک

ہو۔ حالات نے ہمیں یکجا کر دیا ورنہ میں نے کبھی نہیں چاہا کہ کسی کی محبت پر ڈاکہ ڈالوں۔ مجھ پر ایک احسان اور کرو کہ اس بریف کیس میں سے میری چیزیں مجھے دے دو۔"

"جن جن کی چیزیں ہیں میں خود انہیں اپنے ہاتھوں سے ان تک پہنچاؤں گی۔" کنول نے نخوت سے کہا۔ "لیکن تمہاری اور فرید کی چیزیں میرے پاس رہیں گی۔"

یاسمین شہریار کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ مجھے لگا کہ وہ کنول نہیں' تبسم ہے' ایک نئی تبسم! میں کنول کے الفاظ کے ڈنگ نہ سہہ سکا۔ "کنول! تو کیا تم تبسم بننا چاہتی ہو؟"

"تم جو چاہے سمجھ لو!" کنول نے بے پروائی کے انداز میں جواب دیا۔ "میں کسی کی سوچ پر پہرے نہیں بٹھا سکتی۔"

"تم بھی ہمیں بلیک میل کرو گی؟" یاسمین شہریار کا چہرہ متغیر ہو گیا۔

"ہاں! ہاں!" کنول نے جھلا کر کہا۔ "جب تم اپنے تئیں سب کچھ سمجھ رہی ہو تو مجھ سے کیوں پوچھتی ہو؟"

"کیا تم اس طرح میری محبت حاصل کرنے کے لئے اپنی راہ بنا رہی ہو؟" میں نے طنز سے کہا۔ "تم میں اور تبسم میں فرق کیا رہ جائے گا! کیا ہر عورت تبسم ہوتی ہے؟"

"فرید!" وہ ہذیانی انداز میں چیخی۔ "مجھے تبسم نہ کہو! گالی نہ دو! میں کنول نہیں' وحیدہ ہوں' صرف وحیدہ!"

"اگر تم وحیدہ ہو تو پھر بلیک میل کیوں کرنا چاہتی ہو؟" میں نے بڑے کرب سے پوچھا۔

"میں تم دونوں کو بلیک میل یقیناً کروں گی' لیکن تبسم کی طرح نہیں۔" اس نے اپنے ہیجان پر قابو پا کر کہا۔ "میں اس کے عوض تم دونوں سے کچھ وصول نہیں کروں گی' کبھی پریشان نہیں کروں گی۔ میری چند شرائط ہیں جن پر تم دونوں کو عمل کرنا ہو گا۔"

"مجھے تمہاری ہر شرط منظور ہے۔" یاسمین شہریار تڑپ کر بولی۔

"تم شریفانہ زندگی گزارو گی۔" کنول نے جواب دیا۔ "تم ایک ڈاکٹر رہو گی' فاحشہ نہیں بنو گی۔ میں تمہاری کڑی نگرانی کرتی رہوں گی۔"

یاسمین شہریار نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے گلے کی رگیں کھنچ آئی تھیں۔ جیسے وہ خون کا گھونٹ پی رہی ہو۔ "مجھے منظور ہے!"

"میں چاہتی ہوں تم اپنے گھر جاؤ اور اس روز کا انتظار کرو جب میں تمہیں باپ بننے کی خوش خبری سنا دوں۔"

"کیا کہا؟" میں بھونچکا ہو گیا۔ چند لمحوں تک میری زبان تالو سے چپکی رہی۔ "تم نے تو کہا تھا کہ وہ سب کچھ ایک ڈھونگ تھا۔ تم نے مجھے اور نصیر کو آزمایا تھا۔"

"میں نے جھوٹ کہا تھا؟" کنول کہنے لگی۔ "اس لئے کہ تم اور نصیر اس بچے کے دشمن ہو گئے تھے اور میری جان لینے پر تل گئے تھے۔ اگر میں جھوٹ نہ بولتی تو تم مجھے یقیناً قتل کر دیتے۔ بولو' کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟"

میرے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ میں واقعی اس کا مجرم تھا۔ یہ لمحہ مجھ پر اس قدر سنگین اور ایسا بھاری ہو گیا تھا کہ میں دیر تک ندامت سے جھکا ہوا سر نہ اٹھا سکا۔ میری باتوں کا ٹیپ کیا ہوا وہ کیسٹ جس میں میں نے کنول کو دینے کے لئے زہر مانگا تھا اور جب اس نے مجھے خوب شراب پلا کر میرے دل کی ہر بات اگلوا لی تھی۔ وہ کیسٹ اب تبسم کے ہاتھ سے نکل کر کنول کے ہاتھ لگ چکا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ تبسم نے وہ کیسٹ کنول کو سنایا تھا یا نہیں۔ میں عجیب مخمصے میں پھنسا ہوا تھا۔ میرے ماؤف دماغ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب آخر کون سا ایسا عذر تراشا جائے کہ کنول کے دل کی ساری کثافت دھل جائے اور میں کسی نہ کسی طرح کم از کم وہ کیسٹ ہی حاصل کر لوں جس سے تبسم مجھے بلیک میل کر رہی تھی۔

وہ مجھے خاموش پا کر بھرائی ہوئی آواز میں مخاطب ہوئی۔ "تبسم نے ایک مرتبہ مجھے تمہارا ٹیپ کیا ہوا کیسٹ سنایا تھا۔ میں نے اسے اپنی سماعت کا فریب سمجھا لیکن یہ ایک بھیانک حقیقت تھی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ آواز یہ چہرہ تمہارا ہے۔" اس کا گلا رندھ گیا۔ "فرید! آج تمہیں بتانا پڑے گا کہ تم مجھ سے ایسی شدید نفرت کیوں کرتے ہو؟"

میں سٹپٹا گیا۔ میں نے بہ دقت تمام اپنے آپ کو سنبھال کر کہا۔ "تبسم نے مجھے اس قدر شراب پلائی تھی کہ میں اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا تھا۔"

"نشے میں آدمی جھوٹ نہیں سچ بولتا ہے۔"

میں چکرا سا گیا۔ تبسم نے مجھ سے نہ جانے کیا کچھ اس لئے کہلوایا تھا کہ وہ مجھے بلیک میل کر سکے۔

کنول یکایک اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ "میں یہاں سے جا رہی ہوں۔ تم دونوں مجھ سے یہ بریف کیس حاصل کرنے کے لئے کوئی غلط حرکت نہیں کرو گے!" اس نے ایک ہاتھ میں بریف کیس اور دوسرے ہاتھ میں پستول سنبھال لیا اور اس کی ایک انگلی لبلبی پر جم گئی۔ "تمہاری بے وفائی نے مجھے بے رحم بنا دیا ہے۔ میں شاید تمہاری زندگی کے کسی موڑ پر اچانک نمودار ہو جاؤں یا شاید اس راستے پر لوٹ کر نہ آؤں۔ اس کا فیصلہ حالات نہیں' وقت نہیں بلکہ میرا دل کرے گا۔"

ایک تیر تھا جو کڑی کمان سے نکل جانے کے لئے بے تاب تھا۔ اس تیر کے نکل جانے کا مطلب یہ تھا کہ میں زندگی بھر کنول کے رحم و کرم پر رہتا۔ وہ مجھ سے مہ جبیں کو چھین لینا چاہتی تھی اور چھین بھی سکتی تھی۔ آج کا ایک ایک لمحہ بڑا قیمتی تھا۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ اسے بریف کیس کے ساتھ یہاں سے جانے نہ دوں' بریف کیس چھین لوں ورنہ تم زندگی بھر سولی پر لٹکے رہو گے۔

کنول کے ہاتھ سے بریف کیس چھین لینا کوئی کھیل یا مذاق نہیں تھا۔ وہ پوری طرح چوکنا تھی۔ وہ آہستہ قدمی سے دروازے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ معاً میری نگاہ یاسمین شہریار پر پڑی۔ اس کی آنکھوں سے خوف و ہراس جھانک رہا تھا۔ وہ کنول کے ارادوں سے حد درجہ خائف دکھائی دے رہی تھی۔ یاسمین شہریار نے یکایک اس ثانیے سے فائدہ اٹھایا جب کنول تیزی سے مڑنے والی تھی۔ وہ کسی بھوکی شیرنی کی طرح اس پر جھپٹی لیکن قسمت نے اس کے ساتھ یاوری نہیں کی۔ اس کا ایک پیر ساڑھی کے پلو میں پھنس گیا تو وہ لڑکھڑا کے منہ کے بل فرش پر گری۔ کنول نے حواس باختہ ہو کر گولی چلا دی۔ سنسناتی ہوئی گولی یاسمین شہریار کے سر سے گزر کر کھڑکی کے شیشے پر لگی۔ ایک زور کا چھناکا ہوا۔ کرچیاں کمرے کے فرش پر بکھر گئیں۔ وہ اور غضب ناک ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ وہ تند و تیز آواز میں بولی۔ "میں نے تیسری مرتبہ تمہارے ساتھ رعایت کی ہے۔ تم واقعی خوش قسمت ہو۔" کنول کی سانس پھول رہی تھی۔ "تم دونوں یہ نہ سمجھنا کہ میں تن تنہا آئی ہوں۔ میرے ساتھ دو ایسے آدمی ہیں جو ایک اشارے پر تم دونوں کی گردنیں مروڑ سکتے ہو۔ یقین نہ آئے تو کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھ لو' سڑک کے کنارے کھڑی ہوئی کار میں وہ میرا انتظار کر رہے ہیں۔ کہیں وہ گولی چلنے کی آواز سن کر آ نہ جائیں۔"

کنول نے کسی تاخیر کے بغیر بیرونی دروازے کا رخ کیا۔ مجھ میں اس کا تعاقب کرنے کا حوصلہ نہیں رہا۔ میں یاسمین شہریار کی جانب متوجہ ہوا۔ وہ فرش پر بے سدھ پڑی ہوئی تھی اور گہری گہری سانسیں لے رہی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ میں اس کھڑکی کی جانب بڑھا۔ جو سڑک کی جانب کھلتی تھی۔ کنول عمارت سے نکل کر سڑک پر تیزی سے دوڑتی ہوئی ایک کار کی جانب جا رہی تھی جو سڑک کے کنارے کھڑی تھی۔ اس کار سے ایک تنومند شخص اترا اور گولی چلنے کی آواز سن کر تیزی سے عمارت کی جانب بڑھنے لگا مگر کنول کو دیکھ کر رک گیا۔ کنول نے نہ جانے اس سے کیا کہا۔ وہ دونوں تیزی سے کار کی جانب بڑھ گئے۔ چند لمحوں کے بعد کار اسٹارٹ ہو کر چل پڑی اور میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

میں یاسمین شہریار کے پاس پہنچ کر رکا اور جھک کر اسے اپنے ہاتھوں میں اٹھا لیا اور خواب گاہ میں لا کر اسے بستر پر لٹا دیا۔ وہ یکبارگی سسک اٹھی۔ اب مجھے اس کے آنسوؤں کی کوئی پرواہ نہیں رہی تھی۔ میرا ذہن کہیں اور تھا۔ تبسم کا بوجھ سینے سے اترا بھی نہیں تھا کہ کنول بوجھ بن گئی تھی۔ تبسم اور کنول میں بہرحال ایک نمایاں فرق موجود تھا۔ کنول ایک عورت تھی۔ اس کے سینے میں گوشت پوست کا دھڑکتا ہوا دل تھا لیکن میں اس دن سے ڈر رہا تھا جب کنول میرے گناہوں کی پوٹلی لے کر میرے گھر کی دہلیز پر پہنچے گی۔ تب میں کیا کروں گا؟ میرے گھر والے کیا سوچیں گے؟

میں نے اپنے دل کو تسلی دی کہ اس دن کے آنے میں کئی مہینے باقی ہیں۔ میں ابھی سے اس فکر میں کیوں ہلکان ہوا جا رہا ہوں۔ مجھے اب سنجیدگی سے مہ جبیں کو حاصل کرنے کے بارے میں سوچنا چاہئے۔ جتنا جلد ہو سکے مجھے مہ جبیں سے شادی کر لینا چاہئے۔ مہ جبیں سے جب میری شادی ہو جائے گی تو کنول میری راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈال سکے گی۔ اگر اس نے میری زندگی میں کانٹے بچھائے بھی تو مہ جبیں مجھ سے جدا نہیں ہو سکے گی۔ مہ جبیں سے فوری طور پر شادی بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ لاہور روانگی والے دن امی جان نے مجھے بتایا تھا کہ وہ مہ جبیں کے باپ سے رشتے کے بارے میں دریافت کرنے گئی تھیں تو بڑے میاں نے کہا تھا کہ اس کے فائنل امتحان ہو رہے ہیں۔ جب امتحان سے فارغ ہو جائے گی تو ہم اپنے اور اس کے فیصلے سے آگاہ کریں گے۔

میں نے یہ بھی غور کیا کہ یاسمین شہریار کے ساتھ یہاں کچھ دن رہ کر اس کھلونے سے جی بہلاؤں۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کھلونے کے حسن' تبسم' نگاہ' لمس اور جسم میں کوئی رنگ' کوئی دل کشی اور کشش نہیں رہی ہے۔ وہ سر تا پا کسی ویران کھنڈر کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔ مجھے اس سے کراہیت سی ہونے لگی۔ یہاں ایک دن بھی رکنا کنول کے غضب' نفرت اور عداوت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ اب وہ مجھے یاسمین شہریار کے ساتھ کیا کسی بھی عورت کے ساتھ رنگ رلیاں مناتا ہوا دیکھ کر کسی بھی قیمت پر معاف نہیں کر سکتی تھی۔ میں جیسے اس کی ملکیت تھا۔ وہ ایک بھوکی شیرنی کی طرح بپھری ہوئی تھی۔ یاسمین شہریار پر اس کا قاتلانہ حملہ اور ٹیلی فون پر دھمکی دینا میرے لئے حیران کن تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ میری محبت میں اتنی دور جا سکتی ہے۔ کنول کا یکسر بدلا ہوا روپ نہ صرف میرے لئے بے حد خطرناک تھا بلکہ اب مجھے کسی قدر محتاط ہو کر اور پھونک پھونک کر قدم رکھنا تھا۔

بستر سے اٹھتے ہوئے یاسمین شہریار پر میں نے نگاہ ڈالی۔ اس کا چہرہ فق تھا' ہونٹ کانپ رہے تھے اور بند آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ مجھے ایک باسی روٹی کی طرح دکھائی دی۔ میں غسل خانے کی جانب بڑھ گیا۔

نہاتے ہوئے یکبارگی یہ خیال آیا کہ یاسمین شہریار شاید مجھے یہاں سے نہ جانے دے' اس لئے کہ وہ یہاں تنہا رہ جائے گی۔ اس کے ملازم بھی دو دن کی چھٹی پر گئے ہوئے ہیں اور وہ کل آئیں گے۔ وہ مجھے ان کی واپسی تک روکنے کی کوشش کرے گی۔ میں نے اپنے دل میں پختہ ارادہ کر لیا کہ ایک لمحہ بھی یہاں رکنا کسی مصیبت کو دعوت دینا ہے۔ تنہائی اس کا مسئلہ ہے' میرا نہیں۔ اس کا کیا ہے' وہ مال روڈ پر کسی بھی شخص پر ڈورے ڈال کر اسے ورغلا سکتی ہے۔ اسے تنہا دیکھ کر کتنے ہی مرد اس کے قریب آنے کے لئے بے تاب ہو جائیں گے۔

میں بڑی دیر تک نہاتا رہا۔ میں بہت خوش تھا اور آزادی کا نشہ' اس کی سرشاری کی کیفیت اور تبسم کی آرزوؤں کی پامالی نے مجھے بلندیوں پر پہنچا دیا تھا۔ سب سے زیادہ خوشی تو اس بات کی تھی کہ میں قاتل نہیں رہا تھا۔ میں اسی خوشی میں جلد سے جلد لاہور پہنچ کر جشن منانا چاہتا تھا۔ جب میں غسل خانے سے باہر آیا تو کمرے میں یاسمین شہریار نہیں

تھی۔ میں سمجھا کہ شاید وہ ناشتہ تیار کرنے گئی ہو گی۔ میں جب کپڑے تبدیل کر کے سنگھار میز کے مقابل کھڑے ہو کر ناقدانہ نظروں سے اپنا جائزہ لے رہا تھا' تو مجھے کسی کے باتیں کرنے کی آواز آئی' جیسے یاسمین شہریار ملاقاتی کمرے میں کسی سے سرگوشی کے انداز میں باتیں کر رہی ہو۔ میں اس کمرے کی جانب بڑھا لیکن باہر ہی ٹھٹک کر رک گیا۔ یاسمین شہریار سسکیاں بھر رہی تھی۔ اسی کے ساتھ ایک مردانہ آواز سنائی دے رہی تھی۔ "میں نے تمہیں قتل کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ میں اس وقت محض تمہیں یہ جتانا چاہتا تھا کہ میں تمہارے پہلو میں کسی غیر مرد کو دیکھنا نہیں چاہتا۔ مجھے یہ پسند نہیں کہ میری محبت میں کوئی شریک ہو جائے۔ اب تم ہی بتاؤ' تم ایک معزز عورت ہو کر اس راہ پر کیوں چل نکلی ہو جو کسی بھی عورت کو زیب نہیں دیتی؟"

یاسمین شہریار نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ سسکیاں بھرے جا رہی تھی۔ وہ شاید پشیمان ہو رہی تھی' اپنی حرکتوں پر نادم تھی۔ کچھ دیر بعد اس کی تھرتھرائی آواز گونجی۔ "مجھے معاف کر دو۔ مجھ سے بڑی بھول ہوئی۔ میں واقعی ایک بری عورت بن گئی تھی' لیکن اب ... اب میں پلٹ کر بھی نہیں دیکھوں گی۔"

"میری ایک بات کا جواب دو یاسمین!" مرد کی بھرائی ہوئی آواز گونجی۔ "کیا محبت کرنے کے لئے ایک مرد کا دولت مند' رتبے والا اور ......"

"جمیل!" وہ اس کی بات کاٹ کر چیخ اٹھی۔ "تم میرے دل پر چرکے نہ لگاؤ۔ میں پہلے سے ہی بہت دکھی ہوں۔"

میں نے ایک قدم آگے بڑھ کر اندر جھانکا۔ انتہائی رقت آمیز رومانی منظر میری نظروں کے سامنے تھا۔ اس کا سرپھرا عاشق جمیل یہاں پہنچ گیا تھا۔ بچھڑے دلوں کا ملاپ ہو گیا تھا۔ جمیل کی پشت میری جانب تھی۔ وہ جمیل کے بازوؤں میں سمٹی اس کے سینے سے لگی سسکیاں بھر رہی تھی۔ میں مسکراتا ہوا دبے پاؤں اپنے کمرے میں آ گیا۔ میں نے اپنی اٹیچی الماری سے نکالی اور اس میں اپنے کپڑے رکھے۔ میں دانستہ خاصی دیر بعد اس کمرے میں گیا۔ میرے اندازے کے مطابق محبت کے اس ڈرامے نے ایک خوشگوار موڑ لے لیا تھا۔ جب میں کمرے میں داخل ہوا' میرا قیاس درست ثابت ہوا۔ یاسمین شہریار کی نظر مجھ پر پڑی تو اس کا ہنستا ہوا چہرہ زرد پڑ گیا۔ شاید اسے میری موجودگی کا احساس نہیں رہا تھا۔

جمیل مجھے نفرت بھری نگاہوں سے گھور رہا تھا۔ یاسمین شہریار کی نگاہ جیسے ہی اٹیچی پر پڑی تو اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ میں یاسمین شہریار سے مخاطب ہوا۔ "ڈاکٹر! میں آپ کی عنایتوں کا بے حد ممنون ہوں۔ میں آپ کی رفاقت اور دوستی کو کبھی نہیں بھول سکوں گا۔ کراچی میں آپ سے پھر ملاقات ہو گی۔"

"آپ مسٹر جمیل ہیں!" یاسمین شہریار نے معنی خیز انداز سے مجھے دیکھا۔ "کیا آپ ابھی جا رہے ہیں؟" اس کے لہجے میں سرشاری چھپی نہ رہ سکی۔

میں نے آگے بڑھ کر گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔ "آپ سے مل کر مجھے بڑی خوشی ہوئی۔"

جمیل نے بھی بڑی گرم جوشی سے ہاتھ ملایا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کی آنکھوں میں نفرت کی جگہ ممنونیت نے لے لی ہے۔ میں یاسمین شہریار کی جانب گھورا۔ وہ میرے یہاں سے چلے جانے پر انتہائی مسرور نظر آ رہی تھی۔ میں نے ان دونوں کو خدا حافظ کہا اور باہر نکل آیا۔ میں نے اب کراچی واپس جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

میں جس وقت تیزی سے بس اسٹینڈ کی جانب جا رہا تھا مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ میرے سینے میں اب بھی تبسم کی ہیبت بیٹھی ہوئی ہے کچھ دیر پہلے اس کا بت ایک ہی کاری ضرب میں پاش پاش ہو کر بکھر چکا تھا۔ پھر نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ اپنے بریف کیس کے چوری ہو جانے پر اس کی تلاش میں یہاں بھی کسی بھوکی شیرنی کی طرح بپھری ہوئی آ سکتی ہے۔ میں اس خوف اور خدشے کے باعث یہاں سے جلد از جلد نکل جانا چاہتا تھا۔ تاکہ وہ مجھ پر کوئی نئی افتاد بن کر نازل نہ ہو جائے۔ مری سے اسلام آباد بس میں جاتے ہوئے میں بڑے کرب سے سوچ رہا تھا کہ میری زندگی میں مصیبتوں کا دروازہ اب بھی ہمیشہ کے لئے بند نہیں ہو سکا بلکہ کھلا رہ گیا ہے۔ میں تو اس وقت یہ سوچ کر دل میں بہت خوش ہوا تھا کہ میری زندگی میں تبسم کا جو زہر سرایت کر گیا تھا اسے کنول نے تریاق بن کر نکال دیا لیکن بھرپور خوشی کا یہ عرصہ ہوا کے ایک فرحت بخش جھونکے کی طرح تھا جو چھوتا ہوا گزر گیا تھا۔ میں تو کنول کی غیر متوقع آمد پر حیران تھا جو اس سنگین موقع پر میرے لئے مسیحا تو بن کر آئی تھی لیکن میرے دل میں کانٹا بن کر چبھ گئی۔ اس کی چبھن مجھے بے چین کر رہی تھی۔ تبسم شاید کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ کس نے اس کے دونوں ہاتھ

کاٹ کر اسے زندگی بھر کے لئے مفلوج کر دیا ہے۔ تبسم نے مجھے اپنی جنسی آسودگی اور دولت کے حصول کی خاطر بلیک میل کیا تھا۔ وہ ایک سفاک درندہ صفت' بدکار اور حد درجہ شاطر عورت تھی۔ کنول اس سے یکسر مختلف تھی۔ اسے محبت کی ناکامی اور مایوسی نے تبسم سے کہیں زیادہ بے رحم بنا دیا تھا۔ اس نے اسی لئے تبسم کا بریف کیس پانے کے بعد مجھے اور یاسمین شہریار کو پوری طرح اپنی دسترس میں رکھا تھا۔ گو میں آزاد تھا لیکن میری حالت ایک قیدی کی سی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ صیاد بدل گئے تھے اس وقت بھی میرے لئے یہ تصور وحشت ناک اور انتہائی روح فرسا تھا کہ وہ میرے بچے کی ماں بننے والی ہے۔ دن ہفتے اور مہینے پلک جھپکتے گزر جائیں گے۔ کنول کسی روز میرے گناہوں کی پوٹلی اپنی بانہوں میں لئے میرے گھر کی دہلیز پر آ جائے گی۔ تب میں کیا کروں گا؟ میں اسے دھتکار کر ذلیل کر کے اور دھکے دے کر گھر سے نکال بھی نہیں سکوں گا۔ اس لئے کہ اس کے پاس میری باتوں کا ٹیپ کیا ہوا کیسٹ موجود ہے اس میں میرے خلاف ہر قسم کا ثبوت موجود ہے۔ مہ جبیں سے کسی صورت وہ میری شادی نہیں ہونے دے گی۔

اسلام آباد پہنچ کر سب سے پہلے میں نے ایک اچھے ریستوران میں ڈٹ کر پر تکلف کھانا کھایا۔ پوسٹ آفس جا کر گھر والوں کو ایک مفصل خط لکھا اور انہیں اپنی کراچی روانگی کے پروگرام سے آگاہ کیا۔ اسلام آباد کی سیر کر کے میں راولپنڈی پہنچا تو دن ڈوب گیا تھا۔ میں نے اولڈ کامران ہوٹل میں ایک کمرہ لیا اور رات کا کھانا کھا کر ایسی گہری نیند میں ڈوبا کہ بیرا اگر مجھے نہ جگاتا تو میں سارا دن سو کر گزارتا۔

میں فرسٹ کلاس کا ٹکٹ لے کر پشاور سے آنے والی ٹرین میں سوار ہو گیا۔

کراچی پہنچ کر ایک ہفتہ پر سکون اور خیر و عافیت سے گزر گیا۔ ایک روز میرے دفتر میں فخرو بھائی آئے تو میرا ماتھا ٹھنکا۔ میرا قیاس درست ثابت ہوا۔ وہ کنول کی شادی کا پیغام لے کر آئے تھے۔ ہم دونوں ایک قریبی ریستوران میں سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ سوچتے رہے کہ آخر کس طرح کنول کو ٹالا جائے۔ کنول کو ٹالنا اب میرے لئے آسان نہیں رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں میں ایک بے جان کھلونا تھا۔ وہ جب چاہتی میری بساط الٹ سکتی تھی۔ میری عزت ملیامیٹ کر سکتی تھی' میں کبھی مہ جبیں کو نہیں پا سکتا تھا۔ مجھے نوکری سے بھی جواب مل سکتا تھا۔ وہ جب چاہتی مجھے جیل کی ہوا کھلا سکتی تھی۔ سوچتے سوچتے میرے ذہن میں

ایک کوندا سا لپکا۔ میں فرط مسرت سے اچھل پڑا۔ میں نے فخرو بھائی کے دونوں ہاتھ تھام لئے اور اپنی خوشی کو دباتے ہوئے آہستگی سے کہا۔ "مجھے منظور ہے۔"

"کیا منظور ہے؟" فخرو بھائی نے حیرت سے اور ایسی نظروں سے مجھے دیکھا جیسے میں پاگل ہو گیا ہوں۔

"شادی!" میں نے کہا۔ "میں کنول سے شادی کرنے کو تیار ہوں۔"

"تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا؟" فخرو بھائی بھونچکا سے ہو رہے تھے۔ "ابھی تو تم اس سے شادی کرنے پر تیار نہیں ہو رہے تھے۔ اب شادی کرنا چاہتے ہو۔"

"میں ایک شرط پر اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

"کیسی شرط؟"

"شرط نہیں شرائط سمجھو۔" میں نے سنجیدہ ہو کر کہا۔ "میں کل ہی کنول سے شادی کرنے کو تیار ہوں۔ لیکن یہ شادی میرے فلیٹ میں چند خاص دوستوں کی موجودگی میں ہو گی اور اس شادی میں میرے گھر والے شریک نہیں ہوں گے۔ میں اپنے گھر والوں کو آہستہ آہستہ اس صدمے اور دھچکے کے لئے تیار کر کے انہیں منا لوں گا' پھر کنول کو با عزت طریقے سے اپنے گھر لے جاؤں گی۔ شادی کے فوراً بعد کنول مجھے وہ تمام چیزیں واپس کر دے گی جن کے باعث میں پریشان ہوں۔ ان چیزوں کی واپسی کے بعد میں کنول کے نام اپنا فلیٹ بھی لکھنے کو تیار ہوں۔"

"یار' تم واقعی پاگل ہو گئے ہو۔" فخرو بھائی نے تبصرہ کیا۔

فخرو بھائی رخصت ہو گئے تو میں دل میں بہت خوش تھا۔ کنول سے شادی کر کے میں وہ تمام چیزیں حاصل کر سکتا تھا۔ جنہوں نے میری زندگی اجیرن بنا رکھی تھی۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ جیسے ہی کنول وہ تمام چیزیں میرے حوالے کر دے گی۔ میں اسی وقت اسے طلاق دے دوں گا۔ اس طرح میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کنول سے نجات پا لوں گا۔ مجھے اس بات کا احساس تھا کہ کنول مجھ سے کس قدر شدید محبت کرتی ہے۔ وہ مجھے شادی کے لئے رضامند پا کر خوشی سے پاگل ہو جائے گی' پھر اسے میری چیزیں واپس کرنے میں کوئی تامل نہیں ہو گا۔

کنول نے میری شرائط منظور کر لی تھیں۔ تیسرے دن میرے فلیٹ میں عشاء کی نماز کے بعد شادی کا وقت مقرر ہوا۔ میں نے اس شادی میں اپنے کسی دوست کو مدعو نہیں کیا'

صرف چوکیدار اور اس کی بیوی کو بلا لیا تھا۔ اس شادی کے سارے انتظامات فخرو بھائی کو کرنا تھے۔ فخرو بھائی رات نو بجے کنول' قاضی صاحب اور چند لوگوں کو اپنے ساتھ لے آئے۔ جنہیں وکیل اور گواہ کے فرائض انجام دینا تھے۔ کنول کسی بیوٹی پارلر سے دلہن بن کر آئی تھی۔ وہ سرخ ساڑھی میں ایک ایسی دلہن لگ رہی تھی جسے کوئی مرد بھی دیکھ کر پانے کی خواہش کر سکتا تھا۔ اس کے بائیں ہاتھ میں وہ بریف کیس تھا جس میں میری جان اور عزت محفوظ تھی۔

شادی کی تقریب کا آغاز فوراً" ہی ہوا۔ نکاح ہونے کے بعد مہمانوں کو مٹھائی کھلا کر رخصت کر دیا گیا۔ فخرو بھائی دیر تک ساتھ رہے۔ کنول اپنے کمرے میں تھی۔ میں فخرو بھائی کو رخصت کرنے نیچے تک آیا۔ فخرو بھائی نے رخصت ہوتے وقت مجھے نصیحت کی کہ میں اس شادی کو آخری سانس تک نبھاؤں۔ میرے لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ آ گئی۔ میں نے فخرو بھائی کو اپنا منصوبہ نہیں بتایا اور نہ ہی انہیں اپنے اعتماد میں لیا۔ اگر میں انہیں اپنا منصوبہ بتا دیتا تو وہ کنول سے سب کچھ کہہ دیتے۔ انکا کوئی بھروسہ نہیں تھا۔ پھر کنول شادی کے لئے تیار نہ ہوتی۔

میں نے حجلہ عروسی میں قدم رکھا تو کنول کو دلہن کی طرح سر جھکائے بیٹھا دیکھا۔ اس نے لمبا سا گھونگھٹ نکال رکھا تھا۔ اس کا چہرہ چھپا ہوا تھا' لیکن خوب صورت ہاتھ پیر نظر آ رہے تھے۔ میں نے اس گٹھڑی پر ایک اچٹتی نگاہ ڈالی۔ دوسرے لمحے میری متلاشی نگاہیں کچھ اور تلاش کر رہی تھیں۔ معاً" میری نگاہ بریف کیس پر پڑی جو پلنگ کے سرہانے کے پاس رکھا ہوا تھا۔ سینے میں دھک دھک سی ہونے لگی اور اسی وقت بریف کیس سے وہ ساری چیزیں باہر نکالوں اور انہیں تلف کر دوں۔ اس طرح میرے سینے پر خوف و دہشت کی جو چٹان جمی ہوئی ہے وہ سرک جائے گی۔ میں ایک عذاب سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نجات پا لوں گا۔ میں نے یہ سوچ کر اپنے دل کو تسلی دی کہ ایسی کیا جلدی اور بے تابی ہے! بریف کیس اور کنول دونوں میری دسترس میں ہیں۔ اگر میں بریف کیس کھول کر دیکھنا اور اس کے اندر کی غلاظت کو ضائع کرنا شروع کر دوں تو وہ میری اس حرکت کو خود غرضی پر محمول کرے گی۔

یہ میری انتہائی عامیانہ حرکت ہو گی۔ شادی کے اس ڈرامے کا اتنی جلدی ڈراپ

سین بھی مناسب نہیں تھا۔ میں پلنگ پر کنول کے پاس جا بیٹھا تو وہ کسمسائی۔ اس رنگین گٹھڑی میں ہلکا سا ارتعاش پیدا ہوا۔ کنول کے دل میں میری بیوی بننے کا بڑا مان تھا۔ آج اس کا یہ ارمان پورا ہو گیا تھا۔ میں نے محض ایک مجبوری کے باعث اس سے شادی کی تھی۔ آج وہ بت ٹوٹنے والا تھا۔ میں نے جیب سے انگوٹھی نکال کر اپنے پاس رکھ لی۔ پھر دونوں ہاتھوں سے گھونگھٹ پکڑ کے اسے کنول کے سر کے پیچھے الٹ دیا۔ کنول جس وقت آئی تھی وہ برقع میں ملبوس تھی۔ میں اس کے چہرے کی جھلک نہ دیکھ سکا تھا۔ فخرو بھائی نے اس بات کی پوری پوری کوشش کی تھی میں دلہن کو نکاح کے فوراً بعد دیکھ نہ سکوں، حجلہ عروسی میں جانے کے لئے انتظار کروں۔ انہوں نے بڑی سنجیدگی سے روایت کو قائم رکھا تھا۔ کنول کے حسن و جمال پر میری نظر پڑی تو میں اسے دیکھتا رہ گیا۔ مجھے لگا کہ میں نے کنول کا ایسا دلکش ایسا حسین روپ کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک عجیب سا نور چھایا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ نہ جانے کس نامعلوم جذبے سے اس کے گداز ہونٹ اور سیپی کی طرح نازک نتھنے لرز اور پھڑک رہے تھے۔ اس کی جلد کی شفاف اور زیتونی رنگت عجیب دلکش دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے یکبارگی دل میں سوچا کہ کنول میری

دلہن بنی رہے تو اس میں حرج کیا ہے؟ لیکن اسی لمحے میری نظروں میں مہ جبیں کا سراپا ابھرا۔ کنول کی دلکشی اور اس کا سحر زائل ہوتا چلا گیا۔

میں نے کنول کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ میں نے اس کی مخروطی انگلی میں بیش قیمت انگوٹھی پہنا دی۔ میں جھک کر اس خوب صورت ہاتھ کو چومنے والا تھا کہ دفعتاً اطلاعی گھنٹی بجی۔ گھنٹی کی آواز سن کر کنول نے بھی اپنی آنکھیں کھول دیں۔ اس کے حسین چہرے پر استعجاب بکھر گیا۔ میں نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ میں پلنگ سے اٹھ کر باہر کے دروازے کی جانب بڑھا۔ معاً مجھے چوکیدار کا خیال آیا۔ اس وقت وہی آ سکتا تھا۔ یک لخت مجھے یاد آیا کہ میں نے اس سے دودھ منگوایا تھا۔ شاید وہ دودھ لے کر آیا ہو گا۔ میں نے دروازہ کھول دیا۔

میرے سامنے چوکیدار نہیں تھا بلکہ ایک ایسا شخص تھا جو اپنی وضع قطع سے بدمعاش دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے پیچھے تین اور بدمعاش کھڑے ہوئے تھے۔ مجھے اس کا چہرہ مانوس سا لگا۔ میں نے فوراً ہی اسے پہچان لیا۔ وہ تبسم کا آدمی تھا۔ میں نے اسے تبسم کے ہاں

دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں سے درندگی جھانک رہی تھی اور چہرے پر استہزائی مسکراہٹ نمایاں تھی۔ ان بدمعاشوں کو اچانک اور غیر متوقع اپنے سامنے پا کر میں حد درجہ خائف اور سراسیمہ ہو گیا۔ وہ چاروں پستول اور خنجروں سے مسلح دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے بڑی تیزی سے دروازہ بند کرنے کی کوشش کی لیکن مجھے دیر ہو گئی۔ اس بدمعاش نے دروازے پر ایک لات مار دی۔ دروازہ کھل کر مجھ سے ٹکرایا۔ میں اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور کئی قدم پیچھے جا کر فرش پر گر پڑا۔ میں سنبھل کر اٹھ کھڑا ہوا تھا کہ وہ چاروں میرے اردگرد کھڑے ہو گئے اور میں ان کے نرغے میں بری طرح پھنس گیا۔ ایک بدمعاش نے میری پیٹھ پر خنجر کی نوک رکھ دی تو میری ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ کی تیز لہر اٹھی۔

"کیا چاہتے ہو تم لوگ؟" میں نے پھنسی پھنسی آواز میں پوچھا۔

"اس کا جواب باس دیں گی۔" ان بدمعاشوں کے سرغنہ نے جواب دیا۔

"باس؟" میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی نگاہ یک لخت دروازے کی جانب اٹھی تو میری نگاہ بھی اسی سمت اٹھ گئی۔ میں سن ہو کر رہ گیا۔ تبسم کسی ملکہ کی طرح بڑے تکبر، رعونت اور طنطنے کے ساتھ کمرے کے اندر داخل ہو رہی تھی۔ کنول بھی اپنے کمرے سے نکل کر چلی آئی تھی۔ ایک سنگین ڈرامے کے اہم کردار ایک دوسرے کے سامنے کھڑے ہوئے تھے۔ تبسم نے اندر داخل ہونے کے بعد دروازہ بند کر دیا۔ اس نے کنول کو اور مجھے گھور کر دیکھا اور تیز و تند لہجے میں طنز سے کہنے لگی۔ "بہت خوب! یہاں شادی کا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔"

"باجی!" کنول نے چیخ کر کہا۔ "میں نے فرید سے شادی کر لی ہے۔ آپ یہاں کیا لینے آئی ہیں؟"

"آخر تم نے اپنی ضد پوری کر دکھائی۔" تبسم نے حقارت سے کہا۔ "میری کار سے میرا بریف کیس بھی چرا لیا۔"

"ہاں!" کنول نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ "میں تم جیسی کمینی عورت سے اور کیا سلوک کر سکتی تھی۔"

تبسم کا پارا چڑھ گیا۔ اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ "کنول اپنے آپے میں رہو۔ میرے منہ مت لگو ورنہ....."

"ورنہ کیا؟" کنول مسکرائی۔ "کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ ان حرامیوں کی مدد سے مجھے قتل یا مرعوب کر دو گی۔ اگر تمہارے دل میں ایسی کوئی آرزو ہے تو اپنی حسرت ابھی اور اسی وقت پوری کر لو۔"

کنول کے اس جملے نے بدمعاشوں کو کھولا دیا تھا۔ ان میں سے ایک بدمعاش کنول کی جانب بڑھا تو تبسم نے آگے بڑھ کر اسے روک دیا۔ وہ کنول سے مخاطب ہو کر وحشیانہ لہجے میں بولی۔ "میں تمہاری شادی میں کوئی رخنہ ڈالنے نہیں آئی ہوں۔ تمہیں یہ شادی مبارک ہو۔ حالانکہ تم نے میرا شوہر مجھ سے چھین لیا ہے' اس کے باوجود مجھے تم سے نہیں اس شخص سے نفرت ہے۔"

"تمہیں اس بریف کیس کے بارے میں کس نے بتایا کہ وہ میرے پاس ہے؟" یک بارگی کنول نے چونک کر پوچھا۔

"یاسمین شہریار نے۔" تبسم کے لہجے میں تمسخر جھلک رہا تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم سایہ بن کر میرے پیچھے لگ جاؤ گی۔ اگر میں یاسمین شہریار پر تشدد نہ کرتی تو یہ راز کبھی ظاہر نہ ہوتا اور میں یہ سمجھتی کہ بریف کیس کسی نے چرا لیا ہے۔ تم سیدھی طرح بریف کیس میرے حوالے کر دو۔"

"لیکن تم اب اس بریف کیس کو لے کر کیا کرو گی؟" کنول کے لبوں پر فاتحانہ مسکراہٹ چمکی۔ "میں نے اس سے ساری غلاظت نکال کر ان لوگوں کے حوالے کر دی ہے جنہیں تم بلیک میل کر رہی تھیں۔ اب اس بریف کیس میں صرف یاسمین شہریار اور میرے شوہر کو بلیک میل کرنے کے لئے مواد رہ گیا ہے۔"

تبسم کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ دوسرے لمحے اس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ "تمہیں کیا حق تھا کہ میری چیزوں کو تباہ و برباد کر دو!"

"میں بھی تم سے یہی پوچھنا چاہتی ہوں کہ تم نے میرے فرید پر ظلم و ستم کیوں توڑے؟" کنول نے تنک کر کہا۔ "میں آج یہ بریف کیس فرید کے حوالے کرنے والی ہوں۔"

"میں تم سے بحث کرنے نہیں بلکہ بریف کیس لے جانے آئی ہوں۔" وہ غصے سے کانپ رہی تھی۔ "میرے ساتھیوں نے مجھے اطلاع دی تھی کہ آج تم میرا بریف کیس اپنے

ساتھ ساتھ لئے گھوم رہی ہو۔"

"تمہارے کتے بڑے وفادار اور فرض شناس لگتے ہیں۔"

"بریف کیس میرے حوالے کر دو!" تبسم دہاڑی۔

"اگر میں بریف کیس دینے سے انکار کر دوں تو؟"

تبسم کے رخسار تمتما اٹھے اور اس کی آنکھیں چنگاریاں برسانے لگیں۔ "تم نے اس میں رکھی ہوئی بہت ساری چیزیں ان لوگوں کو واپس کر کے میرے ہاتھ کاٹ دیئے ہیں' لیکن یاسمین شہریار اور تمہارا شوہر میرا بڑھاپے تک سہارا بنے رہیں گے لہٰذا میں اس بریف کیس کو حاصل کرنے کے لئے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا سکتی ہوں۔"

ادھر میرا سیروں خون خشک ہوا جا رہا تھا۔ میں دوبارہ تبسم کے چنگل میں پھنسنے والا تھا۔ یہ سب کچھ کنول کی حماقت کی وجہ سے ہو رہا تھا۔ میں ان مسلح بدمعاشوں کے سامنے اپنے آپ کو بے بس پا کر کرسی پر بے جان ہو کر گر پڑا۔ کنول نے باری باری ان چاروں بدمعاشوں اور تبسم کے چہروں کا جائزہ لیا اور دروازے سے ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔ "تم جیت گئیں باجی!" کنول کے لہجے میں شکست تھی۔ "میں تمہیں ایک شرط پر بریف کیس دے سکتی ہوں۔ آئندہ کبھی تم میری راہ میں نہیں آؤ گی' فرید کو بلیک میل نہیں کرو گی' ورنہ میں مرتے مرتے تم سے انتقام لے کر رہوں گی۔ اگر میں انتقام نہ لے سکی تو پھر مسرت جہاں تمہیں سسکا سسکا کر مار دے گی۔"

مسرت جہاں کا نام سنتے ہی تبسم کا چہرہ سفید ہو گیا۔ نہ جانے وہ کون عورت تھی لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ تبسم جب اس عورت سے اس قدر خوف زدہ ہے تو کنول اس عورت کے ناطے تبسم پر اپنا دباؤ قائم رکھ سکتی ہے۔ آخر کس لئے اور کس خوف سے وہ بریف کیس تبسم کے حوالے کر رہی ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ تبسم اور کنول کی ملی بھگت ہو؟ وہ دونوں مل کر مجھے بے وقوف بنا رہی ہوں۔ میرے دل میں شک کی ایک لہر اٹھی اور نہ جانے کیوں میرا شک یقین میں تبدیل ہو گیا۔ یہ کوئی مصلحت نہیں تھی بلکہ ڈھکوسلا تھا۔ کنول' تبسم کی جانب سراسیمہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ تبسم نے بہ وقت تمام اپنی گھبراہٹ اور خوف پر قابو پا کر کہا۔ "میں وعدہ کرتی ہوں کہ آئندہ کبھی تم سے سامنا نہیں کروں گی۔ میرا شکار صرف یاسمین شہریار ہو گی۔"

"کوئی ایک شخص اندر جا کر بریف کیس لے آئے۔" کنول نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔
تبسم کے کمرے کے اندر داخل ہونے کے لئے اپنا قدم اٹھایا تھا کہ کنول سرعت سے اس کی راہ میں حائل ہو گئی۔ اس نے تند لہجے میں کہا۔ "تم اندر نہیں جا سکتیں؟"
"کیوں؟" تبسم متحیر ہو کر رک گئی۔
"یہ کمرہ حجلہ عروسی ہے۔" کنول کی آواز میں زہر بھرا ہوا تھا۔ "میں نہیں چاہتی کہ تم اپنے ناپاک قدم وہاں رکھ کے میری زندگی نجس کر دو۔"
تبسم کے سینے میں سانسوں کا مدوجزر اٹھا اور وہ کھول کر رہ گئی۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنا غصہ ضبط کیا اور گھوم کر ایک بدمعاش کو اشارہ کیا۔ وہ بدمعاش کنول کے ساتھ اندر گیا۔ پھر وہ کنول کے ساتھ باہر آیا تو اس کے ہاتھ میں بریف کیس تھا۔ تبسم نے اس کے ہاتھ سے بریف کیس لیا تو اس کی نفرت اور غصہ ڈھل گیا اور چہرہ دمک اٹھا۔ جس وقت وہ بریف کیس لے کر اپنے بدمعاش ساتھیوں کے ساتھ باہر نکل رہی تھی۔ مجھے لگ رہا تھا کہ میری زندگی اور عزت کا جنازہ چلا جا رہا ہے۔ میں بڑی بے بسی اور حسرت بھری نظروں سے اس بریف کیس کو دیکھتا رہا۔

میں نے آنکھیں بند کر کے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ کنول باہر کا دروازہ بند کرنے چلی گئی تھی۔ میں شدت غم سے نڈھال ہو رہا تھا۔ پھر مجھے معلوم ہی نہ ہوا کہ کنول کب میرے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ اس کے بدن سے پھوٹتی ہوئی مہک نے مجھے احساس دلایا کہ وہ برابر والی کرسی پر براجمان ہے۔ کنول نے بڑے پیار سے اپنی انگلیاں میرے بالوں میں الجھا دیں۔ "میرے سرتاج!" اس کی آواز محبت میں ڈوبی ہوئی تھی۔ "دل چھوٹا نہ کریں۔"
میں یکلخت اس پر برس پڑا۔ "تبسم، مسرت جہاں نامی عورت سے اس قدر خوف کھاتی ہے تو تمہیں بریف کیس اس کے حوالے کرنے کی کیا ضرورت تھی؟"
"مسرت جہاں!" کنول نے ایک سرد آہ بھری۔ "کاش وہ زندہ ہوتی تو تبسم کو میں اس ذلالت کی بڑی عبرت ناک سزا دلواتی۔ وہ کل ہی اس دنیا سے رخصت ہو گئی ہے۔"
"مسرت جہاں مر گئی!" میں چونک اٹھا۔ "کیا تبسم کو اس کی موت کی اطلاع نہیں ملی ہو گی؟"
"نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ "اگر اس کے علم میں ہوتا کہ مسرت جہاں مر

گئی ہے تو وہ اس قدر خوف زدہ نہ ہوتی۔"

"یہ مسرت جہاں کون تھی؟"

"شاید ایسی خطرناک عورت اس ملک کی سرزمین پر کبھی پیدا نہ ہوئی ہو گی۔" کنول نے کہا۔ "نہ جانے کیوں مجھے بے حد چاہتی تھی۔ تبسم سے اسے بے حد نفرت سی تھی۔ تبسم کیوں کہ اس کی بہت خدمت کیا کرتی تھی اور ہر طرح سے اس کے آرام کا خیال رکھتی تھی اس وجہ سے مسرت جہاں، تبسم کو اپنے ہاں حاضر ہونے دیتی تھی۔"

"وہ رہتی کہاں تھی؟"

"لاہور میں!"

"تم کسی نہ کسی بہانے بریف کیس اس کے حوالے نہ کرتیں۔" میرے لہجے میں تلخی بھر گئی۔ "مجھے چند لمحوں کا موقع بھی مل جاتا تو میں اپنی تصویریں اور کیسٹ اور فلمیں ضائع کر دیتا۔"

"تبسم ہر قیمت پر بریف کیس لے کر ہی ٹلتی۔"

"مسرت جہاں کی دھمکی دینے کے باوجود بھی؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں!"

"لیکن تم ابھی کہہ رہی تھیں کہ ..."

"تم جانتے ہو کہ تبسم کے یہ ٹھاٹ باٹ اور عیش و عشرت بلیک میلنگ کے کاروبار کی وجہ سے ہیں۔ میں نے اس کی روزی پر لات مار دی۔ اگر اسے یہ احساس نہ ہوتا کہ مسرت جہاں میری پشت پر ہے تو وہ مجھے اسی وقت اپنے ساتھیوں کی مدد سے قتل کرا دیتی۔ شاید وہ مجھے اس وقت بھی قتل کر جاتی، اگر اس بریف کیس میں تمہارے اور یاسمین شہریار کے خلاف کوئی مواد موجود نہ ہوتا۔ ابھی اس نے جو کچھ حاصل کیا ہے وہ فی الوقت اس پر گزر بسر کر لے گی اور پھر نئے شکار تلاش کر لے گی۔ یاسمین شہریار اور تم سے زیادہ رقم اینٹھنے کی کوشش کرے گی۔"

"میں تو بے موت مارا جاؤں گا!"

"آج کی رات یہ تمام باتیں سوچنے کی نہیں ہیں۔" کنول مسکرائی تو اس کی مسکراہٹ میں بڑی تازگی تھی۔ اس سنگین واقعے کا اس نے کوئی اثر نہیں لیا تھا۔ "سوچو کہ

رات کس قدر تیزی سے گزرتی جا رہی ہے۔ کیا تم انہی پریشانیوں میں یہ رات گزار دینا چاہتے ہو؟"

اب اس میں کوئی شک و شبہ نہیں رہا کہ کنول اور تبسم نے مل کر میرے خلاف منصوبہ بنایا تھا۔ کنول نے بریف کیس کے عوض مجھ سے شادی کر لی اور اپنا مقصد حاصل ہوتے ہی اس نے بریف کیس ایک منصوبے کے تحت تبسم کے حوالے کر کے مجھے پھر سے ایک پھندے میں جکڑ دیا تھا تاکہ میں اس سے بے وفائی نہ کر سکوں۔ انہوں نے آپس میں نہ جانے کن شرائط پر صلح صفائی کر لی تھی۔ مجھے اس کی خبر نہیں تھی' تاہم اتنا اندازہ ضرور ہو گیا کہ اب وہ دونوں مل کر میرے خلاف سازش کر رہی ہیں۔ جبھی بریف کیس ہاتھ سے نکل جانے کے باوجود اسے کوئی دکھ اور ملال نہیں تھا۔ اس کی جگہ کوئی اور عورت ہوتی تو وہ اس غم سے نڈھال ہو کر رہ جاتی کہ اس کا شوہر ایک شیطان کے جال میں پھنس گیا ہے۔

کنول کو شاید یہ خوش فہمی تھی کہ میں اس سے شادی کرنے کے بعد نجات حاصل نہیں کر سکوں گا۔ اس سے چھٹکارا پانا بہت آسان تھا۔ طلاق کے تین بول اس کے اور میرے درمیان ایک ایسی دیوار کھڑی کر دیتے جسے وہ گرانا چاہتی بھی تو کبھی گرا نہیں سکتی تھی' لیکن میں جلد بازی میں کوئی غلط قدم اٹھانا نہیں چاہتا تھا۔ میں کنول کے لبوں پر مسکراہٹ دیکھ کر اور اس کی بے نیازی اور خود غرضی کی باتیں سن کر اندر ہی اندر سلگ اٹھا تھا۔ میں نے پیچ و تاب کھاتے ہوئے کہا۔ "تم کس قدر خود غرض ہو کنول! مجھ پر ایک قیامت ٹوٹ پڑی ہے اور تمہیں اس کا کوئی احساس نہیں! تم یہ کیوں بھولتی ہو کہ میں تمہارا شوہر ہوں اور اب تم میری بیوی ہو۔ تبسم نے میری زندگی میں کانٹے بو دیئے ہیں۔ وہ مجھے بلیک میل کر کے زندہ درگور کر دے گی۔"

"تم صرف اتنی سی بات پر پریشان ہو رہے ہو؟" کنول سنجیدہ ہو گئی۔ "تمہیں میرے ارمانوں اور احساسات کا کوئی خیال نہیں! اس بارے میں کل بھی سوچا جا سکتا ہے۔"

"تم اس قدر خود غرض ہو!" میں نے حیرت سے کہا۔

"تم مجھ پر تہمت نہ لگاؤ۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ تم مجھ سے کہیں زیادہ خود غرض نے بریف کیس کی خاطر مجھ سے شادی کی۔ تم نے سوچا ہو گا کہ بریف کیس حاصل

کرنے کے بعد مجھے طلاق دے کر نجات حاصل کر لو گے۔ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟"

میں اپنے دل کی چوری پکڑے جانے پر سناٹے میں آگیا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کنول یہ سوچ سکتی ہے۔ میں ہکا بکا ہو کر اسے دیکھتا رہ گیا۔ لیکن فوراً ہی سنبھل گیا۔ میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "کنول! تم نے مجھے سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ کیا میں اس قدر ذلیل انسان ہوں کہ تم میرے میں ایسی غلط رائے قائم کر رہی ہو؟"

"کاش میرا اندازہ غلط ہو!" یکبارگی کنول کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

میں جیسے تڑپ کر بڑی بے تابی سے دیوانہ وار اس کی جانب بڑھا اور قریب پہنچ کر کہا۔ "کنول! کنول!" محبت اور جذبات میں ڈوبی ہوئی آواز بھر آنے لگی۔ کنول نے اپنا چہرہ ادھر ہٹایا۔ اس کی حیرت بھری آنکھیں میری آنکھوں میں جھانکنے لگیں۔ وہ ایک گہری عورت تھی۔ وہ دل کی اتھاہ گہرائیوں میں چھپی ہوئی باتیں پڑھ لیتی تھی۔ مجھے اس سے خوف آنے لگا تھا۔ "تمہاری سوچ اور اندازہ محض ایک مفروضے پر قائم ہے۔" میں نے کہا۔ "تمہاری محبت نے میرا دل جیت لیا ہے۔ شاید تم یقین نہیں کرو گی' لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ میں نے اپنے دل سے مہ جبیں کو نکال دیا ہے۔"

کنول کو جیسے میری بات کا یقین نہیں آیا تھا۔ پھر بھی وہ بولی۔ "سچ! اگر ایسا ہے فرید تو میں تمہارے قدموں کی دھول بن کر زندگی گزار دوں گی۔"

میں نے سوچا کہ کہیں کنول بھی اداکاری تو نہیں کر رہی؟ وہ چند مہینے پہلے اسٹیج کی ایک کامیاب اداکارہ رہی تھی' لیکن اسے کسی اداکاری کی ضرورت نہیں تھی۔ اس نے مجھے پانے کے لئے ایک دشوار گزار اور کٹھن سفر طے کیا تھا۔ مجھے اس کی محبت اور چاہت کا اندازہ تھا' لیکن شاید اس کی محبت ایک ڈھونگ بنی ہوئی تھی۔ وہ اور تبسم مل کر مجھے ایک نئے جال میں پھانس رہی تھی۔ ادھر میرا سازشی ذہن بڑی تیزی سے کچھ اور سوچ رہا تھا۔ میں کوئی ایسا قدم نہیں اٹھانا چاہتا تھا کہ جس سے کنول بدک جائے' بددل اور مایوس ہو جائے۔ ایک مرتبہ اسے میری فطرت کا تلخ تجربہ ہو چکا تھا۔ وہ شاید اسی دن سے بڑی محتاط

کرنے کے بعد مجھے طلاق دے کر نجات حاصل کر لو گے۔ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟"

میں اپنے دل کی چوری پکڑے جانے پر سناٹے میں آگیا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کنول یہ سوچ سکتی ہے۔ میں ہکا بکا ہو کر اسے دیکھتا رہ گیا۔ لیکن فوراً" ہی سنبھل گیا۔ میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "کنول! تم نے مجھے سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ کیا میں اس قدر ذلیل انسان ہوں کہ تم میرے میں ایسی غلط رائے قائم کر رہی ہو؟"

"کاش میرا اندازہ غلط ہو!" یکبارگی کنول کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

میں جیسے تڑپ کر بڑی بے تابی سے دیوانہ وار اس کی جانب بڑھا اور قریب پہنچ کر کہا۔ "کنول! کنول!" محبت اور جذبات میں ڈوبی ہوئی آواز بھر آنے لگی۔ کنول نے اپنا چہرہ ادھر ہٹایا۔ اس کی حیرت بھری آنکھیں میری آنکھوں میں جھانکنے لگیں۔ وہ ایک گہری عورت تھی۔ وہ دل کی اتھاہ گہرائیوں میں چھپی ہوئی باتیں پڑھ لیتی تھی۔ مجھے اس سے خوف آنے لگا تھا۔ "تمہاری سوچ اور اندازہ محض ایک مفروضے پر قائم ہے۔" میں نے کہا۔ "تمہاری محبت نے میرا دل جیت لیا ہے۔ شاید تم یقین نہیں کرو گی' لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ میں نے اپنے دل سے مہ جبیں کو نکال دیا ہے۔"

کنول کو جیسے میری بات کا یقین نہیں آیا تھا۔ پھر بھی وہ بولی۔ "سچ! اگر ایسا ہے فرید تو میں تمہارے قدموں کی دھول بن کر زندگی گزار دوں گی۔"

میں نے سوچا کہ کہیں کنول بھی اداکاری تو نہیں کر رہی؟ وہ چند مہینے پہلے اسٹیج کی ایک کامیاب اداکارہ رہی تھی' لیکن اسے کسی اداکاری کی ضرورت نہیں تھی۔ اس نے مجھے پانے کے لئے ایک دشوار گزار اور کٹھن سفر طے کیا تھا۔ مجھے اس کی محبت اور چاہت کا اندازہ تھا' لیکن شاید اس کی محبت ایک ڈھونگ بنی ہوئی تھی۔ وہ اور تبسم مل کر مجھے ایک نئے جال میں پھانس رہی تھی۔ ادھر میرا سازشی ذہن بڑی تیزی سے کچھ اور سوچ رہا تھا۔ میں کوئی ایسا قدم نہیں اٹھانا چاہتا تھا کہ جس سے کنول بدک جائے' بددل اور مایوس ہو جائے۔ ایک مرتبہ اسے میری فطرت کا تلخ تجربہ ہو چکا تھا۔ وہ شاید اسی دن سے بڑی محتاط اور چوکنا ہو گئی تھی۔ اسے مجھ پر اور میری باتوں پر بھروسہ اور اعتماد نہیں رہا تھا۔ میری زندگی میں اندھیرے پھیل گئے تھے اور میں حواس باختہ ہو گیا تھا لیکن یک لخت مجھے یہ احساس ہوا تھا کہ کنول ان اندھیروں میں میرے لئے امید کی کرن بن سکتی ہے۔ اگر میں

کنول کو آج یا کل طلاق دے دیتا ہوں تو میری مشکلات میں اضافہ ہو جاتا۔ کنول تو بساط کا ایک مہرہ تھی۔ میں اسے اپنی محبت میں پوری طرح جکڑ کے وہ بریف کیس دوبارہ حاصل کر سکتا تھا۔ اسی لئے کہ وہ محبت کی خاطر تبسم سے جا ٹکرائی تھی۔ وہ اسی محبت کی خاطر تبسم کے پاس سے بریف کیس لا کر میرے قدموں میں ڈال سکتی تھی۔ بریف کیس کے ملتے ہی میں اپنی ساری چیزیں تلف کر کے کنول کو طلاق دے سکتا تھا۔ اس طرح میرے راستے سے تمام کانٹے صاف ہو جاتے اور مہ جبیں سے شادی کرنے کے لئے مجھے کوئی دشواری نہ ہوتی اور میری راہ میں کوئی رکاوٹ بھی باقی نہ رہتی۔

کنول اور میں کتنی ہی دیر تک اسی عالم میں کھڑے رہے جیسے ایک دوسرے کے دل کی دھڑکنیں سن رہے ہوں۔ وہ یک لخت بولی۔ "فرید! نہ جانے کیوں یہاں گھٹن سی ہو رہی ہے۔ چلو یہاں سے کچھ دیر کے لئے باہر نکلتے ہیں۔ کھلی فضا میں چلتے ہیں۔ میرا دل اندر ہی اندر گھبرا رہا ہے۔"

میں مسکرا دیا۔ "یہ رات باہر گزار دو گی۔"

"نہ جانے کیوں مجھے وحشت سی ہو رہی ہے۔" اس نے مرتعش آواز میں کہا۔ "ایک دو گھنٹے باہر گزار کر واپس آ جائیں گے۔"

میں نے کنول کا چہرہ دیکھا۔ اس کے چہرے پر واقعی وحشت سی طاری ہو رہی تھی۔ وہ سراسیمہ نظر آ رہی تھی۔ میں نے اپنی دستی گھڑی میں وقت دیکھا۔ رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ مجھے تو قدم قدم پر محبت کا ثبوت دینا تھا۔ تبھی میں کنول کو اپنی محبت کا شکار بنا سکتا تھا۔ میں نے کہا۔ "آج سے میں تمہارا غلام ہوں۔ تم جو حکم دو گی وہ سر آنکھوں پر۔"

اس نے تڑپ کر میرے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ وہ بڑی جذباتی ہو رہی تھی۔ نہیں فرید! ایسا نہ "لہو" میں تمہاری کنیز ہوں۔"

میں کنول کو ڈرگ روڈ کے ایک اعلیٰ قسم کے ریستوران میں لے گیا۔ وہاں بڑی رونق تھی۔ رت جگا ہو رہا تھا۔ ہم دونوں نے اس ریستوران کے باہر لگی ہوئی میزوں میں ایک گوشہ منتخب کر کے بیٹھ گئے۔ ہم دونوں کے درمیان محبت بھری باتوں کا سلسلہ چل پڑا۔ جیسے ہم دونوں حجلہ عروسی میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں اسے اپنی بے پایاں محبت کا یقین دلاتا رہا۔ میری زبان سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ جیسے کنول کی روح کی گہرائیوں میں امرت بن کر

اتر تا جا رہا تھا۔ کنول کی آنکھوں میں جگنو جگمگاتے رہے۔ اس کے چہرے پر سرخی دمکتی رہی اور گداز ہونٹوں پر ایک دل آویز تبسم اترتا رہا۔ وہ مجھے ہمیشہ کے لئے پانے کے احساس' قربت اور باتوں کی مٹھاس سے مسرور ہوئی جا رہی تھی۔ میں نے اسے ایک عجیب سی سرشاری کی کیفیت میں ڈوبا پایا۔ محبت کے جذبے نے اس کے حسن و جمال میں چار چاند لگا دیئے تھے۔ وہ ایک معصوم اور دلکش عورت لگ رہی تھی' لیکن وہ میری ذات پر اپنی محبت کا سکہ نہیں جما سکی تھی۔ وہ کبھی میرے دل میں مہ جبیں کی جگہ نہیں لے سکتی تھی۔ اس لیے میرے دل میں اس کے لئے محبت نہیں بلکہ نفرت اپنی جڑیں پھیلا رہی تھی۔ مجھے اس کے مکر و فریب کا احساس ہو چکا تھا کہ وہ عملی زندگی کے اسٹیج پر اپنی بھرپور اداکاری کے جوہر دکھا رہی ہے' مجھے اپنی آخری سانسوں تک طابع اور زر خرید غلام کی طرح رکھنا چاہتی ہے' لیکن میں نے فیصلہ کر لیا کہ اس کے طلسم سے رہائی پا کر اسے ایسا عبرت ناک سبق دوں گا کہ وہ زندگی بھر یاد رکھے گی۔

کنول کسی ترو تازہ شگفتہ پھول کی طرح کھلی اور مہکی جا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کی زبان مجھے اپنا منصوبہ سمجھانے لگی تو میری رگوں میں بجلی کی سی لہریں سنسانے لگیں۔ میں نے گھڑی میں وقت دیکھا' رات کا ایک بج رہا تھا۔ "چلنا چاہئے!" میں نے اس کی جانب تیکھی نظروں سے دیکھا تو اس کی مخمور آنکھوں کی جھپکتی پلکوں نے اپنی اوٹ میں لے لیا۔

"چلئے!" اس کے رخساروں پر حیا کی سرخی دمک اٹھی اور وہ لجا سی گئی۔ اس کا تابندہ حسن اور نکھر اٹھا تھا۔ جس وقت ہم دونوں فلیٹ پر پہنچے اور میں اپنی جیب سے چابی نکال رہا تھا تو کنول نے متعجب ہو کر کہا۔ "فرید! دروازہ کھلا ہوا ہے۔"

میں نے چونک کر دروازے کی جانب دیکھا تو دروازہ کھلا ہوا سا لگا۔ میں نے آہستگی سے اسے اندر کی طرف دھکیلا تو وہ پورا کھل گیا۔ میں نے حیرت سے کنول کی طرف دیکھا' لیکن اس کا چہرہ سپاٹ تھا۔ وہ اندر داخل ہونے لگی تو میں نے اس کا بازو پکڑ لیا۔ کنول نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ سوالیہ تھا۔ میں نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔ "شاید اندر کوئی ہو' چور یا ڈاکو!"

فلیٹ کے اندر تینوں کمروں اور ٹی وی لاؤنج میں بتیاں جل رہی تھیں' ہم دونوں چوکنا ہو کر بے آواز قدموں سے اندر داخل ہوئے۔ اندر کوئی چور تو نہیں تھا البتہ جو بھی

یہاں آیا تھا وہ تنہا نہیں آیا تھا بلکہ اپنے ساتھ دو تین ساتھیوں کو ضرور لایا تھا۔ میرے فلیٹ کی ہر چیز بے ترتیب ہو رہی تھی اور اسے بری طرح توڑ پھوڑ دیا گیا تھا' صوفہ' اس کے کشن' پلنگ' بستر اور چادر تک پھاڑ دی گئی تھی۔ الماری کے پٹ ٹوٹے ہوئے تھے۔ جیسے کسی چیز کی تلاش میں یہ ساری توڑ پھوڑ کی گئی ہو۔ میرے کپڑے' کنول کی قیمتی ساڑھیاں' اس کا پرس' رقم اور سارا سامان بکھرا پڑا تھا۔ جو چور یا بدمعاش آئے تھے' وہ کس وجہ سے آئے' میری سمجھ میں نہیں آسکا کہ انہوں نے رقم اور کسی چیز کو ہاتھ تک نہیں لگایا تھا۔ کنول اپنا سر پکڑ کے پلنگ پر بیٹھ گئی۔ میں نے ایک ایک کمرہ اور غسل خانہ جھانک کر جب یہ اطمینان کر لیا کہ فلیٹ میں کوئی چھپا ہوا نہیں ہے تو غصے سے کھولتا ہوا نیچے آیا تاکہ چوکیدار کی خبر لوں۔ میرے فلیٹ کی تباہی و بربادی کا وہی ذمے دار بھی تھا۔ یہ سب کچھ اس کی غفلت کا نتیجہ تھا۔ چوکیدار اپنے اس کمرے میں نظر نہیں آیا جہاں پانی چڑھانے کی مشین نصب تھی۔ کمرے میں اس کی ایک چارپائی پڑی تھی جس پر وہ اکثر آرام کرتا رہتا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ کمبخت خود بھی ہنی مون منانے کے چکر میں اپنی بیوی کے ساتھ جو گھر گیا ہے تو لوٹا نہیں ہے۔ شاید وہ گھر ہی پر رک گیا ہو۔ میں اس کے کمرے سے نکل کر زینے کی طرف جا رہا تھا کہ میرے کانوں میں کسی کے کراہنے کی آواز سنائی دی۔ معاً مجھے یہ خیال آیا کہ میرے کانوں کو دھوکا ہوا ہے۔ پھر بھی میں ایک لمحے کے لئے ٹھٹک کر رک گیا۔ کچھ دیر میں انتظار کرتا رہا مگر کوئی آواز سنائی نہیں دی۔ میں نے زینے پر قدم رکھا ہی تھا کہ میرے کان میں کراہنے کی آواز گونجی۔ وہ مسلسل کراہنے لگا تھا۔ میں اپنی جگہ سے اچھل پڑا۔ یہ چوکیدار کی آواز تھی۔ میرے اندر خوف کی ہلکی سی لہر اٹھی۔ میں سمجھ گیا کہ بدمعاشوں نے اسے مار پیٹ کر پھینک دیا ہے۔ میں تیزی سے آواز کی سمت لپکا۔ عمارت کے ساتھ والے میدان میں جو جنگل اور جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں' چوکیدار وہاں زخموں سے چور پڑا تھا۔

میں نے چوکیدار کو بہ دقت تمام سہارا دے کر کھڑا کیا۔ اندھیرے کی وجہ سے مجھے کوئی اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ ان بدمعاشوں نے اس کے ساتھ کس قسم کا سلوک کیا ہے' لیکن اس کی حالت بتا رہی تھی کہ اس کے ساتھ کوئی رعایت نہیں برتی گئی ہے۔ مجھے اسے اس کے کمرے میں لے جا کر چارپائی پر لٹانے تک پندرہ بیس منٹ لگ گئے' اس کمرے

میں روشنی ہو رہی تھی۔ میں نے روشنی میں سر تا پا جائزہ لیا۔ اس کی پیشانی اور جبڑوں اور ہونٹوں پر گہرے زخم لگے ہوئے تھے اور ان میں سے خون رس کر جم چکا تھا۔ اس کی دونوں آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے اور سوجن آ گئی تھی۔ کنول مجھے اتنی دیر غائب پا کر سراسیمگی کے عالم میں دوڑتی ہوئی نیچے چلی آئی تھی۔ وہ چوکیدار کی حالت دیکھ کر چونک گئی اور الٹے قدموں لوٹ گئی۔ چوکیدار درد کے باعث کراہ اور تڑپ رہا تھا۔ میں نے اس وقت تفصیل پوچھنا مناسب نہیں سمجھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس کے لئے اس وقت طبی امداد کہاں سے حاصل کی جا سکتی ہے؟ میں سکوٹر پر اسے ہسپتال لے کر بھی نہیں جا سکتا تھا۔ اس وقت ٹیکسی کا ملنا بھی دشوار تھا۔ ٹیکسی شاید مل بھی جاتی' لیکن ہسپتال والے پولیس والوں کو مطلع کر دیتے' میں پولیس کے چکر میں پڑنا نہیں چاہتا تھا۔ سوچتے سوچتے مجھے خیال آیا کہ میں کسی قریبی کیمسٹ کی دکان سے مرہم اور درد کی دوا لے آؤں۔ اسے فرسٹ ایڈ دے کر صبح کسی ڈاکٹر کو دکھا دوں گا۔

میں فوراً" ہی سکوٹر لے کر کیمسٹ کی دکان کی طرف چل پڑا۔ ایک دکان سے واقف تھا جو رات دن کھلی رہتی تھی۔ میں نے کیمسٹ کو صورت حال بتائی تو اس نے مجھے مرہم کی ٹیوب اور چند گولیاں دے دیں۔ روئی کا ایک بنڈل اور زخم صاف کرنے کے لئے ایک دوا دی۔ جب میں چوکیدار کے کمرے میں پہنچا تو بھونچکا ہو کے رہ گیا۔ کنول چوکیدار پر جھکی ہوئی گیلے کپڑے سے اس کے زخموں سے خون صاف کر رہی تھی۔ فرش پر ایک برتن رکھا ہوا تھا۔ اس میں گرم پانی تھا۔ میں کنول کے اس انسانی جذبے سے بڑا متاثر ہوا۔ کنول کے ہاتھوں کے لمس نے چوکیدار کی آدھی تکلیف دور کر دی تھی۔ وہ خاموش لیٹا ممنون نگاہوں سے کنول کو دیکھتا اور دعائیں دیتا جا رہا تھا۔ کنول نے میرے ہاتھ سے ٹیوب لے کر مرہم' زخموں پر لگا دیا اور فلیٹ سے ایک گلاس پانی لے آئی۔ پھر اسے گولیاں کھلا دیں۔ ان گولیوں میں دو گولیاں مسکن بھی تھیں۔

میں نے چوکیدار کی نارمل حالت دیکھ کر اس سے بدمعاشوں کے بارے میں پوچھا تو اس نے اتنا کہا۔ "میں اندھیرے میں ان کی شکلیں ٹھیک سے دیکھ نہیں سکا اور نہ ہی مجھے کوئی اندازہ ہے کہ وہ تعداد میں کتنے تھے۔ ان لوگوں نے مل کر مجھے اچانک دبوچ لیا اور جھاڑیوں کے پاس لے جا کر میری ایسی زبردست پٹائی کی کہ میں بے ہوش ہو گیا۔ میں باوجود

کوشش کر کے اس لئے بھی نہیں چیخ سکا کہ میرے منہ پر کپڑا باندھ دیا گیا تھا۔"

مسکن گولیوں نے جلد ہی اپنا اثر دکھانا شروع کیا تو اسے نیند آنے لگی۔ کنول نے سامان سمیٹا اور میرے ساتھ ساتھ اوپر چلی آئی۔ میں حیران و پریشان تھا کہ آخر یہ کون بدمعاش تھے اور کیا لینے آئے تھے؟ انہیں کس چیز کی تلاش تھی؟ معاً" مجھے تبسم کا خیال آیا۔ شاید اس نے کنول سے شادی کرنے کی خوشی میں مجھے ایک تحفہ ان بدمعاشوں کی صورت میں بھیجا تھا۔ اگر میں ان بدمعاشوں کے ہاتھ لگ جاتا تو چوکیدار سے کہیں زیادہ میری بری درگت بنا دی جاتی۔ کنول اور تبسم کے منصوبے کا یہ ایک حصہ ہو گا کہ مجھے پہلا سبق دیا جائے' لیکن کنول کو شاید مجھ پر رحم آگیا تھا۔ وہ اسی لئے گھٹن کا بہانہ کر کے مجھے اپنے ساتھ ہوٹل لے گئی تھی۔ میں نے اپنے شک و شبہے اور خیال کا اظہار کنول سے نہیں کیا بلکہ انجان بن کر اپنی پریشانی کا اظہار کرتا رہا۔ کنول نے بڑی تیزی سے اور مہارت سے کمرہ کسی حد تک درست کر دیا۔ اس کے ہاتھوں میں ایک سگھڑ عورت کا سلیقہ بول رہا تھا۔ کوئی شخص یہ باور کرنے کے لئے تیار نہ ہوتا کہ کنول اندر سے ایک مکار عورت ہے۔ اس کا باطن ریاکاری سے پر ہے۔

صبح میں بڑی دیر تک سوتا رہا۔ کنول کا چہرہ نکھری ہوئی صبح کی طرح دمک رہا تھا۔ وہ نہا کر آئی تھی۔ اس کے جسم اور بالوں سے سوندھی سوندھی خوشبو کی مہک میرے وجود میں اترتی جا رہی تھی۔ وہ بہت خوش تھی' اس قدر خوش تھی کہ میں کیا کوئی بھی شخص اس کی خوشیوں کا اندازہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے مجھ سے شادی کر کے اپنی دانست میں گویا محبت کی معراج پا لی تھی' لیکن میں اندر سے خوش نہیں تھا۔ میں خوش ہو بھی کیسے سکتا تھا! میں نے محض بربنائے مجبوری اور اپنے منصوبے کی کامیابی کے لئے اس سے شادی رچائی تھی۔ مجھے مجبوراً" بے پناہ خوشیوں کا اظہار کرنا پڑ رہا تھا۔ میں مسرتوں کا ڈھونگ رچا کر اسے شیشے میں اتارنا چاہتا تھا۔ محبت اس کی کمزوری تھی۔

کنول نے ناشتے کے دوران یہ تجویز پیش کی کہ تین راتیں کسی فائیو سٹار ہوٹل میں گزارنا چاہئے۔ وہ چاہتی تھی کہ ہم دونوں سوات چل کر ہنی مون منائیں۔ میں دفتر سے بھی چھٹیاں لے چکا تھا۔ مزید چھٹیاں ملنا مشکل تھا۔ گھر والے بھی شک کرتے۔ میں نے یہی بہتر سمجھا کہ کسی فائیو سٹار ہوٹل میں ہنی مون منا لیا جائے۔ وہاں پرسکون ماحول ہو گا۔ کسی

کا کوئی دخل نہیں ہو گا۔ میں اس فضا میں کنول کو آہستہ آہستہ شیشے میں اتار لوں گا۔ میں نے اس کی تجویز کی پوری حمایت کی۔ ناشتے کے بعد اس نے چلنے کی تیاری شروع کر دی۔ اپنی اٹیچی میں میرے کپڑے رکھنے لگی تو مجھے چوکیدار کا خیال آیا۔ میں نے اس کے کمرے میں جا کر دیکھا تو وہ وہاں نہیں تھا۔ میں سکوٹر پر اس کے گھر چلا گیا جو ایک فرلانگ کے فاصلے پر تھا۔ چوکیدار کی بیوی نے بتایا کہ وہ سو رہا ہے۔ میں نے اسے جگانا مناسب نہیں سمجھا۔ میں نے اس کی بیوی کو ایک سو روپے کا نوٹ دیا۔ اسے سمجھایا اور تسلی دی کہ فکر کی کوئی بات نہیں۔ بدمعاشوں نے غلط فہمی میں اس کی پٹائی کر دی تھی۔

میں اور کنول ایک اچھے ہوٹل میں منتقل ہو گئے۔ وہ اس ہوٹل کا کمرہ دیکھ کر مسحور ہو گئی۔ میری بھی ایسی ہی کیفیت تھی۔ اس کمرے کے پرسکون ماحول اور جنت جیسی فضا میں تین دن پلک جھپکتے گزر گئے تو ہم دونوں نے اپنا قیام تین دن اور بڑھا دیا۔ میں دفتر سے دو بجے نکل کر ہوٹل آ جاتا۔ رات ایک بجے تک کنول کے ساتھ رہتا اور اپنے گھر چلا جاتا۔ میں اس کمرے اور راتوں کے سحر میں ایسا کھویا رہا کہ کنول سے بریف کیس کے موضوع پر دانستہ بات کبھی نہیں کی۔ پانچ روز تک میرا یہی معمول رہا بلکہ آخری دن تو میں نے دفتر بھی گول کر دیا۔

چھٹے روز ہم دونوں اس ہوٹل سے دوبارہ اپنے فلیٹ میں منتقل ہوئے تو ایسا لگا کہ ہمیں جنت سے نکال کر کسی لق ودق صحرا میں پھینک دیا گیا ہے۔ اس روز میں نے رات فلیٹ میں کنول کی زلفوں تلے گزاری۔ دوسرے دن میں دفتر سے تین بجے نکل کر فلیٹ پر پہنچا تو چوکیدار نے فلیٹ کی چابی اور ایک خط میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ میں نے اسے حیرت اور سوالیہ نظروں سے دیکھا تو اس نے کہا۔ "بیگم صاحبہ نے دیا ہے؟"

"کیوں؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"ہمیں کیا معلوم صاحب!" اس نے جواب دیا۔ "بیگم صاحبہ نے ہم سے ایک ٹیکسی منگوائی۔ یہ لفافہ' چابی اور ایک سو روپے بخشش میں دیئے اور کہا کہ یہ خط صاحب کو دے دینا۔"

"وہ کچھ اور کہہ کر نہیں گئیں؟"

"نہیں صاحب۔" چوکیدار نے کہا۔ "لیکن وہ بہت پریشان تھیں' بہت خوف زدہ

تھیں' گھبرا رہی تھیں۔"

میرے لئے یہ انکشاف بالکل نیا اور حیرت انگیز تھا۔ میں اپنی جگہ سے اچھل پڑا۔ میں نے چوکیدار سے پوچھا۔ "تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"ہاں صاحب!" اس نے اثبات میں اپنی گردن ہلائی۔ "میں ایک اور بات اب آپ سے کہہ سکتا ہوں؟"

"کون سی بات؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"اس روز والی بات صاحب!" اس نے اپنے اردگرد یوں دیکھا جیسے وہ یہ دیکھ کر اپنی تسلی کرنا چاہتا ہو کہ کوئی اس کی بات سن تو نہیں رہا ہے۔ "اس رات بدمعاش میری پٹائی کر گئے تھے نا! آپ دوا لینے چلے گئے تھے۔ بیگم صاحبہ نے میری زبانی سارا واقعہ سن کر میری جیب میں دو سو روپے رکھ دیئے اور کہا کہ صاحب کو بدمعاش لوگ کے بارے میں تفصیل سے مت بتانا' بات گول کر جانا۔"

"کیوں؟" میرا دماغ چکرا سا گیا۔

اس نے اپنے دونوں شانے اچکا کر کہا۔ "ہم کیا جانتا ہے صاحب!"

مجھے اس لمحے ایسا لگا کہ میری نظروں کے سامنے جو پردہ پڑا ہوا تھا یکایک ہٹ گیا ہے۔ کنول نے اس روز چوکیدار کو زخمی حالت میں دیکھ کر اس کے ساتھ جو انسانیت آمیز سلوک اور جس ہمدردی کا برتاؤ کیا تھا۔ اس نے میرے دل میں جگہ بنا لی تھی اور میں اس کے جذبے سے بڑا متاثر ہوا تھا۔ آج اس کے خلوص کا راز کھل گیا تھا۔ میرے ذہن پر مسلسل ہتھوڑے بجنے لگے۔ میرا شک یقین میں بدل گیا کہ کنول اور تبسم نے مل کر میرے خلاف ایک گھناؤنا منصوبہ بنایا ہے۔ کنول نے اپنا راز چھپانے کی خاطر چوکیدار کی مٹھی گرم کر دی تھی۔ اگر چوکیدار نے ان بدمعاشوں کے بارے میں تفصیل سے بتا دیتا تو میں اس کے منصوبے سے آگاہ ہو جاتا۔ میں چوکیدار کو اپنے ساتھ فلیٹ میں لے گیا۔

میں نے اس سے اس واقعے کے بارے میں دریافت کیا تو وہ کہنے لگا۔ "صاحب جی! جس وقت میں اپنے گھر سے واپس آ کر گیٹ کے پاس کھڑا ہوا تھا۔ ایک کار ہمارے سامنے آ کر رکا۔ اس کار میں ایک خوبصورت' صحت مند اور مردوں جیسا لمبا چوڑا عورت اپنے ساتھ چار مسلح بدمعاشوں کو لے کر آیا ہوا تھا۔ اس عورت نے کار سے اتر کر ہم سے

آپ لوگوں کے بارے میں پوچھا۔ ہم نے انہیں بتایا کہ ہمارا صاحب کا آج شادی ہوا ہے۔ وہ سو رہا ہے۔ عورت نے ہماری بات نہیں مانا۔ وہ سب لوگ ہم کو اوپر لے گیا۔ پہلے تو ان لوگوں نے گھنٹی بجایا۔ دروازہ نہیں کھلا تو اسے کئی مرتبہ کھٹکھٹایا پھر بھی دروازہ نہیں کھلا تو اس عورت نے اپنے ایک آدمی کو اشارہ کیا۔ اس آدمی نے اپنی جیب سے ایک تار باہر نکالا۔ وہ تالا کھولنے جا رہا تھا ہم نے اسے منع کیا اور روکا تو ایک بدمعاش نے میرے سینے پر چاقو کا نوک رکھ دیا۔ ہم کو جان سے مار دینے کا دھمکی دے کر چپ کرایا۔ اس بدمعاش نے تار سے تالا کھول دیا۔ وہ ہم کو بھی اندر گھسیٹ کر لے گیا۔ ان لوگوں نے ایک ایک کمرے کی تلاشی لے کر آپ لوگوں کو تلاش کیا۔ ہم کو بھی حیرت ہوا کہ آپ لوگ کدھر غائب ہو گیا۔ اس عورت کو بہت غصہ آیا۔ وہ ہم سے بولا۔ کنول سے کہنا کہ وہ ہم سے بچ کر کہاں جائے گی۔ اس نے میرے ساتھ دھوکہ کیا ہے۔ میں اسے اپنے ساتھ قبر میں لے جاؤں گی۔ میرا نام تبسم ہے۔ ان بدمعاشوں نے پوچھا کہ آپ دونوں کہاں گئے ہیں۔ ہم بولا۔ ہم کو کیا معلوم؟ ہم کو خود حیرت ہے' ہمارا ان لوگوں سے تکرار بڑھ گیا تو تینوں بدمعاشوں نے مل کر ہم اکیلے کو پکڑ لیا۔ ایک نے ہمارے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا۔ ہمارا وہ ٹھکائی لگایا کہ ہم بے ہوش ہو گیا۔ آنکھ کھلا تو ہم جھاڑیوں میں پڑا تھا۔"

میں چوکیدار کی زبانی تفصیل سن کر حیران ہو گیا۔ میرا ذہن بڑی تیزی سے اس واقعے کے پس منظر کے بارے میں سوچنے لگا۔ ایک بات میرے ذہن میں بیٹھتی جا رہی تھی کہ تبسم نے مسرت جہاں کے موت کی خبر پا کر کنول سے کیا ہوا معاہدہ توڑ دیا ہو گا' اس نے مشترکہ منصوبے پر عمل کرنے کی بجائے یہ سوچا ہو گا کہ مجھے دوبارہ حاصل کر لیا جائے۔ مسرت جہاں کی موت سے تبسم کے حوصلے بلند ہو گئے ہوں گے۔ وہ اسی لئے کنول سے اپنا بدلا لینے آئی ہو گی جس طرح کنول نے مجھے تبسم سے چھین لیا تھا۔ اسی طرح وہ بھی مجھے کنول سے چھین لینا چاہتی تھی۔ کنول نے شاید اس کے ارادوں کو بھانپ لیا تھا۔ جبھی وہ مجھے فلیٹ سے ہوٹل لے کر منتقل ہو گئی تھی اور چھ دن تک اس کمرے یا ہوٹل کی حدود سے باہر نہیں نکلی تھی۔

٭

میں نے چوکیدار کو رخصت کر دیا۔ پھر کرسی پر بیٹھ کر لفافہ چاک کیا۔ کنول نے لکھا تھا۔ "میرے سرتاج! تم مجھے اچانک اور غیر متوقع طور پر غائب پا کر حیران و پریشان ہو جاؤ

گے۔ میں یہ قدم اٹھانے پر اس لئے مجبور ہوں کہ میری بد نصیبی کے دن ابھی دور نہیں ہوئے۔ تبسم کو نہ جانے کس طرح یہ معلوم ہو چکا ہے کہ مسرت جہاں مر گئی ہے۔ اسے جیسے ہی مسرت جہاں کے مرنے کی خبر ملی تھی وہ فلیٹ پر پہنچی تھی۔ اگر میں تمہیں اس رات فلیٹ سے کسی بہانے لے کر نہ جاتی تو یقین جانو تبسم میری زندگی کا چراغ گل کر دیتی۔ وہ میری موت کی متمنی ہے اس لئے میں روپوش ہو رہی ہوں' لیکن میں بھی تبسم کو زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ میں اسے جب تک راستے سے نہیں ہٹا دوں گی' روپوش رہوں گی۔ تمہاری طرف سے بھی میرے دل کو شدید دھچکا لگا ہے۔ ہوٹل میں جو ہم دونوں نے آخری رات گزاری' اس رات میں نے محض تمہیں آزمانے کی خاطر اور اپنے دل کی تسلی کے لئے دودھ میں نشے کی دوا ملا کر پلا دی تھی۔ تم نشے کی حالت میں اپنے دل میں چھپی ہوئی نفرتوں کا اظہار کرنے لگے تھے۔ تمہارا گھناؤنا چہرہ اور سیاہ باطن میرے سامنے آ گیا۔ تم بک رہے تھے کہ کنول! جب مجھے بریف کیس مل جائے گا۔ اس وقت میں تمہیں بتاؤں گا کہ میں تم سے کتنی نفرت کرتا ہوں' مجھے تم سے کبھی محبت نہیں رہی۔ میں تمہیں طلاق دے دوں گا اور آزاد ہو جاؤ گی پھر مہ جبیں سے شادی کروں گا۔ تم قہقہے لگانے لگے۔ میں

سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم محبت کے نام پر عورت کو دھوکا دو گے۔ میں نے تمہاری یہ آواز ٹیپ کر لی ہے۔ تمہیں یہ کیسٹ کسی روز موصول ہو جائے گی۔ کاش تم یہ اندازہ کر سکتے کہ تمہاری یہ باتیں سن کر میرے دل پر کیسی قیامت گزر گئی۔ تم میرے دکھ اور غم کا احساس نہیں کر سکتے۔ لہٰذا میں ایک بار پھر تمہاری نظروں سے دور جا رہی ہوں۔ میں اس روز تمہیں اپنی شکل دکھاؤں گی جب تبسم کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنی راہ سے ہٹا دوں گی اور تمہارے بچے کی ماں بن جاؤں گی۔ تمہاری نشانی تمہارے قدموں میں ڈال دوں گی۔

صرف تمہاری جو ہمیشہ تمہاری رہے گی

کنول

کنول کا خط میرے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گر پڑا۔ میں کتنی ہی دیر تک سکتے کے عالم میں بیٹھا رہا۔ میرے دماغ میں آندھیاں چلنے لگیں۔ میں تبسم کے جال سے نکل کر ایک بار پھر اس کے جال میں پھنس گیا تھا۔ کنول کی ذرا سی حماقت کی سزا مجھے مل رہی تھی۔ اگر وہ پہلے ہی میرے خلاف بلیک میلنگ کا مواد ضائع کر دیتی تو آج یہ نوبت نہیں

آئی۔ تبسم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھی۔ میں تبسم سے ٹکر لے بھی نہیں سکتا تھا۔ اس لمحے مجھ پر کنول نہیں بلکہ تبسم ایک خوف بن کر سوار تھی۔ میرے اعصاب اذیت اور کرب میں مبتلا ہو گئے تھے۔ اب کوئی طاقت مجھے تبسم کے چنگل سے نجات نہیں دلا سکتی تھی۔ وہ پہلے سے کہیں زیادہ چوکنا اور ہوشیار ہو کر اس بریف کیس کو ایسی جگہ محفوظ کر دیتی کہ میرے اور کنول کے فرشتوں کو ہوا تک نہیں لگ سکتی تھی۔ اس بریف کیس کا حاصل کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں تھا۔ میں خود کو اتنی بڑی دنیا میں تنہا محسوس کر رہا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ میں بہت تھک گیا ہوں' بوڑھا اور کمزور ہوتا چلا جا رہا ہوں۔ میں کرسی پر نڈھال سا پڑا رہا۔ یک لخت مجھے یاسمین شہریار کا خیال وہ غریب بھی دوبارہ تبسم کے ستم کا نشانہ بننے والی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ میری ہمدرد بن سکتی ہے۔ ہم دونوں کے مل کر کوئی نئی راہ ڈھونڈنا ہو گی۔ میں اسے اس طوفان کی خبر دینے کے لئے اس کے کلینک جا پہنچا۔ معلوم ہوا کہ وہ گھر پر موجود ہے۔ میں اس کے گھر جا پہنچا۔ وہ میرا ستا ہوا چہرہ دیکھ کر سراسیمہ ہو گئی شاید اس نے اندازہ کر لیا تھا کہ میں کوئی ایسی بری خبر لے کر آیا ہوں جو اس سے متعلق ہو گی۔ اس نے مرتعش آواز میں پوچھا۔ "فرید! خیریت تو ہے؟"

میں نے اسے من و عن اپنی کہانی سنا دی۔ اس کے چہرے کا رنگ اڑتا گیا۔ میں نے اپنی کہانی ختم کی تو اس کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

"یہ تو بہت برا ہوا فرید!؟" اس کی آواز جیسے گہرے کنوئیں کی تہہ سے آ رہی تھی۔ "تبسم ایک عورت نہیں بلکہ ایک درندہ ہے۔ وہ ہماری زندگی اجیرن کر کے رکھ دے گی۔ صرف ہم دونوں ہی اس کا نشانہ بن رہے ہیں۔" اس کے کمرے میں آسیب زدہ سناٹا چھا گیا۔ وہ کسی بے جان لاش کی طرح نظر آ رہی تھی۔ اس نے ہولناک سکوت کو توڑتے ہوئے پوچھا۔

"اب کیا ہو گا؟ ہم کس طرح اس خبیث عورت سے نجات پا سکتے ہیں؟"

میں نے گہرا سانس لے کر جواب دیا۔ "میری سمجھ میں خود نہیں آ رہا ہے۔"

"میں پاگل ہو جاؤں گی۔" اس کی آواز بھرا گئی۔

"پاگل ہو جانا زیادہ بہتر ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"میں آج رات کی فلائٹ سے جمیل کے ساتھ لندن جا رہی ہوں۔" یاسمین شہریار نے سرگوشی کے انداز میں دبی ہوئی آواز میں کہا۔ "ہم دونوں وہاں جا کر شادی کر لیں گے۔ شادی کے بعد ہنی مون منانے کے لئے کسی خوبصورت ملک چلے جائیں گے۔" اس کی کٹورا سی آنکھوں میں گھٹائیں اٹھ رہی تھیں۔ "تم نے مجھے ایسی روح فرسا خبر سنائی کہ اس نے میرے جسم کو نچوڑ لیا ہے۔"

"تم اپنی روانگی اور شادی کا پروگرام منسوخ کر دو؟"

"کیوں؟"

"اس لئے کہ ہمیں سب سے پہلے اس ناگن کا سر کچلنا ہو گا۔" میں نے کہا۔ "اگر ہم نے اسے اپنے راستے سے نہ ہٹایا تو ہماری زندگی اجیرن ہو کر رہ جائے گی۔"

"ہم تو اس کا بال تک بیکا نہیں کر سکتے ہیں۔" یاسمین شہریار نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔ "وہ پہلے سے کہیں زیادہ ہوشیار ہو گئی ہو گی اور اس نے بریف کیس ایسی جگہ چھپا کر رکھ دیا ہو گا کہ سوائے اس کے کسی اور کو ہوا نہ لگ سکے۔" اس نے توقف کر کے گہرا سانس لیتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں۔ چند لمحے تک سوچتی رہی۔ اس نے اپنی آنکھیں کھولیں تو وہ کسی خیال سے چمک اٹھی تھی۔ "میں اپنا پروگرام ملتوی نہیں کر سکتی ہوں اس لئے کہ تمام انتظامات مکمل ہو چکے ہیں۔ میں کوئی دو ماہ بعد واپس آؤں گی۔ اس وقت میں تبسم کو راستے سے ہٹانے کے لئے تمہارا پورا پورا ساتھ دے سکوں گی۔ کیونکہ جمیل ہمارے ساتھ ہو گا۔ اس ڈائن کے مقابلے میں دو سے تین بہتر رہیں گے۔ کیوں؟ تمہارے نزدیک میرا خیال کیسا ہے؟" اس نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"لیکن تبسم اس وقت تک اپنی جڑیں اور مضبوط کر چکی ہو گی۔"

"جلد بازی کام بگاڑ سکتی ہے۔"

میں نے محسوس کیا کہ یاسمین شہریار بہت خوف زدہ ہے۔ وہ دوبارہ تبسم کے شکنجے میں کس جانے کے باعث ہراساں ہو گئی تھی۔ وہ اسی لئے اپنی روانگی کا پروگرام منسوخ کرنے پر تیار نہیں ہو رہی تھی۔ میں اس کے پاس سے نا امید اور مایوس ہو کر چلا آیا۔ یاسمین شہریار کو اس قدر فکرمند ہونے اور گھبرانے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ وہ تبسم کے مطالبات کئی سال سے پورے کرتی چلی آئی تھی اور اب بھی کر سکتی تھی۔ اس بات کا

امکان بھی تھا کہ وہ اپنی تمام تر جائیداد اور کاروبار فروخت کر کے یورپ میں سکونت اختیار کر لے۔ شاید اس نے اپنے آپ کو کنول کے پھندے سے بچانے کے لئے مری سے واپسی پر فوراً ہی کوئی تدبیر سوچ لی ہو گی۔ اسے شاید کنول سے بھی خوف آیا ہو گا کہ کنول بھی اسے بلیک میل کر سکتی ہے۔

میں ایک ہفتے تک روپوش ہو کر تبسم کے خلاف کوئی منصوبہ تیار کرنا چاہتا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میں دوبارہ تبسم کے ہاتھ لگ جاؤں اور وہ مجھ سے شادی کر لے۔ اس کے نزدیک اچھائی برائی میں کبھی تمیز نہیں رہی تھی۔ میں تبسم کے فلیٹ میں اس کی غیر موجودگی مین جانا چاہتا تھا۔ اس کے فلیٹ کی چابی میرے پاس موجود تھی۔ اس کے فلیٹ کی تلاشی میں شاید میرے ہاتھ وہ بریف کیس لگ جاتا۔ ایک کوشش کر کے دیکھنے میں کوئی حرج بھی نہیں تھا' لیکن تبسم کے فلیٹ کے اندر داخل ہونا خطرہ مول لینے کے مترادف تھا۔ اب اس کے سوا کوئی اور چارہ نہیں رہا تھا۔

میں دل گرفتہ اور غم زدہ سا گھر آیا تو کسی نے میری اس حالت کی جانب توجہ نہیں دی۔ میرے گھر میں سفر پر جانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ امی' بھائی اور بہنیں ایک ہفتے کے لئے حیدر آباد ایک قریبی رشتے دار کے ہاں جا رہی تھیں جن کے ہاں دو شادیاں ہو رہی تھیں۔ یہ اطلاع میرے لئے خوش کن تھی۔ یہ ایک اتفاق تھا جس نے میری ایک مشکل حل کر دی تھی کیونکہ میں اب گھر والوں سے کوئی بہانہ کئے بغیر ایک ہفتے تک آسانی سے روپوش رہ کر اپنی مہم کو تکمیل تک پہنچا سکتا تھا۔

دوسرے دن صبح گھر والے ایک ویگن سے حیدر آباد چلے گئے۔ میں صبح تقریباً" دس بجے .ؔ جانے اور اپنے منصوبے پر آغاز کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ اطلاعی گھنٹی بجی۔ میں نے دروازہ کھولا تو فخرو بھائی حد درجہ پریشان اور غم زدہ دکھائی دیئے۔ میں انہیں غیر متوقع طور پر اپنے گھر پر پا کر اور غم زدہ دیکھ کر گھبرا گیا۔ میں نے انہیں ملاقاتی کمرے میں لا کر بٹھایا اور پوچھا۔ "خیریت تو ہے فخرو بھائی؟"

"کاش! خیریت ہی ہوتی۔" فخرو بھائی نے ایک سرد آہ بھری۔ "تم نے آج کا اخبار دیکھا ہے؟"

"ہاں!"

"اس میں ریل گاڑی کے حادثے کی خبر پڑھی تھی؟"

مجھے بات کی تہہ تک پہنچنے میں دیر نہیں لگی۔ میں نے چونک کر پوچھا۔ "کیا اس گاڑی میں آپ کا کوئی قریبی رشتے دار بھی موجود تھا؟"

"وہ رشتے دار سے بھی کہیں بڑھ کے مجھے عزیز تھا۔" فخرو بھائی کی آواز بھرانے لگی۔

"اس گاڑی میں تمہاری بیوی بھی سفر کر رہی تھی!"

"میری بیوی؟ کون' کنول؟" میں اپنی جگہ سے اچھل پڑا۔

"ہاں ہاں! تمہاری بدنصیب بیوی کنول!" فخرو بھائی نے آنکھیں بند کر کے سر ہلایا۔

"میں نے ہی تو کل اسے اس گاڑی کا ٹکٹ دلا کر اس میں سوار کرایا تھا۔"

"آپ نے؟" میرا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ "کیوں؟ آپ نے ایسا کیوں کیا؟"

"وہ کل میرے پاس آئی تو دل گرفتہ اور اس قدر دکھی ہو رہی تھی کہ مجھ سے اس کی حالت دیکھی نہیں گئی۔" فخرو بھائی بڑے دھیمے اور افسردہ لہجے میں کہنے لگے۔ "اس نے مجھ سے کہا تھا کہ فخرو بھائی میری دنیا تاریک ہو گئی ہے۔اس نے میرے دریافت کرنے پر تمہارے بھیانک ارادوں کے بارے میں بتایا اور کہا کہ میں ایک عورت ہوں۔ میں نے یہ شادی اس لئے نہیں کی تھی کہ یہ کوئی کھیل ہے۔ میں فرید کی بیوی' دوست اور غمگسار بن کر محبت کی گھنی چھاؤں میں زندگی گزار دینا چاہتی تھی۔ میری زندگی میں بہار کا یہ پہلا جھونکا آیا تھا اور میں یہ سمجھتی تھی کہ مجھے اپنی منزل مل گئی ہے۔ ایک رات جب میں نے اپنا شک دور کرنے کی غرض سے فرید کو اپنی کسوٹی پر پرکھا تو مجھ پر یہ گھناؤنا انکشاف ہوا کہ فرید نے محض مجھ سے اس لئے شادی کی ہے کہ وہ مجھے بلیک میلنگ کا مواد تبسم کے ہاں سے حاصل کرنے کے لئے استعمال کرے' جب مطلوبہ چیزیں مل جائیں تو وہ مجھے طلاق دے دے گا۔ اس انکشاف نے میرے دل پر گہرے زخم لگا دیئے۔ وہ مجھے کسی لمحے بھی طلاق دے سکتا ہے۔ میں اپنے نصیب پر طلاق کا داغ لگانا نہیں چاہتی۔ میرا دل ٹوٹ گیا ہے۔ میں ابھی اور اسی وقت یہ شہر چھوڑ دینا چاہتی ہوں۔ آپ مجھے کسی ٹرین میں سوار کرا دیں۔ میں نے اسے اس منحوس گاڑی میں سوار کروا دیا۔"

میں فخرو بھائی کی جذباتی تقریر سن کر اکتا گیا تھا۔ میں نے بیزاری سے پوچھا۔ "کیا اس حادثے میں کنول مرگئی ہے؟"

"فرید!" فخرو بھائی کو غصہ آگیا۔ "خدا نہ کرے' لیکن اس کی زندگی کے امکانات بھی نہیں ہیں۔"

"وہ کیسے؟" میں نے پوچھا۔

"میں نے اسے زنانہ ڈبے میں سوار کرایا تھا۔" ان کی آواز بھاری ہو رہی تھی۔ "اخبار میں لکھا ہے کہ زنانہ ڈبے کا کوئی مسافر نہیں بچا ہے۔"

"آپ کیا چاہتے ہیں؟"

"کیا چاہتا ہوں؟" فخرو بھائی نے آنکھیں پھاڑ کے مجھے دیکھا۔ "تم میرے ساتھ جائے حادثہ تک چلو۔ ہم دونوں اس کی لاش تلاش کر کے اس کی تدفین کریں گے۔"

"میں آپ کے ساتھ نہیں جا سکوں گا۔" میں نے اپنی جیب سے پانچ سو روپے نکال کر ان کی جانب بڑھائے۔ "آپ خود ہی جا کر اس کی تدفین کر آئیں۔"

فخرو بھائی پر جیسے حیرتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ وہ غصے سے کانپتے ہوئے کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے میرے ہاتھ میں دبے ہوئے نوٹوں کو ایسی نظروں سے دیکھا جیسے میں نے کیڑے مکوڑوں کو پکڑ رکھا ہے۔ "تم اس قدر پتھر دل اور بے رحم انسان ہو۔" نفرت اور غصے سے ان کی زبان لڑکھڑانے لگی۔ "کیا کنول تمہاری بیوی نہیں ہے؟ کیا تمہیں اس سے محبت نہیں تھی؟"

"نہیں!" میں نے سرد لہجے میں جواب دیا۔

"کنول نے مجھے تمہارے بارے میں بتایا تو یقین نہیں آیا کہ تم اس قدر گھٹیا انسان ہو!" فخرو بھائی کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ "تم نے محبت اور شادی کو ایک کھیل سمجھ کر کھیلا ہے۔ تم مہ جبیں کے لئے اور اپنی غرض میں اندھے ہو رہے ہو! لیکن میں تمہیں یہ بتائے دیتا ہوں کہ اب تم کبھی مہ جبیں سے شادی نہیں کر سکو گے۔ تمہارا خواب ادھورا رہ جائے گا۔"

"فخرو بھائی!" میں نے نرم پڑ کر کہا۔ "آپ میرے دوست ہیں۔ ایسی دل آزاری کی باتیں تو نہ کریں۔ مہ جبیں میرا خواب ہے' میری زندگی ہے۔"

"میں آج سے تمہارا دوست نہیں دشمن ہوں۔" فخرو بھائی نے حقارت سے منہ پھیر کر کہا۔ "تمہاری اور میری دوستی ختم! اب مہ جبیں کو بھی بھول جاؤ۔"

"وہ کس لئے؟"

"اس لئے کہ میں مہ جبیں کے باپ اور مہ جبیں سے تمہارا سارا کچا چٹھا بیان کر دوں گا۔"

"آپ انہیں کیا بتائیں گے؟"

فخرو بھائی جو بہت سرعت سے باہر کے دروازے کی جانب لپکتے ہوئے یوں جا رہے تھے جیسے انہیں میری شکل تک دیکھنا گوارا نہیں ہے۔ وہ میری بات سن کر ٹھٹک کر رک گئے۔ انہوں نے میری طرف پلٹ کر دیکھا تو مجھے ان کی قہر آلود نظروں سے خوف سا آ گیا۔ وہ چند ثانیوں تک تذبذب کے عالم میں کھڑے رہے۔ جیسے اپنے دل کی بات زبان پر لانے کا انہیں حوصلہ نہ ہو۔ وہ میرے لبوں پر ایک غیر اختیاری مسکراہٹ دیکھ کر برہمی سے بولے۔ "تم نے مجھے مجبور کر دیا ہے کہ ایک لڑکی کی زندگی بچانے کے لئے اس لڑکی کے باپ کو تبسم کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دوں۔ تمہارے بارے میں تبسم سے زیادہ کون جانتا ہے!" یہ کہہ کر فخرو بھائی کسی سنسناتے ہوئے تیر کی طرح کمرے سے باہر نکل گئے۔ جاتے جاتے وہ میرے سینے میں کئی ہزار نوکیلے خنجر کا پھل اپنی پوری قوت سے اتار گئے تھے۔

مجھ پر سکتہ سا چھا گیا اور میں اپنی جگہ پتھر کے مجسمے کی طرح منجمد ہو کر رہ گیا۔ میرے دماغ کے ہر گوشے میں خوفناک دھماکے ہو رہے تھے' کان سائیں سائیں کئے جا رہے تھے۔ میرے وجود میں گرم گرم سیسہ پگھلتا جا رہا تھا۔ لمحوں میں ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ میں کسی جہنم کی آگ میں تپ رہا ہوں۔ کمرے میں ہر طرف چھایا ہوا ہولناک سناٹا میری حالت پر نوحہ کناں تھا۔ مجھے اپنا روپ ایک شیطان کا لگ رہا تھا۔ میرے اندر کوئی چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔ تم انسان نہیں' شیطان ہو' بدکار ہو' ذلیل ہو!

میں نے بڑی جدوجہد کے بعد اپنے آپ کو سنبھالا تو حلق میں کانٹے چبھتے ہوئے لگ رہے تھے۔ میں نے فریج سے بوتل نکال کر منہ سے لگا لی تو ٹھنڈا پانی کھولتا محسوس ہونے لگا۔ روح میں اترتے ہوئے ماتمی سناٹے کو میں مٹا نہیں سکتا تھا۔ میرے سینے میں یکایک درد کی ایک لہر اٹھی تو میں اپنا سینہ دبائے لڑکھڑاتا ہوا صوفے پر گر پڑا۔ میرے ہاتھ سے پانی کی بوتل چھوٹ کر فرش پر گر پڑی۔ پھر مجھے جیسے اپنا ہوش نہیں رہا۔ میں کتنی ہی

دیر تک بے سدھ پڑا رہا۔

جب میری حالت کسی قدر نارمل ہوئی تو میں اٹھ بیٹھا' لیکن میرے ذہن پر مسلسل ہتھوڑے برس رہے تھے۔ کنول مر گئی ہے۔ کنول مر گئی تو کیا ہوا؟ کنول کو ایک دن مرنا تھا۔ وہ کل نہیں مری آج مر گئی' اس سے کیا فرق پڑتا ہے! میں نے اپنے دل کے تمام گوشوں میں جھانک کر دیکھا۔ اس کی ناوقت موت سے نہ تو مجھے گہرا صدمہ پہنچا تھا اور نہ کوئی خوشی ہوئی تھی۔ فخرو بھائی سے جو برسوں کی دوستی کا رشتہ آج کسی کچے دھاگے کی طرح ٹوٹ گیا تھا۔ اس کا بھی اتنا غم نہین ہوا' لیکن یہ احساس جان لیوا تھا کہ فخرو بھائی جذباتی ہو کر مہ جبین کے باپ کو تبسم کے پاس لے جائیں گے۔ تبسم تو پہلے ہی مجھ پر جھپٹنے کے لئے تیار بیٹھی تھی۔ وہ میرے خلاف نہ صرف خوب زہر اگلے گی بلکہ میرے سیاہ اعمال کی نمائش بھی کر دے گی۔ اپنی شادی کی تصویریں بھی دکھا دے گی۔ میں پھر کسی قیمت پر مہ جبین کو حاصل نہیں کر سکوں گا۔ میں اتنی بڑی دنیا میں ذلیل و خوار ہو کر تن تنہا رہ جاؤں گا۔

میں نے سوچا کہ فخرو بھائی کنول کی تدفین کے لئے جا رہے ہیں۔ ان کی واپسی میں دو تین دن لگ جائیں گے۔ وہ واپسی میں شاید میرے خلاف کوئی انتہائی قدم اٹھائیں گے۔ میں ان کی واپسی سے پہلے کیوں نہ تبسم کو قتل کر دوں۔ میں کسی ایسی تدبیر سے اس ڈائن کو قتل کر سکتا ہوں کہ کسی کو مجھ پر شک نہ ہو۔ آخر اسے کس طرح قتل کیا جا سکتا ہے؟ میں سوچنے لگا۔ اسے قتل کرنا آسان نہیں تو مشکل بھی نہیں تھا۔ حوصلے اور منصوبے کی ضرورت تھی۔ میں آئے دن اخبارات میں قتل کی ایسی خبریں پڑھتا رہتا تھا۔ جن کے قتل کا سراغ کبھی نہیں ملا تھا۔ صرف اس لئے کہ ان قاتلوں نے بڑی مہارت سے منصوبے بنائے تھے۔ خاصی دیر بعد میرے ذہن میں ایک تدبیر آئی۔ میں نے سپر ہائی وے پر باڑا بازار پہنچ کر علاقہ غیر کے ایک شخص کو تلاش کیا۔ وہ تلاش بسیار کے بعد میرے ہاتھ لگا۔ میں نے پانچ سو روپے کے عوض ایک جیبی سائز کا پستول اور چھ گولیاں خریدیں۔ سائلنسر کے لئے الگ سے قیمت ادا کرنی پڑی۔ تبسم کے لئے دو گولیاں کافی تھیں لیکن میں اس کے جسم میں چھ کی چھ گولیاں اتارنا چاہتا تھا تاکہ اس کے جسم میں زندگی کی ہلکی سی رمق بھی باقی نہ رہے اور وہ تڑپ تڑپ کر مر جائے۔

مجھے رات کا انتظار کرنا پڑا جو میرے لئے بڑا ہی کرب ناک تھا۔ رات آٹھ بجے میں ایک ایسی جگہ پر کھڑا ہو گیا جہاں سے تبسم کی عمارت پر میں آسانی سے نظر رکھ سکتا تھا۔ اس عمارت کے اندر اور باہر جانے والوں کی حرکات و سکنات پر میری نظریں جمی ہوئی تھیں۔ جلد ہی اس عمارت پر سناٹا چھا گیا۔ چوکیدار بھی کہیں چلا گیا۔ یک لخت مجھے خیال کہ ٹی وی پر ایک انتہائی مقبول ڈرامہ سیریز چل رہی ہے۔ سبھی اس ڈرامے کو دیکھنے کے شوق میں اپنے گھروں میں مقید ہو گئے ہیں۔ چوکیدار کو بھی ڈرامے کا شوق شاید وہاں سے کھینچ کر لے گیا تھا ورنہ وہ اپنی ڈیوٹی چھوڑ کر اس جگہ سے نہ جاتا۔

چوکیدار کی موجودگی سے میرے منصوبے پر کوئی اثر نہیں پڑتا تھا۔ ایک طرح سے میرے حق میں اچھا ہی تھا کہ میں اس کی یا کسی اور کی نظروں میں نہ آؤں۔ میں اس وقت تذبذب اور مخمصے کے عالم میں پھنسا ہوا تھا۔ تبسم اپنے فلیٹ میں موجود تھی۔ میں اس کے فلیٹ پر دستک دے کر کوئی سنگین خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ اگر وہ تنہا ہوتی تو کوئی ڈر اور خوف نہیں تھا۔ مجھے اس کے ساتھیوں سے شدید خطرہ لاحق تھا جو ہر وقت اس کے ساتھ سائے کی طرح لگے رہتے تھے۔ وہ میری ایسی خاطر تواضع کرتے کہ میں تا زندگی یہ خاطر نہیں بھول سکتا تھا۔ میرے لئے یہ معلوم کرنا بھی دشوار اور ناممکن تھا کہ وہ اپنے فلیٹ میں تنہا ہے یا نہیں۔ میں اس کی غیر موجودگی میں اس کے فلیٹ میں داخل ہو کر کسی ایسی جگہ چھپ کر کڑی نظر رکھ سکوں اور موقع پا کر اسے قتل کر دوں۔ فلیٹ میں اس کی موجودگی کا ثبوت یہ تھا کہ اس کی کار' عمارت کے احاطے میں کھڑی ہوئی تھی' اور اس کے فلیٹ کے ایک کمرے میں روشنی ہو رہی تھی۔

میں تبسم کے فلیٹ پر نظریں مرکوز کئے کھڑا تھا کہ میں نے اپنی پشت پر کسی کی چاپ محسوس کی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ تبسم کے چاروں بدمعاش میری طرف بڑھتے ہوئے مجھے اپنے نرغے میں لے رہے تھے۔ میں نے ہتھیار ڈالنے میں اپنی عافیت سمجھی۔ جس وقت میں ان کے ہمراہ تبسم کے فلیٹ پر پہنچا' چاروں بدمعاش مل کر مجھ پر پل پڑے۔ میری ایسی شان دار خاطر تواضع اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ میرا جرم بھی نہیں بتایا گیا اور پھر مجھے ادھ موا کر کے چھوڑ دیا گیا۔ میں دو ایک مرتبہ بے ہوش بھی ہو گیا تھا۔ ہوش میں آتا تو زخموں سے اٹھتی ہوئی درد کی ٹیسیں مجھے تڑپا دیتیں۔ شاید میری توبہ بھی قبول ہو گئی ہو۔

تبسم کو نہ جانے مجھ پر کیوں ترس آگیا تھا۔ اس نے میرے بازو میں ایک انجکشن لگا دیا۔ پھر میں جلد ہی اپنے زخموں اور درد سے بے نیاز ہو کر نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

جس وقت میری آنکھ کھلی' میں پلنگ پر پڑا ہوا تھا۔ میرے زخموں میں ہلکا ہلکا درد اب بھی باقی تھا۔ لیکن میرے سوجے ہوئے جبڑے اور زخمی ہونٹوں میں درد کچھ زیادہ محسوس ہو رہا تھا۔ کچھ دیر اور کمرے کے باہر چاپ سنائی دی۔ میں نے اپنی آنکھیں موند لیں اور کسی خیال کے تحت کھول دیں۔ دہلیز پر لہراتا ہوا پردہ سرکا۔ تبسم شب خوابی کے لباس میں داخل ہوئی۔ کمرے میں پھیلے ہوئے اندھیرے کے باعث میں اس کا چہرہ دیکھ اور پڑھ نہیں سکتا تھا۔ وہ کھڑکیوں سے پردے ہٹانے کے لئے بڑھ رہی تھی۔ تبسم نے کھڑکیوں کے پاس پہنچ کر پردے اس قدر ہٹائے کہ اس میں ایک بڑی سی دراڑ بن گئی۔ سورج کی تیز چمکیلی دھوپ کمرے میں پھیل گئی۔ صبح ہو گئی تھی لیکن میری زندگی میں اندھیرا تھا۔

تبسم کھڑکی سے ہٹ کر میرے پاس آئی تو ہم دونوں کی نگاہیں چار ہوئیں۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ بے حد پریشان ہے۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں کے سرخ ڈورے بتا رہے تھے کہ وہ رات کو ایک پل کے لئے بھی نہیں سو سکی ہے۔ اس کے چہرے پر دہشت کی زردی پھیلی ہوئی تھی۔ وہ میرے پلنگ پر میرے پاس بیٹھ گئی۔ اس نے نفرت بھری آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ میں نے پوچھا۔ "کیا تم مجھے میرا قصور بتا سکتی ہو؟ آخر مجھے کس لئے اس بے رحمی سے مارا پیٹا گیا ہے؟"

"تم خوش نصیب ہو فرید!" تبسم نے نخوت سے کہا۔ "میں تو یہ چاہ رہی تھی کہ تمہیں قتل کر کے کہیں پھینک دیا جائے' پھر مجھے خیال آیا کہ تم تنہا قصور وار نہیں ہو۔"

"آخر تم مجھ سے کیا چاہتی ہو؟"

"کنول کہاں ہے؟"

"کنول؟" میرے لبوں پر ایک زہر خند مسکراہٹ ابھری۔ "وہ تمہاری دسترس سے اتنی دور چلی گئی ہے کہ اب کبھی تمہارا منحوس سایہ اس پر نہیں پڑ سکتا۔ وہ پرسوں ریل گاڑی کے ایک حادثے میں مر گئی۔ خس کم جہاں پاک!"

تبسم کا ہاتھ فضا میں لہرایا اور میرے سوجے ہوئے جبڑے پر پڑا تو میں درد سے چیخ اٹھا' تڑپنے لگا۔

بھرے ہوئے تھے۔ کیا سمجھے! وہ مجھے زندگی بھر کے لئے اپاہج کر گئی۔"

"ردی کاغذ کے ٹکڑے؟" میری سمجھ میں کنول کا سارا کھیل آ گیا تھا۔ دور جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے اسے اپنے دام میں لانے کے لئے جو جال بچھایا تھا' میں خود اس جال میں پھنس گیا تھا۔

تبسم اور اس کے ساتھیوں نے اسی وقت مل کر ایک پروگرام بنایا کہ جائے حادثہ پر پہنچ کر اس بریف کیس کو حاصل کیا جائے۔ وہ مجھے زخمی حالت میں چھوڑ کر اسی وقت نکل کھڑے ہوئے۔ ان لوگوں کے جانے کے بعد میں بہ وقت تمام اس کے فلیٹ سے نکل کر اس جگہ پر آیا۔ جہاں میں نے اپنا سکوٹر پارک کیا تھا۔ میں اپنا زخمی چہرہ لے کر اپنے محلے جانا نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے فلیٹ پر آ گیا۔ چوکیدار اور اس کے بیوی نے مل کر میری مرہم پٹی کی۔

کوئی ایک ہفتے بعد فخرو بھائی میرے آفس میں آئے۔ میں ان دنوں تبسم اور فخرو بھائی سے بے خبر سا رہا تھا۔ نہ میں نے اور نہ ہی تبسم نے میرے بارے میں کوئی خبر لی اور نہ میں تبسم کے چکر میں پڑنا چاہتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اس بریف کیس کا ملنا ناممکن ہے' لیکن پھر بھی میرے دل کو ایک دھڑکا سا لگا ہوا تھا۔ میرے اعصاب پر خوف مسلط ہو کر رہ گیا تھا کہ تبسم کسی بھی روز مجھے اپنے ہاں طلب کر سکتی ہے۔ پھر ایک مرتبہ وہ مجھ سے شادی کر کے مجھے اپنا زر خرید غلام بنا لے گی۔ فخرو بھائی کو دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا۔ کیا کنول زندہ ہے؟ میں نے دہشت زدہ ہو کر سوچا۔

فخرو بھائی کا افسردہ چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ کوئی بھی اچھی خبر نہیں لائے ہیں۔ ہم دونوں ہوٹل کے ایک گوشے میں آ بیٹھے تو فخرو بھائی نے گہرا سانس لے کر کہا۔ "کنول مر گئی فرید! میں اس کی لاش وہیں دفن کر آیا اس لئے کہ اس کی لاش اس قدر مسخ ہو چکی تھی کہ وہ پہچانی نہیں جاتی تھی۔ میں نے اسے اس کے کپڑوں سے پہچانا تھا۔"

میں نے ان کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔ "کیا آپ کو وہاں بریف کیس ملا تھا؟"

فخرو بھائی نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے میں پاگل ہو گیا ہوں۔ "تم سٹھیا تو نہیں گئے! بریف کیس تو کیا' وہاں جوتے چپل تک نہیں ملے' درندے اور وحشی نما انسان وہ

سب چرا کر لے گئے۔"

میرے دل میں طمانیت کی ایک لہر اٹھی، لیکن ایک انجانا خوف بھی سینے میں بھر گیا۔ شاید کوئی چور اور بدمعاش میری تلاش کر کے مجھے بلیک میل کرنے کی کوشش کرے، لیکن اس سے مجھے اتنا ڈر نہیں تھا، جتنا تبسم سے تھا۔

"تمہارے لئے میں ایک منحوس خبر لایا ہوں۔"

"کیسی خبر؟" میں چونک گیا۔

"کل مہ جبیں کی شادی ہو گئی ہے۔"

"مہ جبیں کی شادی ہو گئی ہے!" مجھے لگا کہ فخرو بھائی نے میرے سینے میں زہر آلود چھرا گھونپ دیا ہے۔ میرا سر چکرا گیا، دماغ میں آندھیاں چلنے لگیں۔ کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔ میں نے بڑی جدوجہد کر کے خود پر قابو پا لیا۔ میں نے ہذیانی انداز میں فخرو بھائی کا گریبان پکڑ لیا۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"کیوں نہیں ہو سکتا!" فخرو بھائی نے بڑی آہستگی سے میرے ہاتھ سے اپنا گریبان چھڑا لیا۔ "تبسم نے مہ جبیں اور اس کے باپ کو تمہارے کرتوتوں سے آگاہ کر دیا تھا۔"

میں جیسے آسمان کی بلندیوں سے نیچے کی طرف تیزی سے گرتا چلا جا رہا تھا۔ آج مجھے اپنی خود غرضی اور ذلالت کی پوری پوری سزا مل گئی تھی۔ مجھ پر غم و صدمے کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا۔ میں کتنی ہی دیر تک سکتے کے عالم میں ڈوبا رہا۔ میرے ذہن میں کنول اور مہ جبیں کے سراپے ابھرتے رہے۔ میں اتنی بڑی دنیا میں تن تنہا رہ گیا تھا۔ یکایک میرے دل کے گوشوں میں کنول کی محبت جاگنے لگی۔ پچھتاوے کی آگ میرے وجود کو بھسم کئے دے رہی تھی۔ میں ہوٹل میں لوگوں کی موجودگی کی پروا کئے بغیر سسک پڑا۔ "فخرو بھائی! میں واقعی بڑا ذلیل آدمی ہوں۔ مجھے جتنی بھی اذیت اور بڑی سے بڑی سزا ملے کم ہے۔ میں نے اس معصوم کنول کا دل توڑا ہے، اس کی زندگی تباہ کر دی۔ کاش میری آنکھوں پر پردہ نہ پڑا ہوتا! کاش میں کنول سے اپنے گناہوں کی معافی مانگ سکتا۔ آپ مجھے کل اس کی قبر پر لے چلیں۔" میں بے ربط جملے کہتا چلا گیا۔

"تم اپنے کئے پر نادم ہو؟" فخرو بھائی نے پوچھا۔

"ہاں!" میں نے اعتراف کیا۔ "آج مجھے احساس ہو رہا ہے کہ میں نے کنول کی

محبت کی قدر نہیں کی' اسے بڑی اذیت دی' ستایا اور رلایا۔ وہ واقعی مجھ سے سچی محبت کرتی تھی۔"

"تم نے تبسم کے بارے میں کوئی خبر سنی؟"

"آپ اس چڑیل کا نام بھی نہ لیں۔" میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔

"اس کی کار کو حادثہ پیش آگیا۔" فخرو بھائی کہنے لگا۔

"ایک ہفتہ پہلے سپر ہائی وے پر ایک ٹرک سے حادثہ ہونے کے نتیجے میں وہ اپنے ساتھیوں سمیت مرگئی۔"

"سچ!" میں اچھل پڑا۔ "کیا وہ ڈائن واقعی مرگئی؟"

"کیا اخبار نہیں پڑھتے ہو؟"

"نہیں۔"

"ہم آج رات کی ٹرین سے چلتے ہیں۔" فخرو بھائی نے کہا۔ "میں ابھی اور اسی وقت جاکر ٹکٹ بک کرالیتا ہوں۔ تم تیار رہنا۔ تم مجھے کہاں ملو گے؟"

"فلیٹ پر!"

میں شام سے اپنے فلیٹ میں فخرو بھائی کا انتظار کر رہا تھا۔ میری سوچوں میں صرف کنول بسی ہوئی تھی۔ میں نے مہ جبیں کا خیال ذہن سے جھٹک دیا تھا۔ اس نے مجھ سے بے وفائی کی تھی لیکن اس میں مہ جبیں کا نہیں تبسم کا دوش تھا۔ میں کنول کو یاد کر کے رو رہا تھا۔ اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے اپنے آنسو پونچھے اور دوسرے کمرے میں جاکر دروازہ کھول دیا۔

مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ میں خواب کی سی حالت میں کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ کنول میری نظروں کے سامنے کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں وہی بریف کیس تھا جس نے بہت گل کھلائے تھے۔ اس کے پیچھے فخرو بھائی کھڑے مسکرا رہے تھے۔ میں اب ڈرامے کی تہہ تک پہنچ چکا تھا۔ اس نے فخرو بھائی کی موجودگی کی پرواہ نہیں کی اور مجھ سے آکر لپٹ گئی۔ اس نے کچھ دیر بعد بریف کیس میرے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ "اسے ابھی اور اسی وقت کھول کر دیکھ لو۔ کہیں اس میں ردی کاغذ کے ٹکڑے تو نہیں ہیں۔"

(ختم شد)

اے حمید کی ایڈونچر سیریز

عاطون

قوموں کے عروج و زوال اور انسانی تہذیب کے ہر عہد کی سچی تصویر
تاریخ کے گمشدہ ایوانوں میں گردش کرتا ہوا انسانی تاریخ کا ایک انوکھا سفرنامہ۔

چار جلدوں میں

۱۔ اہرام مصر سے فرار ۱۵۰/-
۲۔ ہڑپہ کی ناگن ۱۲۵/-
۳۔ اندلس کی آخری شمع ۱۲۵/-
۴۔ عاطون موت کے دروازے پر ۲۰۰/-

شیوسینا کے دہشت گرد

ایک محبِ وطن مجاہد کی سنسنی خیز اور ایمان افروز سچی داستان

چار جلدوں میں

۱۔ ٹاپ سیکرٹ مشن ۱۵۰/-
۲۔ کشمیر کے غازی ۱۵۰/-
۳۔ کمانڈو ایکشن ۲۰۰/-
۴۔ گولکنڈہ کے مجاھد ۲۰۰/-

گنگا کے پجاری ناگ

بھارت میں کیلاش پربت کے مندروں، جنوبی ہند میں ترچناپلی کے پجاریوں کی خفیہ عشرت گاہوں، اور کوہ بندھیاچل کے خطرناک جنگلوں میں، ایک پاکستانی نوجوان کی سنسنی خیز ایڈونچر سفر کی سچی داستان۔

جلد اول ۱۵۰/- جلد دوئم ۲۰۰/-

مکتبہ القریش، اُردو بازار، لاھور ۲